ستمبر 2014

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ

کراچی

ایم اے راحت کی تحریر کردہ نئی سلسلے وار کہانی
اکتوبر 2014ء سالگرہ نمبر میں شائع کی جارہی ہے
زندہ صدیاں
جنم کنڈلی خزانے میں نہایت محفوظ جگہ رکھی ہوئی تھی۔ پنڈا نے اسے منگوایا اور طویل عرصے کے بعد اس نے اپنی قسمت کے لکھے کو کھولا اور پڑھنا شروع کردیا۔ وہ اسے زور زور سے پڑھ رہا تھا۔ اس کے بارے میں بہت سی دعائیں اور اشلوکوں کے بعد لکھا تھا۔
پنڈا کی عمر کا ایک مخصوص حصہ۔ اس سے جب اس کی حکومت کے گیارہ سال بیت جائیں گے اس کے لیے خراب ہوگا۔ اس کی موت سانپ کے کاٹے سے ہوگی اور یہ انمٹ ہے۔"

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 15 شمارہ نمبر 12 ستمبر 2014ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

قیمت 60/- روپے
سالانہ قیمت 1000/- روپے

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو ... کراچی: 32744391

☆ مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام یہ کرتے ہیں اللہ ان سے خبردار ہے اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی آرائش (یعنی زیور کے مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہو۔ اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں اور اپنے خاوند اور باپ اور خسر اور بیٹوں اور خاوند کے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں اور بھانجوں اور اپنی ہی قسم کی عورتوں اور کنیز، ملازموں کے سوا، نیز ان خدام کے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں، غرض ان لوگوں کے سوا کسی پر اپنی زینت اور سنگار کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں۔ اور اپنے پاؤں ایسے طور سے زمین پر نہ ماریں کہ جھنکار کانوں میں پہنچے اور ان کا پوشیدہ زیور معلوم ہو جائے اور مومنو سب اللہ کے آگے توبہ کرو تا کہ فلاح پاؤ۔ (سورۃ نور 24 آیت 30 سے 31)

☆ اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے تمہارے کھانے کے لئے پیدا کئے۔ اور کشتیوں اور جہازوں کو تمہارے زیر فرمان کیا تا کہ دریا اور سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔ (سورۃ ابراہیم 14 آیت 33)

☆ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جسے تم پیتے ہو اور اس سے درخت بھی شاداب ہوتے ہیں جن میں تم اپنے مویشیوں کو چراتے ہو اسی پانی سے وہ تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور بے شمار درخت اگاتا ہے اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے۔ غور کرنے والوں کے لئے اس میں قدرت اللہ کی بڑی نشانی ہے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 10 سے 11)

☆ مومنو کسی بات کے جواب میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے پہلے نہ بول اٹھا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سنتا جانتا ہے۔ اے اہل ایمان اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو اس طرح ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو جو لوگ پیغمبر اللہ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں اللہ نے ان کے دل تقویٰ کے لئے آزما لئے ہیں۔ ان کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔ جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں۔ (سورۃ حجرات 49 آیت 1 سے 4)

☆ مومنو جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے

ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لئے بہت اچھا ہوتا۔ ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں لیکن تھوڑے اور اکثر نافرمان ہیں۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 110)

☆ ان اہل کتاب میں کچھ لوگ حکم اللہ پر قائم بھی ہیں جو رات کے وقت اللہ کی آیتیں پڑھتے اور اس کے آگے سجدے کرتے ہیں اور اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے اور اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے اور نیکیوں پر لپکتے ہیں اور یہی لوگ نیکوکار ہیں۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 113 سے 114)

☆ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے، بڑی برکت والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ زبردست اور بخشنے والا ہے۔ اس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے اسے دیکھنے والے کیا تو اللہ رحمٰن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو آسمان میں کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ، سہ بارہ نظر کر تو نظر ہر بار تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔ (سورۃ ملک 67 آیت 1 سے 4)

☆ نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق و مغرب کو قبلہ سمجھ کر ان کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں۔ اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کر لیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور معرکہ کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 177)

☆ اللہ کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں یعنی اس روز سے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ کتاب اللہ میں برس کے بارہ مہینے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چار مہینے ادب کے ہیں یہی دین کا سیدھا رستہ ہے تو ان مہینوں میں قتال ناحق سے اپنے آپ پر ظلم نہ کرنا۔ اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں۔ اور جان رکھو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے امن کے کسی مہینے کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے اس سے کافر گمراہی میں پڑے رہتے ہیں۔ ایک سال تو اس کو حلال سمجھ لیتے ہیں اور دوسرے سال حرام تا کہ ادب کے مہینوں کی جو اللہ نے مقرر کئے ہیں گنتی پوری کر لیں۔ اور جو اللہ نے منع کیا ہے اس کو جائز کر لیں۔ ان کے برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں اور اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 36 سے 37)

☆ وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تا کہ تم برسوں کا شمار اور کاموں کا حساب معلوم کرو یہ سب کچھ اللہ نے تدبیر سے پیدا کیا سمجھنے والوں کے لئے وہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے۔ (سورۃ یونس 10 آیت 5)

☆ اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔ (سورۃ طلاق 65 آیت 3)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

اقرا بخاری شہر سلطان سے۔ محترم ایڈیٹر صاحب آداب! آغاز ہے رب کریم کے بابرکت نام سے جو بڑا مہربان اور رحیم ہے اور دعا ہے اس بابرکت ذات سے کہ وہ ہمارے ملک اور اس میں رہنے والوں کو خوب ترقی و کامیابی و کامرانی عطا کرے۔ (آمین) اگست کا تازہ شمارہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ سرورق اچھا لگا..... قرآن کی باتیں پڑھ کر روحانی سکون ملا۔ خطوط قارئین کے لئے تعریف و تنقید کی خوب صورت راہ ہیں۔ کہانیوں میں عطیہ زاہرہ صاحبہ ٹاپ پر رہیں۔ محترمہ جس طرح اپنی ہر شاہکار کہانی کا آغاز خوب صورت کرتی ہیں اپنی پوری کہانی پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے اختتام بھی بخوبی انجام کو پہنچاتی ہیں۔ شیطانی گرفت بہت پسند آئی V.Nice. دوسرے نمبر پر ڈی بہت اچھی لگی۔ عمران قریشی صاحب Weldone خوب صورت تحریر رہی..... تیسرے نمبر پر محبت جیسے پاکیزہ جذبات پر سادہ مگر پراثر الفاظ میں لکھی گئی تحریر رقابت اچھی لگی..... باقی تمام کہانیاں بھی اپنی جگہ فٹ تھیں۔ بھائی مدثر بخاری کی تحریر "نفرت عشق" کو ڈر میں جگہ دینے کے لئے شکریہ...... ان شاء اللہ بہت جلد ہم بھی ڈر کے لئے اپنی کچھ تحاریر کے ساتھ حاضر خدمت ہوں گی۔ ڈر کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ اقرا صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم۔ خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ چلئے حوصلہ افزائی ہو گئی اور اب حسب وعدہ آئندہ بھی خط اور کہانیوں کا انتظار رہے گا۔ Thanks.

ببا سحر دینہ سیداں گجرات سے۔ السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب اور تمام اسٹاف اور قارئین کو دل کی گہرائی سے نیک تمنائیں۔ میں ڈر کو تین سال سے پڑھ رہی ہوں، جب سے ڈر کا پہلا رسالہ پڑھا ہے فین ہو گئی ہوں، خط کسی بھی رسالے میں پہلی دفعہ لکھ رہی ہوں۔ شمارے میں اپنی غزل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔ امید کرتی ہوں کہ اس بار میرے خط کو ضرور شائع کریں گے ایک اور تحریر بھیج رہی ہوں، قوس قزح میں جگہ مل جائے تو عنایت ہوگی۔ جس چیز نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے کہانیوں میں رومانس کا عنصر۔ چندراوتی، بلیک ناگ، ناگن کا عشق یہ کہانیاں اپنے معیار کے اعتبار سے تو بہترین ہیں۔ لیکن رائٹر حضرات سے ایک گزارش ہے کہ پلیز کہانیوں میں رومانس کو تھوڑا کنٹرول میں رکھیں کیونکہ ڈر ڈائجسٹ بچے بھی پڑھتے ہیں پھر وہ سوالات کرتے ہیں اور ایسے سوالوں کا جواب سوائے خاموشی کے کچھ نہیں۔ کہانیاں اخلاقی طور پر تو اصلاحی ہوتی ہیں بس یہ ایک چیز ہے جس پر اگر رائٹر تھوڑا کنٹرول کر سکیں۔ پاگل خانہ جیسی بہترین تحریر دوبارہ پڑھنے کو نہیں ملی؟ سنہری تابوت کا اینڈ اچھا تھا۔ خونی کاوش، وچ ڈاکٹر بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ پروفیسر واجد نگینوی ہمیشہ کی طرح اچھی شاعری کے ساتھ آئے۔ ان کے اشعار زبردست تھے۔ فلک فیضان، احسان سحر، شرف الدین، شگفتہ ارم درانی، عمران قریشی، آسیہ بنت نیازی تمام کی تمام شاعری بہت اچھی تھی۔ ایڈیٹر صاحب ڈر کے لئے کہانی لکھ رہی ہوں، پلیز ارسال کرنے کا طریقہ بتا دیں۔

☆☆ ببا صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کا خط بھی شائع ہو گیا اور آئندہ بھی تمام تحریریں شامل اشاعت ہوا کریں گی۔ کہانی ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور بذریعہ ڈاک رجسٹری ارسال کر دیں، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ارسال کرنے کے لئے بہت بہت شکریہ۔

بلقیس خان پشاور سے۔ السلام علیکم! جناب سب سے پہلے تو گزری ہوئی عید کی خوشیاں میری طرف سے آپ سب کو مبارک ہوں اور اب اگست میں جشن آزادی بھی آ گئی ہے۔ دوسری عید جیسے مل رہی ہے تو میری طرف سے پورے پاکستانیوں کو دل کی گہرائیوں سے ہیپی انڈیپنڈنس ڈے۔ اگست کا شمارہ جلدی ملا، ٹائٹل شاندار جاندار تھا، اشعار، غزلیں و نظمیں ٹھیک ٹھاک رہیں، اور کہانیاں زبردست تھیں، جن جن لوگوں نے ہمیں یاد کیا، یاد رکھا ان کا تہہ دل سے شکریہ جی۔ اسپیشل اسٹوری رمضان اور عید پر میں بھی محنت کر کے لکھ ڈالی۔ بڑی محنت اور توجہ سے لکھی ہے۔ سالگرہ نمبر میں اسے ضرور شائع کیجئے گا۔ ورنہ میں ناراض..... اس ماہ کی کہانیوں میں زبردست اسٹوریز تھیں منظر، رقابت، شیطانی گرفت، ڈی اور بھی کا انتظام رہی اور پلیز یہ خصوصی کہانی سالگرہ نمبر کے لئے ہے اسے سالگرہ نمبر میں لگائیں..... تھینک یو جی۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: خط کے ہمراہ نئی کہانی بھیجنے کے لئے ڈھیروں شکریہ۔ ہماری طرف سے بھی آپ کو اور تمام پاکستانیوں کو تہہ دل سے جشن آزادی مبارک ہو، کہانی ابھی پڑھی نہیں، چلئے آپ کے امتحانات ختم ہو گئے اور اب امید ہے کہ آپ ہر ماہ ریگولر ہو جائیں گی۔ تھینکس۔

عطیہ زاہرہ لاہور سے۔ السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ادارے سے وابستہ تمام لوگ خیریت سے ہوں گے۔ میری طرف سے جشن آزادی مبارک ہو۔ میں نے ابھی ابھی یہ کہانی ختم کی ہے جو میں ارسال کر رہی ہوں۔ رات کا سارا وقت میں نے اس کہانی کو دیا ہے۔ امید کرتی ہوں کہ یہ کہانی قارئین کو بہت پسند آئے گی اور آپ سے جلد جگہ دیں گے۔ اب اجازت دیں۔ اللہ حافظ۔

☆☆ عطیہ صاحبہ: نئی کہانی کے لئے بہت بہت شکریہ۔ محنت میں عظمت ہے اور جو لوگ لگن سے محنت کرتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ نئی کہانی موصول ہوئی اور اب پھر دوسری کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔

ارم طالب بھکر سے۔ السلام علیکم! اگست کا ڈر ڈائجسٹ میرے سامنے ہے۔ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی، میرے شوہر خوفناک کہانیاں پڑھنے کے شوقین ہیں، رائٹر بھی ہیں، ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی رسالے پڑھنے شروع کر دیئے۔ ڈر رسالہ مجھے پسند آیا، میں اگست کے ڈر ڈائجسٹ کے متعلق رائے لے کر حاضر ہوں، رسالے کا ٹائٹل بھیانک اور اچھا تھا۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ خطوط میں عطیہ زاہرہ اور محسن علی طالب کا خط پسند آیا۔ کہانیوں میں "ردولکا" ٹاپ نمبروں پر رہی۔ محسن نے مجھے اس کے متعلق کا آئیڈیا کیا کہ کتنی پرانی کہانی ہے۔ مجھے بھی ردولکا پسند آئی، ساحل دعا بخاری کی "نقاب" نے بھی مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ جمال کے ساتھ بہت برا ہوا۔ عشق آتش، اصول شاہکار، جناتی کہانیاں، نفرت عشق، سچا پیار پسند آئی، قوس قزح اور غزل عثمان، وقاص اور محسن علی طالب کا انتخاب پسند آیا۔ باقی رسالہ بھی اچھا تھا۔ اگر میرا خط شامل ہوا تو Next بار لازمی حاضری ہوں گی۔ میں دل کی گہرائیوں سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆ ارم صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانیوں کی پسندیدگی اور خط ارسال کرنے کے لئے ویری ویری تھینکس، امید ہے آپ آئندہ بھی قلمی لگاؤ سے لکھا ہوا نوازش نامہ ضرور ارسال کریں گی۔

مریم قیصر کھوال چکوال سے۔ السلام علیکم! اگست کا ڈر ڈائجسٹ میرے پاس ہے، اس کی کہانیاں پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ڈر ڈائجسٹ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہمارے ذوق دونوں کی تکمیل کے لئے اپنی مثال آپ رسالہ ہے۔ یہ موضوع کے لحاظ سے قابل تعریف اور منفرد ہے۔ "جہالت کی سزا" کے نام سے ایک تحریر بھیج رہی ہوں امید ہے کہ آپ اپنے رسالے میں اسے جگہ دے کر میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆☆ مریم صاحبہ: کہانی موصول ہوئی اس کے لئے شکریہ ابھی پڑھی نہیں، اگر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی، مشورہ ہے کہ آپ کوئی اور دوسری کہانی بھی لکھ کر ارسال کر دیں، ڈر ڈائجسٹ میں آپ کی شرکت باعث خوشی ہے اور قوی امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اپنا نوازش نامہ ضرور ارسال کرتی رہیں گی۔ تھینکس۔

عمرانہ سرور گوجرانوالہ سے۔ امید کرتی ہوں کہ "ڈر" کا تمام عملہ خیریت سے ہوگا۔ جولائی کا شمارہ میرے سامنے ہے اور یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے بہت بڑا تحفہ دیا ہے یعنی "میرا پسندیدہ ڈر ڈائجسٹ" ڈر آپ نے مجھے ارسال کیا۔ میں ڈر آپ سے شیئر کرنا چاہتی ہوں کہ جب مجھے یہ رسالہ ملا تو ہمارے گھر میں جشن کا سماں تھا اور میں اللہ کے حضور دعا گو ہوں، میں ڈر ڈائجسٹ کا شکر گزار ہوں کہ اپنے تعاون سے مجھے بہتر سے بہتر لکھنے پر مجبور کر دیا اور مجھے ڈر میں اپنی اسٹوری دیکھ کر یقین کرنا پڑا کہ میں بھی اب کچھ اچھا لکھ سکتی ہوں۔ میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اگر مجھے میری غلطیوں سے متعارف نہ کروایا جاتا تو میں کچھ بھی نہ لکھ پاتی، اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔ میری اسٹوری کو رسالے میں جگہ دینے کا بہت شکریہ۔

☆☆ عمرانہ صاحبہ: سمعیہ عباس صاحبہ سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا ہے، (انا للہ وانا الیہ راجعون) ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اور تمام قلبی رشتوں اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا کرے۔

شگفتہ ارم درانی پشاور سے۔ ڈر ڈائجسٹ کی پر رونق محفل میں شگفتہ ارم درانی کا محبت بھرا سلام قبول ہو...... اگست کا تحفہ کا ڈائجسٹ ادارے کی طرف سے عید کی مبارکباد کے ساتھ موصول ہوا تو یقین جانئے دل خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ ڈر ڈائجسٹ کی اسی اپنائیت اور محبت کی وجہ ہے کہ ہمارا قلم ہر بار خود بخود حرکت میں آ جاتا ہے اور محبت اور خلوص کا جواب اسی خلوص اور اپنائیت سے دینے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔ سالگرہ نمبر کے لئے آپ حضرات کی بہترین تجویز سر آنکھوں پر...... تمام دوستوں سے التماس ہے کہ تفصیلی اور بلا امتیاز

آپ کی اور ان سب کی محبت ہے کہ آپ نے فون کر کے میرا حال اور غیر حاضری کی وجہ پوچھی ۔ میں آپ سب کا شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ آپ سب کو عزت دے۔ (آمین) اور تحریریں ارسال کر رہا ہوں، ایک سالنامہ کے لئے ہے دوسری بعد میں دیکھ لیجئے "سانپ زادہ ہے" آپ کے پاس ہوگی، اس کا کیا بنا؟ میری طرف سے آپ اور تمام اسٹاف کو سلام۔

☆☆ عامر صاحب: خوشی کی بات ہے کہ آپ کا مکان مکمل ہوگیا نئے مکان کے لئے مبارکباد وصول کریں۔ کہانیاں مل گئی ہیں۔ ایک شامل اشاعت ہے۔ سانپ زادہ ہے دیکھ کر بتاریں گے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔ تھینکس۔

منشر بخاری شہر سلطان سے محترم ایڈیٹر صاحب آداب عرض۔ دل چاہتا ہے بہت کچھ لکھا جائے شہر کراچی کے مکینوں بھرے ہم وطنوں کی اچھی خبریں جائے اور روشنیوں کے شہر میں فضا بھی ہموار رہے ہو ہر چہرہ اس عید پر خوش و خرم ہو، میرے وطن کے ہر شہری پر سایہ رحمت رہے۔ امید ہے آپ ٹھیک ٹھاک ہوں گے میری طرف سے ڈر محفل کے تمام اسٹاف، قارئین اور معزز رائٹرز کو سلام! جولائی کی گرم فضا میں اگست کا پرچہ ملا سرورق چمکیلے رنگوں کی وجہ سے پسند آیا...... خطوط میں ساحل ابڑو کراچی نظر آ گئیں، اسلم جاوید صاحب اور باقی تمام فرینڈز کا دلی شکریہ جنہوں نے میری تحریر کو پسند کیا، اس بار جو کہانیاں شامل اشاعت رہیں، پہلے نمبر پر شیطانی گرفت، کمال کی گرفت ہے۔ وہ بلڈان۔ نقاب میری نظر میں سیکنڈ رہی اور بری کہ ۔ ذکی میسری پوزیشن پر رہی۔ بس منظر، جناتی کہانیاں اور آخری آدمی بھی لاجواب رہیں۔ شاعری میں راحل بخاری کا انتخاب، حکیم خان حکیم کا کلام پسند آیا، اجیہ طیفہ اسا کا کلام بھی اچھا رہا۔

☆☆ منشر صاحب: دل کی گہرائی سے کہانیاں اشعار اور غزلوں کی تعریف کے لئے بہت شکریہ، آپ کی نئی کہانیاں موصول ہو چکی ہیں، اللہ تعالیٰ آپ اور تمام رائٹر حضرات کو صحت دے اور خوشیوں سے نوازے تاکہ آپ تمام حضرات اچھی اچھی تحریریں لکھتے رہیں، آئندہ ماہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار سے۔ السلام علیکم! چلچلاتی دھوپ، آگ برساتے سورج کی تپش میں ڈر دا حاضر مطالعہ ہے۔ شہری ماہوت کی جگہ پر ایم اے راحت صاحب کی نئی کہانی کا آپ نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ فرزانہ عابد کے تبصرے سے اتفاق کرتے ہیں...... ایم اے خان کے تبصرے پر اختلاف ہے یہ جاسوسی نظام ہی ہے کہ پاکستان اچھے آپ کو بچا بیٹھا ہے...... سالگرہ نمبر میں شامل ہونے کی تیاری شروع کر دی ہے۔ ہم ایک سال نہیں بلکہ سالوں سال سے چھپنے والی کہانیوں کا تجزیہ کر سکتے ہیں، عید کے اشعار پڑھ کر دل بہت خوش ہوا، محفل جمی، خیالوں میں کھو گئے۔ بہت بہت شکریہ بشرط زندگی رہی پھر ملیں گے۔

☆☆ شرف الدین صاحب: نوازش نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے، خوشیوں سے نوازے کہ آپ ہر ماہ ڈر کی محفل میں شرکت کیا کریں، آئندہ ماہ بھی آپکے خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

فلک فیضان رحیم یار خان سے۔ السلام علیکم! ڈر ہمیشہ کی طرح شاندار ہے۔ اگست کے شمارے میں اپنا خط نہ پا کر دکھ ہوا، کہانیوں میں ہر ولوکا اچھی رہی۔ عطیہ زاہرہ کی اسٹوری زبردست تھی رضا ساسٹر نے بھی اچھا لکھا۔ عشق ناگن، آخری آدمی ، قبر کے شعلے، پس منظر سب اسٹوریز اچھی لگیں۔ اللہ تعالیٰ ڈر کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دے اور پاکستان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

☆☆ فیضان صاحب: دراصل پچھلے ماہ آپ اور کئی دوستوں کے خطوط لیٹ بلکہ بہت لیٹ موصول ہوئے جس کی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔ Thanks.

محسن عزیز حلیم کوٹ کلاں سے۔ السلام علیکم! ڈر کے تمام اسٹاف اور تمام امت مسلمہ کے لئے سلامتی اور خوشی کی دعائیں، ماشاءاللہ ڈر کی محفل میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں ڈر کی محفل میں غیر حاضر رہا۔ But آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ ہمیں پیدل آنا پڑتا ہے اور پھر سے اف اتنی گرمی۔ پر مجھ کو پتہ ہے کہ میرے بغیر ڈر کی محفل بھی تو سونی ہو جائے گی۔ ساحل دعا بخاری، عطیہ زاہرہ، راحل بخاری، فرزانہ عابد، ساجد و راجا مجید جمیس، جب آپ سب لکھتی ہیں تو پڑھنے والا بیچ کہانیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ 26 رمضان کو میری سالگرہ ہے۔ پتہ چلے گا کہ آپ سب مجھے کیسے وش کرتے رہیں، عبدالحلیم میرا فرینڈ ہے اس لئے اپنے نام کے آگے اس کا نام آخر میں سب بھائیوں کے لئے ڈھیر ساری دعائیں اور ڈر دن دگنی ترقی کرتا رہے۔ آمین۔

☆☆ محسن عزیز صاحب: آپ کو ڈر سے والہانہ لگاؤ ہے اس کے لئے بہت بہت شکریہ، امید ہے کہ آئندہ بھی آپکی قلم سے لکھا ہوا نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ سالگرہ بہت مبارک ہو، تمام اہل ڈر کی طرف سے۔

محسن علی طاب بھکر سے۔ السلام علیکم! اللہ پاک ڈر کے تمام اسٹاف کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ ڈر کا شمارہ 21 جولائی کو مل گیا تھا مگر مطالعہ لیٹ کر پایا۔ ڈر اگست 2014ء کا شمارہ لاجواب تھا۔ ٹائٹل ٹھیک تھا۔ قرآن مجید کی باتیں پڑھ کر دل منور اور ایمان تازہ ہو گیا۔ خطوط میں ساحل دعا بخاری صاحبہ اور ضرغام محمود صاحب کا خط پسند آیا۔ میرا خط اور شعر شامل کرنے کا شکریہ۔ کہانیوں میں رودو کا واہ واہ، شیطانی گرفت نے واقعی اپنی گرفت میں گرفتار کر لیا۔ میں نے بے اختیار اللہ پاک کی پناہ مانگی۔ شیطان پر اللہ کی لعنت، ظلم جب زیادہ ہو جائے تب اللہ پاک کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آ جاتی ہے۔ تب ہی کہتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہے۔ روح کی تلاش آخر کار ماں کی روح کو چین آ ہی گیا۔ سفید لبادے نے حقیقت سے پردہ اٹھایا۔ مقناطیسی آنکھیں کڑوی سچائی تھی۔ قوس قزح میں سحرین بلال اور راغب عثمان چھائے ہوئے تھے۔ نقاب میں جمال ہی چھایا ہوا تھا۔ اچھی اسٹوری تھی مبارکباد ساحل دعا۔ بشرط زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی، خدا حافظ۔

☆☆ محسن صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks قوی امید ہے کہ آئندہ بھی نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

طارق عزیز کوٹھ کلاں سے۔ السلام علیکم! ڈر ڈائجسٹ ہم ہر ماہ پڑھتے ہیں اور آپ ہمارے خط اور شعر شامل اشاعت نہیں کرتے، ہمارا گاؤں شہر سے کافی دور ہے۔ ڈر ڈائجسٹ ہمیں بہت پسند ہے، ہم اس کی خاطر فورٹ منرو شہر نگن پور ڈر آ کر لے جاتے ہیں لیکن آپ ہمارا خیال نہیں کرتے، ایک کہانی بھی ارسال کی تھی وہ بھی آپ نے شامل اشاعت نہیں کی......؟ ہمارا خط ضرور شائع کیا کریں۔

☆☆ طارق صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، اگر خط ہم تک نہ پہنچے یا بہت لیٹ موصول ہو تو آپ خود بتائیں اس کا کیا حل ہے، آئندہ ذرا جلدی کا خیال رکھا کریں، شکریہ۔

طارق محمود کامرہ کلاں اٹک سے۔ السلام علیکم! ڈر کے تمام اسٹاف، لکھنے اور پڑھنے والوں کے لئے خیریت کی دعا۔ کافی عرصہ سے ڈر پڑھ رہا ہوں، کہانیاں تمام کی تمام بہترین ہوتی ہیں، میں نے کوشش کر کے کچھ لکھا اور پھر ہمت کر کے غزل اور کہانیاں بھجوا دیں، جولائی کے رسالہ میں اپنا خط، غزل اور اگست کے شمارے میں اپنی کہانی "قبر کے شعلے" اور اعزازی کاپی وصول کر کے اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتا۔ جہاں تک تعارف کا تعلق ہے، ابھی میں ایک ناپختہ لکھاری ہوں۔ اب آتے ہیں سال کی اچھی کہانی کی طرف تو وہ 'رودو کا' ہی ہونی چاہئے، اس میں بھی ہر آدمی کی اپنی اپنی رائے ہے۔ اچھے رائٹرز میں ایم الیاس، ایس امتیاز، شہزادہ چاند زیب عباسی، محسن نقی، ایس حبیب اور خلیل احمد جبکہ خواتین رائٹرز میں ساحل دعا بخاری، ساجدہ راجا اور آصفہ سراج ہیں، ویسے ہر لکھنے والے کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایسی کہانی لکھے جو کہ ضرور شائع ہو اور پھر پڑھنے والے بھی اسے بہت پسند کریں، اسی لئے باقی رائٹرز بھی اچھا لکھتے ہیں۔ کچھ غزلیں اور دو کہانیاں "جنات کا محبوب" اور "آسیبی درخت" بھجوا رہا ہوں۔ سالگرہ نمبر میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع ضرور دیجئے گا۔

☆☆ طارق صاحب: خط لکھنے اور کہانیاں بھیجنے کے لئے ویری ویری تھینکس، سالگرہ نمبر میں یقیناً جگہ ملے گی۔ کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ارسال کرنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

اسلم جاوید فیصل آباد سے۔ السلام علیکم! نیک دعاؤں خیر و عافیت کے ساتھ حاضر ہوں۔ ماہ اگست کا عید مبارک اسپیشل نمبر بہت خوبصورت تھا۔ اس بار سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ اندر جھانکا تو رنگین تحریروں سے ملاقات ہوگئی۔ قارئین کے خطوط پڑھ کر دل بہت خوش ہوا، ساتھ قرآن کی باتیں اچھا سلسلہ تھا۔ ہر کہانی خوب سے خوب تر تھی۔ عید پر اشعار بہتر تھے، قوس قزح اور غزلیں بھی کی سب لاجواب تھیں۔ اس بار خط پھر لیٹ ہو گیا، سوچا تھا کہ مقررہ وقت پر خط تحریر کروں مگر ایسا نہ کر سکا، وقت ہی نہیں ملتا تھا کچھ کام کی مصروفیات کی وجہ سے میں مجبور تھا، معذرت خواہ ہوں۔ اب جبکہ پرچہ پریس میں جانے کی تیاری میں ہوگا اور میرا خط آپ کو دیر سے ملے گا، غزل اور خط شائع نہ ہو سکے گا۔ ماہ اگست کے شمارے میں خط اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ جس طرح قلبی لگاؤ کے ساتھ خط ارسال کرتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور حوصلہ، ہمت دے اور خوشیوں سے نوازے، کاروبار میں ترقی دے۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

طاہر اسلم بلوچ سرگودھا سے۔ السلام علیکم! ماہ اگست کا ڈر ڈائجسٹ مجھے 23 جولائی کو ملا۔ جب ڈر ہاتھ میں آیا تو دل کو بہت خوشی ہوئی کہ میری کہانی سچا عاشق کمپوز ہو چکی ہے اور اگلے شمارے میں شامل اشاعت ہوگی یہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ آپ میری تمام

غزلیں اور اشعار رغبرہ شامل کیا کریں۔ ماہ اگست کے شمارے میں اپنا شعر دیکھ کر دل کو بہت خوشی ہوئی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ہر ماہ میں اپنے پیارے ڈر ڈائجسٹ کے لئے خوب صورت تحریریں روانہ کرتا رہوں گا۔

☆☆ طاہر صاحب: خوش ہو جایئے، کہانی شامل اشاعت ہے اور قوی امید ہے کہ آپ آئندہ بھی تحریریں بھیج کر شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے . Thanks.

راجہ باسط مظہر حافظ مکھی سے۔ السلام علیکم! امید کرتا ہوں تمام قارئین، رائٹرز اور تمام اسٹاف ممبرز خیر و عافیت سے ہوں گے انشاء اللہ آپ تمام حضرات کو خوش رکھے جو ہر ماہ ڈر ڈائجسٹ کے لئے اتنی محنت سے تحریریں لکھتے ہیں اور بڑے عالیشان انداز سے سنوار کر قارئین کی نظر کرتے ہیں۔ اگست کا شمارہ ابھی تک نہیں ملا...... جولائی کا شمارہ تھوڑا لیٹ ملا، اس لئے جولائی کے شمارے پر تبصرہ دیں گے۔ کہانیوں کی فہرست دیکھنے کے بعد "قرآن کی باتیں" پڑھیں اور ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر سے ایمان تازہ ہو گیا، دل کو بہت سکون ملا۔ کہانیوں میں "روح کا انتقام" محمد خالد شاہان کی تحریر بڑی بیسٹ رہی۔ اس کے علاوہ "دل کا خون" احسان سحر، "شب قدر" رفعت محمود، "حویلی کا راز" الیاس اعجاز احمد، "عذاب تنہائی" صبا محمد اسلم نے بہت خوب لکھا، ایک سبق آموز تحریر تھی۔ "آزمائش" عائشہ سحر کی تحریر پسند آئی۔ "پراسرار جوڑا" اور "زمان کی روح" بھی بیمن ڈر کے مطابق تھیں، پڑھ کر اچھا لگا۔

☆☆ باسط صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، خوش ہو جایئے، کہانی شامل اشاعت ہے اور آئندہ بھی شامل اشاعت ہوگی۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

بیبر نوید شاہ ٹنڈو جام سندھ سے۔ آداب عرض، کئی ماہ کے وقفے کے بعد اپنے تبصرے اور کچھ مواد کے ہمراہ خطوط کی بزم میں شامل ہو رہا ہوں۔ معاشی مسائل کے باعث حالات نے مجھے مطالعے تک ہی محدود کر دیا۔ دعا کریں کہ مسائل کے بادل جلد چھٹ جائیں تا کہ باقاعدہ حاضر ہوتا رہوں۔ ڈر ڈائجسٹ کے معیار میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اور یک اسٹائل پر سب سے نمایاں نظر آنے لگا ہے جبکہ مواد کے معیار کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ جس میں بتدریج اضافہ جاری ہے...... یہی وہ اہم وجہ ہے جس کے باعث اس ماہ ہم قلم تھامنے سے خود کو روک نہ سکے۔ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کس کہانی کا تذکرہ کروں اور کس کس کو چھوڑوں؟ بہرحال ہماری ذاتی رائے کے مطابق شمارہ اگست 2014ء میں پہلے نمبر پر ساحل دعا بخاری کی "نقاب" رہی۔ بے انتہا تجسس بھرا اس کہانی نے تفریح کے تمام لوازمات فراہم کئے۔ عمران قریشی کی "زی" دوسرے نمبر پر رہی۔ منفرد پلاٹ اور دلچسپ انداز تحریر نے اس حیرت انگیز کہانی کو چار چاند لگا دیئے۔ صفحہ 199 پر موجود پیراگراف سے اس خیال کو مزید تقویت ملی کہ یقین کی پختگی اور اعتبار ہو تو سب ممکن ہو جاتا ہے۔ تیسرے نمبر پر طیبہ زاہدہ کی "شیطانی گرفت" رہی۔ آغاز کچھ خشک رہا لیکن آگے چل کے کہانی واضح اور دلچسپ ہوتی گئی۔ فرحان احمد نصیب کی "جناتی کہانیاں" چوتھے نمبر پر آنے والی شاندار کہانی ہے۔ ضرغام محمود ہمارے سینئر لکھاری ہیں۔ ہماری طرح بچوں کے ادب میں کافی سرگرم رہے۔ عرصہ تک غائب رہنے کے بعد آن اور شان سے واپس لوٹے ہیں، کئی رسالوں میں خوب جم کے لکھ رہے ہیں۔ "منحوس حویلی" ان کی "ڈرامائی انداز کی لاجواب کہانی ہے۔ جس میں باپ کی تلاش میں سرگرداں بیٹے کو کامیابی سے ہمکنار ہوتے دکھایا گیا۔ شگفتہ ارم درانی کی "زہریلا شیش" چھٹے نمبر پر رہی۔ ساتویں نمبر پر "روح کی تلاش" رہی، عثمان غنی کی "پس منظر" کا بھی جواب نہیں۔ اسے آٹھواں نمبر دیتے ہیں۔ بے وفائی کے مرتکب لوگوں کے لئے یہ کہانی درس عبرت سے کم نہیں۔ نویں نمبر پر طارق محمود کی "قبر کے شعلے" رہی، نافرمان، خود سر بیٹا...... جب کسی کی محبت میں گرفتار ہوا تو محبت کے حصول کی خاطر سفلی علوم کی بھینٹ چڑھا اور قسمت بھی کر بیٹھا...... اور منزل پا گیا۔" کسی کا انتقام" کو دیتے ہیں دسواں نمبر۔ الیاس اعجاز احمد بھی دور حاضر کے نامور ادیب ہیں اور تقریباً ہر رسالے میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی یہ تحریر کہانی نہیں درحقیقت ایک مضمون ہے۔ جس میں انہوں نے معریات کے متعلق دلچسپ کارآمد معلومات فراہم کی ہیں اور بڑا تحیر پیدا کیا ہے۔ دلبدان اقبال صاحب۔ دلیپ میں شب روز ڈر ڈائجسٹ کی مزید ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔ ڈر ڈائجسٹ خوب ترقی کرے۔

☆☆ نوید صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، اور قلبی لگاؤ سے آپ نے جو کہانیوں کی تعریف کی ہے اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔ آئندہ بھی آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اور خط میں آپ ضرور اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔

☆☆☆

اماوس کا اندھیرا

عمران قریشی۔ کوئٹہ

ہر طرف روشنی پھیلی تھی کہ پھر اچانک وہ شخص گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھر گیا اس کی آنکھوں کی پتلیاں جیسے بے نور ہوگئیں، ذہن ماؤف ہوگیا، ٹانگوں میں سکت باقی نہ رہی اور پھر اچانک……

تقدیر سے نبرد آزما ایک شخص کی لرزیدہ لرزیدہ دلوں کو مبہوت کرتی حقیقی روداد

راجو نے آدھے کھیت کو پانی دیا۔ اور تھک ہار کر آم کے درخت کے سائے میں آ بیٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج سوا نیزے سے زیادہ قریب آ گیا ہو۔ گرمی کا یہ عالم تھا کہ سانس لینا بھی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ مزید آدھے کھیت کو پانی دینا اسے تکلیف دہ محسوس ہونے لگا۔ آم کے درخت کے نیچے ماحول قدرے بہتر تھا۔ اس نے سر پر موجود پگڑی کو نیچے اتارا۔ اور تکیہ کی صورت دینے کے بعد ٹھنڈی زمین پر لیٹ گیا۔ اسے اپنی جوانی کے چند ایام یاد آنے لگے۔ اس کی زندگی کا کل اثاثہ چند یادیں ہی تو تھیں۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اور کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔

وہ جوانی کے دنوں میں ایک ایسی لڑکی کی محبت میں گرفتار رہا تھا۔ جو گاؤں کے ٹھاکر کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کا نام سندری تھا۔ راجو کے گھر کی چاردیواری سے کچھ اوپر سندری کے گھر کا کوٹھا شروع ہوتا تھا۔ کوٹھے کی چاردیواری نہ ہونے کی بدولت وہ اکثر چھت پر دکھائی دے جاتی تھی۔ راجو اس کے دیدار کے لئے گھنٹوں دھوپ میں کھڑا رہ کر اس کا انتظار کرتا تھا۔ وہ چھت پر آتی تھی۔ خاموشی کے ساتھ کپڑے خشک کرنے کے لئے لٹکاتی تھی۔ پھر اس کی جانب دیکھے بغیر خاموشی کے ساتھ واپس چلی جاتی تھی۔ نظر اٹھا کر دیکھنا تو در کنار وہ نیچے کی جانب چہرہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھی۔

راجو کو بے حد مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان دنوں وہ دسویں کلاس کا طالب علم تھا۔ سندری قریبی شہر میں موجود کالج میں بارہویں جماعت میں زیر تعلیم تھی۔ اس لحاظ سے وہ راجو سے دو سال بڑی تھی۔ لیکن محبت میں عمر، رنگ، ذات پات کو کہاں دیکھا جاتا ہے۔ راجو نے بھی نظر انداز کر دیا۔ سندری صبح تانگے پر اسکول جاتی تھی۔ اکثر اوقات راجو اور سندری کا سامنا ہو جاتا تھا۔ مگر توجہ کا مرکز کبھی بھی راجو کا وجود نہیں رہا تھا۔ اس بات کو محسوس کر کے راجو کا دل ہمیشہ مسخ جاتا تھا۔

تب ایک دن راجو نے گاؤں سے باہر پہاڑوں کے قریب بیٹھنے والے ایک جوتشی کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نام تو نہ جانے کیا تھا۔ لیکن گاؤں کے لوگ اسے رام بھروسے کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کی عمر بمشکل پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ لیکن مریدوں کا یہ عالم تھا کہ اسے فارغ بیٹھنے کی سہولت کم ہی میسر آتی تھی۔ پہاڑی علاقے کے قریب ہی اس کی کٹیا موجود تھی۔ چند عرصے کی سوچ و بچار کے بعد راجو اس کے پاس جا پہنچا۔ ملاقات کے لئے آدھا گھنٹہ

انتظار کرنا پڑا۔ تب کہیں جاکر اس کی باری آئی۔ رام بھروسے کا حلیہ کچھ یوں تھا۔ گیروے رنگ کی کفنی میں ملبوس تھا۔ شلوار کا اتا پتا موجود نہیں تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور داڑھی سینے تک لمبی اور سیاہ تھی۔ جسم کمزور اور لاغر، ناک طوطے کی چونچ کی طرح آگے سے مڑی ہوئی تھی۔ آواز پتلی اور چیختے ہوئے کوے سے مشابہ تھی۔

راجو نے جب آنے کی وجہ اسے بتائی۔ تب چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد وہ بولا۔

"لڑکی کی قربت تمہیں میسر آجائے گی۔ لیکن کچھ قربانی دینی ہوگی۔" راجو نے نا سمجھنے والے انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں پایا۔ آپ کیسی قربانی کی بات کررہے ہیں۔" تب رام بھروسے پراسرار لہجے میں بولا۔

"میرے مریدوں میں زندہ انسانوں کی نسبت روحوں کی تعداد بہت کم ہے۔ میں مکمل جوتشی بننے کے لیے ان کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ روحوں کو میرے پاس لانا تمہارے اختیار سے باہر ہے۔ لیکن اگر زندہ انسان کو میرے پاس لاسکو۔ تب میرے پاس ایسے عملیات والے تعویذ موجود ہیں۔ جن کی بدولت لڑکی تمہارے قدموں میں اپنے جسم و جان کو نچھاور کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔" راجو نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو تقریباً کتنے زندہ وجود کی ضرورت ہے۔" اس نے چند لمحے آنکھیں بند کرکے سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔

"تین صحت مند اور نوجوان لڑکوں کی روحیں مجھے دوسیانے درجے کا جوتشی بنا سکتی ہیں۔ بس کوشش کرکے تین وجود کو پہاڑ کے دوسری جانب موجود سیاہ غار تک پہنچادو۔ آگے کا کام میرا ہے۔" راجو نے اثبات میں سر ہلادیا اور واپس گاؤں کی جانب چلا آیا۔

راجو کے اسکول میں بے وقوف لڑکوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے ان میں سے خاص طور پر ایسے لڑکوں کا انتخاب کیا۔ جن کے آگے پیچھے پوچھ گچھ کرنے والے افراد نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایسے لڑکوں کو ہمہ وقت پیسوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ اس نے انہیں چند منٹ کام کرنے کا بھاری معاوضہ بتا کر کام کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ پھر انہیں چھٹی کے بعد گاؤں سے باہر موجود پہاڑوں کے پاس انتظار کرنے کا حکم دے کر اپنے گھر چلا آیا۔ کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد اس نے گھر والوں کو بتایا۔ "ہمارے گاؤں کے لڑکوں کا دوسرے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کبڈی کا میچ شروع ہونے والا ہے۔ اس لیے شام کو انہیں دیر ہوسکتی ہے۔ گھر والوں نے اعتراض کرنے کی کوشش کی۔ تب اس نے اپنی ہٹ دھرمی کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے انہیں نظر انداز کردیا۔ اور خاموشی کے ساتھ پہاڑوں کی جانب چلا آیا۔

یہاں لڑکے اس کے منتظر تھے۔ اس نے انہیں ہمراہ لیا اور مختصر پہاڑی کو عبور کرکے تینوں لڑکوں کو سیاہ غار کے قریب لے آیا۔ رام بھروسے اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے جانچنے والی نگاہوں کے ساتھ لڑکوں کے صحت مند جسموں کا جائزہ لینے کے بعد اطمینان کا اظہار کیا۔ اور راجو کو لڑکوں سے دور لے جانے کے بعد سادہ رنگ کا ایک کاغذ ہاتھوں میں تھماتے ہوئے نصیحت کی۔ "وہ اس ٹکڑے کو پانی میں بھگو کر وہ تمام پانی سندری کو پلادے۔ اس کے بعد کرشمہ خود ظاہر ہوجائے گا۔ لیکن اگر تعویذ کے اثرات کے دوران لڑکی کا خون بہہ نکلا تب تمام کرامات پر پانی پھر جائے گا۔ اس لیے کوشش کرنا۔ کہ تعویز کے اثرات کے دوران اس کا خون نہ نکلنے پائے۔ شادی کے بعد اگر ایسا ہو بھی جائے۔ تب مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس وقت تک وہ تمہیں اپنا چکی ہوگی۔

رام بھروسے لڑکوں کا ہاتھ تھام کر سیاہ غار کے اندر چلا گیا۔ اور راجو خاموشی کے ساتھ گاؤں واپس چلا آیا۔

دوسرے دن ارد گرد کے گاؤں میں لڑکوں کی گمشدگی کی خبر پھیل گئی۔ گاؤں کے سادہ لوگوں نے پہلے اپنے لحاظ سے بچوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پھر ناکام ہونے کے بعد گاؤں کے تھانے میں رپورٹ درج کرادی۔ حوالدار صاحب نے گاؤں کا رخ کیا۔

مختصر تفتیش کی۔ یہ تفتیش صرف خانہ پری کے لیے ترتیب دی گئی تھی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

راجو کے پاس سیاہ کاغذ موجود تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی۔ کہ سندری کو پانی میں ملا کر اس کاغذ کا عرق کیسے پلایا جائے۔ راجو نے اپنے قریبی دوست رامو کی خدمات حاصل کیں۔

صبح کے وقت جب سندری کو لینے کے لیے تانگے والا گاؤں میں داخل ہوا۔ تب راجو نے سڑک کے درمیان درخت کا بھاری تنا رکھ کر راستے کو تقریباً بند کر دیا۔ اور خود ایک جانب کھڑے ہو کر تانگے والے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دور سے مٹی کا طوفان اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ تانگے والا کچی سڑک پر تانگے کو بے تحاشا دوڑاتا ہوا اسی جانب آرہا تھا۔ اسے عام دنوں کی نسبت دیر ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ گھوڑے پر بے تحاشہ چابک برسا رہا تھا۔ گھوڑا ہنہناتے ہوئے طوفانی رفتار میں بھاگ رہا تھا۔ درخت کے قریب پہنچ کر کوچوان نے گھوڑے کی راسیں کھینچیں۔ گھوڑا اگلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے بعد سڑک کے درمیان میں رک گیا۔ کوچوان نے نیچے اتر کر حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ تنے کے پاس کھڑے ہوئے رامو کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیا معاملہ ہے؟“ رامو نے کاندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے معلوم نہیں صبح سے یہ تنا سڑک کے درمیان میں پڑا ہے۔ نہ جانے کس کی حرکت ہے۔ اگر مناسب جانتے ہو تو مل کر اسے ایک جانب کر دیتے ہیں۔“

کوچوان کو پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ اور آگے بڑھ کر رامو کے ہمراہ تنے کو سڑک سے نیچے دھکیلنے لگا۔

راجو قریبی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ دبے قدموں باہر نکلا۔ اور تانگے کے پاس بیٹھ کر پہیے کے درمیان لگے ہوئے دھرے کو کھول کر توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ مختصر اوزار اس کے ہمراہ موجود تھے۔ اس لیے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اسے زیادہ دشواری نہیں اٹھانی پڑی۔ یہ احتیاطاً اس نے خود کی۔ کہ دھرا بالکل ٹوٹنے نہیں پائے۔ اسے ٹوٹنے کے لیے چند لمحات درکار ہوں۔ اتنی دیر میں رامو اور کوچوان نے درخت کے تنے کو گھسیٹ کر سڑک سے نیچے کی جانب دھکیل دیا۔

راجو نے اوزار سنبھالے۔ اور احتیاط کے ساتھ جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ چند لمحے کی مشقت نے راجو کو پسینے سے شرابور کر دیا۔ لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ سندری کو پانے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ کوچوان نے رامو کا شکریہ ادا کیا۔ اور تانگے میں بیٹھ کر سندری کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ رامو بھی راجو کے ساتھ ہاتھ ملا کر واپس گاؤں کی جانب چلا گیا۔ راجو نے کپڑے جھاڑے۔ اور سڑک پر چلتا ہوا گاؤں کے مخالف جانب قدم بڑھانے لگا۔ چند لمحے نہیں گزرے ہوں گے۔ کہ اس نے گاؤں کی جانب سے تانگے کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔

گھوڑا گاڑی طوفانی رفتار سے شہر کی طرف سفر کر رہی تھی۔ راجو سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑا قریب سے گزرتا چلا گیا۔ سندری پچھلی سیٹ پر پردے میں بیٹھی تھی۔ اس کا بیگ ساتھ والی سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ اور پانی کی بوتل تانگے کے اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی تھی۔ چند لمحات کے وقفے سے تانگہ نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔

راجو سیٹی بجاتے ہوئے درخت کی آڑ سے باہر نکلا۔ اور تانگے کے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ تانگہ زیادہ دور تک کا سفر نہیں کر سکتا تھا۔ عنقریب تانگے کا دھرا ٹوٹنے والا تھا۔ اسے واقعی زیادہ سفر نہیں کرنا پڑا پہاڑی علاقے کے شروعات میں تانگہ گاڑی سڑک کے درمیان کھڑی تھی۔

سندری سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے سڑک کنارے بیٹھی ہوئی تھی۔ اور کوچوان دھرا تبدیل کرنے میں مصروف تھا۔ راجو نے قریب پہنچنے کے بعد کوچوان

سے دھرا ٹوٹنے کی وجہ دریافت کی۔ تب اس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اسے بتایا کہ ''آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کہ بھاگتے ہوئے تانگے کا دھرا اچانک ہی ٹوٹ جائے۔'' راجو نے سندری کی جانب دیکھتے ہوئے پرتفکر لہجے میں پوچھا۔

''مالی نقصان کے علاوہ جسمانی نقصان تو نہیں ہوا۔''

''مجھے لگتا ہے کہ سندری کی طبیعت ناساز ہے۔'' کوچوان نے چونکتے ہوئے سڑک کنارے بیٹھی ہوئی سندری کی جانب دیکھا۔ اور پریشان چہرہ لیے اس کی طبیعت کے متعلق دریافت کرنے لگا۔

راجو نے آنکھیں بچا کر تانگے کے اسٹینڈ کے ساتھ لٹکی ہوئی بوتل کو پھرتی کے ساتھ نیچے اتارا۔ پھر اپنے کرتے کی جیب میں سے چھوٹی سی بوتل باہر نکال کر اس کا تمام پانی سندری کی بوتل میں انڈیل دیا۔ پھر بوتل کو ہاتھوں میں تھامے کوچوان اور سندری کی جانب چل دیا۔ کوچوان سندری کو اٹھانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ سندری کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

راجو نے بوتل کوچوان کے ہاتھوں میں تھما دی۔ پھر پریشان لہجے میں بولا۔

''میرے خیال میں ان کی طبیعت ناساز ہے۔ آپ انہیں پانی پلا دیجیے ٹھیک ہو جائیں گی۔''

کوچوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور بوتل کا ڈھکنا کھول کر اسے سندری کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا۔ گرمی عروج پر تھی۔ سندری نے پانی پینا شروع کر دیا۔ تقریباً آدھی بوتل پانی پینے کے بعد اس نے بوتل سے ہونٹ ہٹا لیے۔ اور سر کو دونوں ہاتھوں کے ساتھ تھام کر دوبارہ زمین پر بیٹھ گئی۔

کوچوان پریشان لہجے میں بولا۔

''میاں تم میری مدد کرو۔'' تانگے کا دھرا ٹوٹ گیا ہے۔ اور دوسرا دھرا ڈالنے کے لیے وقت درکار ہے۔ سندری بی بی کی طبیعت ناساز دکھائی دیتی ہے۔ انہیں جلد از جلد گھر پہنچانا ہوگا۔''

راجو نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور کوچوان کے ہمراہ تانگے کا دھرا تبدیل کرنے لگا۔ انہیں زیادہ دیر کام نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی پرانا دھرا نکال کر نیا لگا دیا گیا۔ کوچوان نے سندری کو سہارا دیا۔ اور تانگے کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ پھر تشکر بھرے انداز میں راجو کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''میاں تمہاری وجہ سے دھرا جلدی بدل گیا۔ ورنہ بہت محنت کرنی پڑتی اگر مناسب سمجھو تو تانگے میں بیٹھ کر تمہیں گاؤں پہنچا سکتا ہوں۔''

راجو نے انکار میں سر ہلایا۔ اور کوئی بھی جواب دیئے بغیر پیدل ہی گاؤں کی جانب چل دیا۔ وہ اپنے آپ کو سندری کے گھر والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ ان دونوں کی محبت کے لیے دوری نہایت ضروری تھی۔

اگلے چند دنوں کے دوران سندری چھت پر نہیں آئی۔ شاید ایسا طبیعت کی ناسازی کی بدولت تھا۔

بہرحال وہ جمعرات کی رات تھی۔ شدید حبس کی بدولت راجو نے اپنی چارپائی صحن میں ڈال دی۔ اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ چودھویں کا مکمل ہوتا ہوا چاند سامنے موجود تھا۔ چاند کے بالکل نیچے سندری کا کوٹھا تھا۔ جو ویران پڑا ہوا تھا۔ چودھویں کے چاند کو غور سے دیکھنے کے بعد راجو نے اچانک آنکھیں بند کر لیں۔ سرمئی اندھیرے کے درمیان چاند واضح ہونے لگا۔ لیکن اس چاند کی چاندنی آسمان والے چاند سے بہت زیادہ تھی۔ چہرہ خوبصورت اور مکمل تھا۔ یہ سندری تھی۔

راجو نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اب آسمان پر موجود چہرہ دکھائی دینے لگا۔ لیکن اس چاند کے بالکل نیچے سندری کا دمکتا ہوا چہرہ بھی موجود تھا۔ راجو ہڑبڑا کر چارپائی پر سے نیچے اتر آیا۔ اور اپنی پگڑی کو درست کرتے ہوئے چھت کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ واقعی سندری تھی۔ راجو کی گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی چھت کے کنارے پر آ بیٹھی۔ اس کی نگاہوں کا مرکز حیرت انگیز طور پر راجو کا وجود تھا۔

آنکھیں کھوئی کھوئی سی دکھائی دیتی تھیں۔

راجو دوبارہ چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اور سندری کی جانب دیکھنے لگا۔ تمام رات ایک دوسرے کا دیدار کرتے ہوئے گزر گئی۔ صبح کے قریب وہ چھت پر سے نیچے چلی گئی۔

رام بھروسے کے تعویذ کا جادو چل گیا تھا۔ سندری اس کی محبت میں گرفتار ہونے لگی تھی۔

اب یہ روز کا معمول بن گیا۔ وہ آدھی رات کے قریب چھت پر آجاتی۔ دونوں تمام رات ایک دوسرے کا دیدار کرتے۔ صبح کے قریب سندری واپس چلی جاتی۔ باقی کا تمام دن خیالوں میں بیت جاتا۔

اس رات موسم ابر آلود لیکن خوشگوار تھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔ راجو نے چارپائی برآمدے میں ڈال دی۔ اس کے خیال کے مطابق سندری موسم کے تیور کو مدنظر رکھتے ہوئے چھت پر نہیں آسکتی تھی۔ لیکن رات کو بارہ بجے کے بعد وہ اچانک ہی نمودار ہوئی۔ اور چھت کے مخصوص کنارے کے قریب بیٹھ گئی۔ راجو نے گھبرا کر اسے نیچے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ سندری نے مسکراتے ہوئے گردن کو ہلا کر انکار کر دیا۔ بوندا باندی کا آغاز ہو گیا تھا۔ بادل خوفناک انداز میں گرجنے لگے۔ طوفان آنے والا تھا۔ ہوا کی شدت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن سندری نیچے جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پھر موسلا دھار بارش کا آغاز ہو گیا۔ چھاجوں پانی برسنے لگا۔ اور سندری کا خوبصورت وجود پانی کی بدولت بھیگنے لگا۔ وہ چھوئی موئی کی مانند اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔ لیکن ایسا کرنے سے وہ اپنے جسم کو بھیگنے سے بچا نہیں سکتی تھی۔ اس لیے چند لمحوں کے بعد پانی کی بدولت اس کا جسم شرابور ہوتا چلا گیا۔ اور سردی کی بدولت وہ ٹھٹھرنے لگی۔

معاملہ راجو کے اختیار سے باہر ہونے لگا۔ پھر اس نے بے اختیار اپنے جسم پر موجود گرم چادر کو ایک جانب پھینکا۔ اور بھاگتا ہوا صحن کے درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ بارش طوفانی انداز اختیار کیے ہوئے تھی۔ اس کا جسم پانی میں بھیگنے لگا۔ سندری کے کوٹھے کی دیوار کے نیچے راجو کے صحن کی جانب پیال کا ڈھیر اوپر تک لگا ہوا تھا۔ اس ڈھیر کو مضبوط چادر کے ذریعے ڈھانپنے کے بعد مختصر مٹی کی تہہ کے ذریعے چھپا دیا گیا تھا۔ جتنی بھی پیال کی ضرورت ہوتی تھی۔ اتنا پیال ایک کنارے پر سے باہر نکال کر بوری کے ذریعے برابر کر دیا جاتا تھا۔ یہ پیال سندری کے کوٹھے کے قریب تک چھت کے کنارے کو چھو رہا تھا۔

راجو بندروں کی مانند پیال پر چڑھنے لگا۔ سندری کی نگاہیں اس کے جسم پر مرکوز تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں راجو پیال کے ڈھیر کے اوپری حصے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں سے مزید اوپر جانا مشکل نہیں تھا۔ سندری کے کوٹھے کی دیواریں پکی اینٹوں سے مزین تھیں۔ یہ اینٹیں آگے پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ انہیں پلستر نہیں کیا گیا تھا۔ وہ انہیں پکڑتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔ چھت کے کنارے کے قریب پہنچ کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کنارے کو مضبوطی کے ساتھ تھاما۔ اور چھلانگ لگا کر چھت پر آ کھڑا ہوا۔ دور کہیں بادل گرجے بجلی تڑاخ کی آواز کے ساتھ پہاڑوں پر گری۔ ماحول وقتی طور پر روشن ہوا۔ پھر دوبارہ اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

سندری نے گھبرا کر راجو کے ساتھ لپٹنے کی کوشش کی۔ راجو بدحواس ہو کر پیچھے ہٹا۔ اور چھت کے کنارے پر گرتا چلا گیا۔ سندری اس کے وجود کے اوپر آ گری۔ اس کے بھیگے ہوئے وجود کی خوشبو نے راجو کو مزید بدحواس کر دیا۔ جسم کا گداز پن اور کنوارے جسم کے نوخیز ابھار نے جلتی پر تیل کا کام کیا اس نے مضبوطی کے ساتھ سندری کے جسم کو بھینچنے کی کوشش کی۔ لیکن اچانک ہی قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔

راجو نے چونک کر سامنے کی جانب دیکھا۔ کوئی سیڑھیاں چڑھ کر چھت کی طرف آ رہا تھا۔ راجو نے سندری کو اپنے جسم سے علیحدہ کیا۔ اور زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بجلی ایک دفعہ دوبارہ چمکی ماحول روشن ہوا۔ اور سندری کے گھر میں کام کرنے والا نوکر چھت پر نمودار ہوا۔ راجو نے چھلانگ لگائی۔ اور چھت کے کنارے پر

موجود پیال کے ڈھیر پر گرتا چلا گیا۔ پیال کی بدولت اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ صحن میں قدم رکھتے ہی اس نے گھوم کر سندری کے کوٹھے کی جانب دیکھا۔ اس کا نوکر نیچے جھانک رہا تھا۔ راجو نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر صحن کا دروازہ کھولا۔ اور گھر سے باہر نکلتا چلا گیا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ اور بے جان کر اسے اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے پاؤں میں جو ایک چپل موجود تھی۔ دوسری چپل سندری کے کوٹھے کے اوپر رہ گئی تھی۔ اس نے پاؤں میں موجود چپل کو ہاتھ میں تھاما۔ اور گاؤں کے قریب واقع کنویں کی جانب چل دیا۔ کنواں زیادہ دور نہیں تھا۔ کافی عرصہ پہلے گاؤں والے اسے متروک قرار دے چکے تھے۔ اس لیے کچھ عرصہ قبل خشک ہو گیا تھا۔

راجو نے جوتی کنویں میں پھینک دی۔ اور ننگے پاؤں گھر کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ گاؤں ویران پڑا تھا۔ آوارہ کتے بھی پناہ گاہوں میں جا چھپے تھے۔ سندری کے گھر میں روشنی ہو رہی تھی۔ اور چیخنے چلانے کی آوازیں بھی بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ راجو نے توجہ نہیں دی۔ اور گھر میں داخل ہو کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر کمرے میں داخل ہو کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔

راجو نے چونک کر ماں باپ کے بستروں کی جانب دیکھا۔ وہ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ اس نے باپ کی چپل پہنی اور صحن میں سے ہوتا ہوا دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ دوسری جانب سرگوشیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر دوبارہ دروازہ دھڑ دھڑا گیا۔ راجو نے کنڈی نیچے گرا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے سندری کا نوکر کھڑا خونخوار نگاہوں کے ساتھ راجو کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہمراہ دو اور نوکر بھی موجود تھے۔ راجو نے استفہامیہ نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھتے ہوئے اتنی رات گئے دروازہ کھٹکھٹانے کی وجہ دریافت کی۔ نوکر زہر خند لہجے میں بولا۔

"ٹھاکر تمہیں بلاتا ہے، میرے ساتھ چلو۔" اس نے آگے بڑھ کر راجو کو بازو کے پاس سے تھامنے کی کوشش کی۔ راجو نے جھٹکے کے ساتھ اپنے بازو کو چھڑایا۔ اس کے ہمراہ سندری کے گھر کی جانب چل دیا۔ گھر میں چہل پہل کے آثار نمایاں تھے۔ لالٹین کی زرد روشنی مکان میں پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھاکر اور اس کے تینوں لڑکے صحن کے آگے بنے ہوئے برآمدے میں موجود چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سندری کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔

راجو کو گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر تینوں لڑکوں نے چارپائیوں سے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔

ٹھاکر نے سر کے اشارے سے انہیں منع کر دیا۔ راجو کی نگاہ ٹھاکر کے قریب پڑی ہوئی جوتی پر پڑی۔ وہ جوتی تھی۔ جسے وہ سندری کے کوٹھے پر چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ ٹھاکر نے جوتی کو ہاتھ میں تھاما۔ پھر راجو کی جانب رخ کرتے ہوئے بولا۔

"جوتی تمہاری ہے؟" راجو نے انکار میں سر ہلایا۔ تینوں لڑکوں نے بپھرے ہوئے انداز میں دوبارہ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ ٹھاکر نے دوبارہ منع کر دیا۔ پھر چارپائی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"ڈھکوسلے ہم نہیں جانتے کہ ہماری چھت پر چوری کرنے کی نیت سے کون آیا تھا۔ لیکن ہمارے نوکر بلونت رام کا کہنا ہے کہ وہ تم تھے۔" ٹھاکر اپنی عزت کی نیلامی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے بات کو گول کر گیا۔ اور واقعہ کو چوری سے تشبیہ دینے لگا تھا۔ وہ بول رہا تھا۔

"چور چوری کرنے کے بعد چھت سے کود کر تمہارے صحن میں داخل ہوا۔ پھر دروازہ کھول کر باہر کی جانب بھاگ گیا۔ لیکن جب ہمارا نوکر تمہیں بلانے کی نیت سے تمہارے گھر گیا۔ تب دروازہ اندر سے بند تھا۔ یعنی چور کے فرار ہونے کے بعد اسے اندر سے بند کیا گیا۔ یا پھر چور نے دکھاوے کے لیے گھر سے باہر کا رخ کیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے رخ تبدیل کیا۔

اور دوبارہ گھر میں داخل ہو کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ اور ہمارے گھر کو چلا آیا۔“ راجو نے خاموشی کے ساتھ ٹھاکر کی بات سنی۔ پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔

”آپ کے پاس ثبوت کے طور پر جوتی کے علاوہ اور کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ اور یہ جوتی میری نہیں۔ اگر آپ ہمارے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ تب بخوشی لے سکتے ہیں۔ رہی مکان کے دروازے کی بات تو میں اپنے گھر کے برآمدے میں سوتا ہوں۔ کچھ دیر پہلے میں نے کسی آدمی کے کودنے کی آواز سنی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ میں اسے دیکھ نہیں پایا۔ وہ مکان کا دروازہ کھول کر باہر فرار ہو گیا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ دروازے پہ دستک ہو گئی۔ اور میں آپ کے نوکروں کے ہمراہ یہاں چلا آیا۔“

ٹھاکر نے خونخوار نگاہوں کے ساتھ راجو کی جانب دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ تینوں لڑکے اپنے باپ کے حکم کے انتظار میں تھے۔ وہ صرف اشارے کے منتظر تھے۔ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد ٹھاکر نے اشارہ کر دیا۔ تینوں لڑکے بھیڑیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ لاتوں اور گھونسوں کی نا ختم ہونے والی بارش تھی۔ جس کی تیزی میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد راجو بے سدھ ہو کر زمین پر گر گیا۔ اس کے ناک اور منہ سے خون باہر نکل کر کپڑوں کو رنگین کر رہا تھا۔ ٹھاکر نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے تینوں لڑکوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اور نوکروں کو حکم دیا۔ ”راجو کو گاؤں سے باہر کھیتوں کے درمیان پھینک آئیں۔“ وہ اس کے وجود کو گھر کے قریب برداشت نہیں کر سکتا۔

دوسرے دن ٹھاکر نے راجو کے ماں باپ کو حویلی میں بلایا۔ اور انہیں تنبیہ کی۔ ”وہ جلد از جلد گاؤں چھوڑ کر دوسرے گاؤں چلے جائیں۔ ورنہ مزید دو دنوں کے بعد اگر اس نے انہیں گاؤں میں موجود پایا۔ تب انہیں نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔“

راجو کے ماں باپ نے گھر واپس آ کر مشورہ کیا۔ اور دوسرے دن گاؤں کو چھوڑ کر دوسرے گاؤں منتقل ہو گئے۔ گھر بدل گیا۔ لوگ بدل گئے۔ لیکن محبت میں رتی بھر کمی نہ آ سکی۔

چند دن انتظار کرنے کے بعد راجو اس ویران سڑک کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ جو سڑک شہر اور گاؤں کو آپس میں ملاتی تھی۔ اور جہاں سے روزانہ سندری کا تانگہ گزرتا تھا۔ سڑک کے کنارے بیٹھ کر راجو نے سندری کو مختصر خط لکھا۔ جس کا خلاصہ یوں تھا۔

سندری

حالات اختیار سے باہر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ تمہارے بغیر میرا جینا ممکن نہیں ہے۔ اور مرنا دشوار ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو۔ تب سویرے والی گاڑی میں شہر بھاگ جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارا ملن ہو گیا۔ تو پھر تمہارے ماں باپ کو راضی کرنا مشکل نہیں ہو گا۔ اور تمہارے ماں باپ ایک دفعہ راضی ہو گئے۔ تب حالات ہمارے حق میں سر جھکا دیں گے۔ جواب ضرور دینا۔ سویرے والی گاڑی صبح چھ بجے اسٹیشن پر آتی ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

تمہارا راجو

خط تحریر کرنے کے پندرہ منٹ کے بعد دور سے تانگہ آتا دکھائی دیا۔ کوچوان آگے بیٹھا ہوا تھا۔ اور سندری حسب معمول پچھلی سیٹ پر براجمان تھی۔ راجو نے تانگے کے قریب آنے کا انتظار کیا۔ وہ پہاڑی چٹان کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تانگہ قریب سے گزرنے کے بعد سڑک پر آگے بڑھنے لگا۔ تب راجو احتیاط کے ساتھ چٹان کے پیچھے سے باہر نکل آیا۔ سندری نے راجو کو دیکھ لیا۔ کوچوان کی کمر راجو کی جانب تھی۔ اس لئے وہ اسے دیکھ نہیں پایا۔ تانگہ ہلکی رفتار سے شہر کی جانب بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ راجو نے بھاگتے ہوئے تانگے کا تعاقب کیا۔ سندری نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ راجو کی جانب دیکھا۔ راجو نے ہاتھ میں موجود خط کو آگے کر دیا۔ وہ تانگے کے قریب پہنچ چکا

تھا۔ سندری نے چند لمحے ہچکچانے کے بعد خط کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ راجو نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے سلام کیا۔ پھر پہاڑوں کے قریب موجود گاؤں کی جانب چلا آیا۔

اس دن راجو کہیں نہیں گیا بلکہ گاؤں سے باہر موجود درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں لیٹ کر اپنے اور سندری کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ شام تک درخت کے نیچے بیٹھا رہا۔ اور شام ہونے سے پہلے گھر چلا آیا۔ باپ نے دیر سے آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب راجو نے جواب دینے کے بجائے برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی کا رخ کیا۔ اور خاموشی کے ساتھ چارپائی پر لیٹ گیا۔ چند لمحے راجو کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے رہنے کے بعد اس کا باپ پریشان لہجے میں بولا۔

"راجو بھگوان کے لیے کوئی غلط قدم دوبارہ نہیں اٹھانا۔ تمہاری بہنیں جوان ہو رہی ہیں۔ اور ہم ٹھاکروں کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہارا کوئی بھی جذباتی فیصلہ ہمارے مختصر کنبے کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ اگر میری مانتے ہو تو خاموشی کے ساتھ شہر اپنے تایا کے گھر چلے جاؤ۔ گاؤں سے دور ہو گے۔ تب خوش بھی رہو گے۔ اور مطمئن بھی رہو گے۔" راجو نے جواب دینے کے بجائے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ باپ نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

"کل تک سوچ کر مجھے جواب دے دینا۔ تمہاری ہاں یا پھر ناں ہمیں بخوشی منظور ہو گی۔" باپ خاموش ہو گیا۔ اور راجو نے مطمئنی کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے دن راجو دوبارہ شہر کو جانے والی سڑک کے کنارے کھڑا تانگے کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے مخصوص وقت کے دوران تانگہ پہاڑوں کے پاس سے نمودار ہوا۔ اور سست رفتاری کے ساتھ چلتا ہوا۔ راجو کی جانب بڑھنے لگا۔ سندری پچھلی سیٹ پر بت بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ نقاب کے پیچھے پوشیدہ تھا۔ راجو کے دل کی دھڑکن آپے سے باہر ہونے لگی۔ اگر سندری کے بھائیوں کو سب کچھ معلوم ہو جاتا۔ تب وہ کیا کرتے۔ اس کے بھائیوں اور نوکروں سے نپٹنا راجو کے اختیار سے باہر تھا۔

تانگہ آہستگی کے ساتھ قریب سے گزر گیا۔ راجو چٹان کے پیچھے سے نمودار ہو کر سڑک کے کنارے بھاگنے لگا۔ سندری کے بت بنے ہوئے جسم میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے۔ ہاتھ بیگ کے اندر رینگ گیا۔ اور جب واپس باہر آیا۔ تب سفید رنگ کا تہہ کیا ہوا کاغذ ہاتھ میں موجود تھا۔ اس نے کاغذ کو راجو کی جانب اچھال دیا۔ خط سنسان سڑک پر ادھر ادھر ہوا کے سنگ اڑنے لگا۔ راجو نے جھپٹ کر خط کو دبوچ لیا۔ پھر اسے کرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے سڑک کے کنارے موجود درخت کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ اس نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہاں اس کے علاوہ اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ خط کو کھولا۔ لکھا ہوا تھا۔

میرے محبوب!

تمہارا خط میں نے پڑھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم مجھے اس حد تک چاہتے ہو کہ میری وجہ سے اپنے گھر بار کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے علاوہ مزید چارہ کار باقی بھی نہیں رہا کہ ہم دونوں فرار کا راستہ اختیار کریں۔ سویرے والی گاڑی ٹھیک رہے گی۔ میں احتیاطاً اسٹیشن پر آنے سے پہلے اپنی ماں کے چند زیورات اور رقم بھی ہمراہ لے آؤں گی۔ تاکہ ہمیں مالی معاملات میں دشواری پیش نہ آ سکے۔ اپنا خیال رکھنا۔

تمہاری سندری

راجو نے خط کو بند کیا۔ اور کرتے کی جیب میں ڈالنے کے بعد تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ گھر کی جانب چل دیا۔ گھر والے اس کے منتظر تھے۔ باپ نے اس کا فیصلہ دریافت کیا۔ راجو نے جواب دینے کے بجائے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ماں باپ کے چہروں پر خوشی کے تاثرات رقص کرنے لگے۔ ماں نے سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ باپ

نے اگلے دن والی بس کے ٹکٹ خرید لیے۔ تمام گھر والوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ صرف راجو افسردہ تھا۔ اگر معاملہ اس کی ذات کی حد تک محدود ہوتا۔ تب وہ کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ لیکن اب معاملہ اس کی دونوں بہنوں کی عزت کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ اور وہ عزت کے آگے محبت کو قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔ سامان پیک ہو گیا۔

رات بے چینی کے عالم میں گزر گئی۔ صبح منہ اندھیرے راجو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے رہ رہ کر سندری کا خیال آ رہا تھا۔ اس کے بس میں کوئی بھی تدبیر ایسی موجود نہیں تھی۔ جسے اختیار کر کے وہ سندری کو اسٹیشن پر آنے سے روک سکتا۔ گھر والے گہری نیند سو رہے تھے۔ راجو نے گرم چادر کو جسم کے گرد لپیٹا۔ اور جوتے پہن کر گھر سے باہر نکل گیا۔ گاؤں میں ہو کا عالم طاری تھا۔ اسٹیشن اس گاؤں سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ اسٹیشن کی جانب چل دیا۔ گاؤں سے باہر نکلنے کے بعد سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ گاؤں کے کتوں نے بھونک بھونک کر اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن راجو نے پرواہ نہیں کی۔ اور تیز قدموں کے ساتھ چلتا رہا۔

جب اس نے اسٹیشن کی عمارت میں قدم رکھا۔ تب سورج پہاڑوں کے پیچھے سے طلوع ہونے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ مختصر پہاڑی اسٹیشن سنسان پڑا ہوا تھا۔ سویرے والی گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ راجو نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ پلیٹ فارم پر لگے ہوئے اکلوتے بینچ پر سیاہ چادر میں ملبوس وہ براجمان تھی۔ اس کے پاؤں کے پاس سیاہ رنگ کا چمڑے کا بیگ رکھا ہوا تھا۔ راجو نے قدم آگے بڑھانے شروع کیے۔ وہ دل میں مضمون ترتیب دے رہا تھا کہ سندری کو حالات کے متعلق کیسے بتانا ہے۔ ابھی وہ سندری سے کافی دور تھا۔ کہ اچانک ہی پہاڑی علاقے کی جانب سے تین آدمی نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں پکڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھے۔ پہلی نظر میں ہی راجو نے

انہیں پہچان لیا۔ وہ سندری کے بھائی تھے۔

راجو نے چھلانگ لگائی۔ اور اسٹیشن کا جنگلا عبور کر کے اپنے گاؤں کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ پیچھے دیکھنا فضول تھا۔ اسٹیشن سے فرار ہو جانے میں عقلمندی تھی۔ وہ بھاگتا چلا گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات ثبت تھے۔ سندری صرف اس کی وجہ سے خطرات میں گھر گئی تھی۔ لیکن وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

تھکا ہارا جب وہ گھر میں داخل ہوا۔ تب گھر والے اس کے منتظر تھے۔ ماں ناشتہ تیار کیے اس کی منتظر تھی۔ تمام گھر والوں نے عجلت میں ناشتہ کیا۔ اور سامان اٹھا کے بس اسٹینڈ پر چلے آئے۔ اس دن کے بعد راجو نے دوبارہ کبھی سندری کو نہیں دیکھا۔

☆......☆......☆

تیس سال کا عرصہ بیت گیا۔ اس تمام عرصے کے دوران راجو سندری کو بھلا نہیں پایا۔ شہر منتقل ہونے کے کچھ عرصے کے بعد راجو کی ملاقات گاؤں کے ایک لڑکے سے ہوئی۔ اس کی زبانی راجو کو معلوم ہوا کہ راجو کے فرار ہونے کے بعد سندری کے بھائیوں نے معصوم اور لاچار سندری کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ گاؤں میں یہ افواہ پھیلا دی گئی تھی کہ سندری بیمار ہونے کے سبب چند عرصہ بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گئی۔ لڑکے کے مزید کہنے کے مطابق اس نے خود سندری کی چتا پر خون کے دھبے پڑے ہوئے دیکھے تھے۔

راجو دل تھام کر رہ گیا۔ تمام کیے دھرے کا ذمہ دار وہی تھا۔ اس کی وجہ سے معصوم سندری زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ دل میں ایک کسک تھی۔ جو اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ سب کچھ اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن ماں اور بہنوں کے متعلق سوچنے کے بعد وہ ارادہ تبدیل کر دیتا تھا۔ اس کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ماں نے عجلت میں لڑکی کی تلاش کی۔ اور راجو کی شادی کر دی۔

لڑکی کا نام رجنی تھا۔ وہ سندری کی جوتی کے برابر بھی نہیں تھی۔ نہایت خود غرض منہ پھٹ اور تیز طرار عورت تھی۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد بھی اس نے اپنی روش کو تبدیل نہیں کیا۔ راجو نے بھی اپنے زخم خوردہ جسم کو حالات کے تند و تیز دھارے کے حوالے کر دیا۔

تیس سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ تب راجو ایک دفعہ پھر سب کچھ بیچ باچ کر گاؤں چلا آیا۔ ٹھاکر وفات پا چکا تھا۔ اس کے تینوں لڑکے شہر منتقل ہو گئے تھے۔ راجو نے ایک دفعہ پھر کھیتی باڑی کا آغاز کیا۔ لڑکے برے ماحول کی صحبت کو بھلا نہیں پائے۔ گاؤں میں بھی ان کی حرکتوں میں کمی واقع نہیں ہو سکی۔ وہ شراب پیتے اور لڑکیوں کو ڈورے پر لاتے۔ رجنی تمام دن گاؤں کی عورتوں کے سامنے اپنے پتی کی برائیاں کرتی۔ اور رات کو اسے برا بھلا کہنے کے بعد سو جاتی تھی۔

یہ راجو کی دردناک کہانی تھی۔ جس کے متعلق وہ اکثر سوچا کرتا تھا۔ آج کا دن بھی اس نے سوچ و بچار کے دوران گزار دیا۔ سورج مغرب کی جانب جھک رہا تھا۔ راجو نے قریب لگے ہوئے پمپ سے پانی باہر نکالا۔ منہ ہاتھ اچھی طرح دھوئے اور گھر چلا آیا۔ گھر میں رجنی کے علاوہ بچے موجود نہیں تھے۔ راجو نے دوپہر کا ٹھنڈا کھانا زہر مار کیا۔ اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرنے پر ایک دفعہ پھر اس کی نگاہوں کے سامنے سندری کا چہرہ گھومنے لگا۔ اس کے دل میں شدت کے ساتھ اس خواہش نے جنم لینا شروع کر دیا۔ کہ وہ ایک دفعہ پھر پچھلے وقتوں میں چلا جائے۔

جہاں سندری اور وہ دونوں اکیلے ہوں۔ ان کی سچی محبت ہو اور ہرا بھرا سرسبز گاؤں ہو۔ کیا ایسا ممکن ہو سکتا تھا۔ پچھلے دن جب وہ ڈیرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ تب ونو کہہ رہا تھا۔ گاؤں کا پرانا جوتشی بابا بھروسے بہت پہنچا ہوا انسان ہے اس کے ہاتھوں کے کمال دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ بدلے میں کچھ بھینٹ دینی ہوتی ہے۔ بھینٹ کی درخواست وہ خود کرتا ہے۔ راجو کو وہ وقت یاد آ گیا۔ جب اس نے سندری کو پانے کے لیے تین لڑکوں کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ وہ اب بھی بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار تھا۔ اگر اسے سندری دوبارہ مل جاتی۔

اس نے ساتھ والی چارپائی پر لیٹی ہوئی رجنی کی

جانب دیکھا اس کا بھدا وجود چارپائی پر بمشکل تمام پورا آرہا تھا۔ چہرے پر خون کی کمی کی بدولت سیاہ داغ نمودار ہوگئے تھے۔ اور بال کم ہونے کے بعد جگہ جگہ دے مزید جھڑنے چلے جارہے تھے۔ دونوں لڑکے ابھی تک ڈیرے سے واپس نہیں آئے تھے۔ وہ یقیناً وہاں شراب کے نشے میں دھت پڑے ہوں گے۔ واجو نے نفرت کے ساتھ چہرہ دوسری جانب پھیرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ صبح سویرے اس کی آنکھ کھلی۔ مزید دو چارپائیوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ اس کے دونوں لڑکے چارپائیوں پر بے سدھ لیٹے ہوئے تھے۔ رجی ناشتہ تیار کردی تھی۔ اس نے خاموشی کے ساتھ منہ ہاتھ دھویا۔ اور ناشتہ کرنے کے بعد کھیتوں پر چلا گیا۔

آدھے دن کے دوران اس نے باقی بچے ہوئے کھیتوں کو پانی دیا۔ اور پگڑی کو سنبھالتا ہوا دام بھروسے کے ٹھکانے کی جانب چل دیا۔ جسے لوگ بابا بھروسے کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس کا ٹھکانہ پہلے والے مقام پر ہی موجود تھا۔ کٹیا کی جگہ پکے کمروں نے لے لی تھی۔ پکے کمروں کے آگے برآمدہ بنا ہوا تھا۔ اور برآمدے کے آگے وسیع و عریض میدان موجود تھا۔ میدان لوگوں کے ہجوم سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ اپنی اپنی باری کے منتظر تھے۔

واجو ایک جانب درختوں کے سائے میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ لوگ کمرے میں جاتے۔ اپنا مسئلہ بیان کرتے پھر باہر نکل کر اپنے گھروں کی جانب چلے جاتے۔ گاؤں کے علاوہ شہروں سے بھی لوگ بابا بھروسے کی زیارت کرنے کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے۔

سورج مغرب کی جانب جھکنے لگا۔ اب رش کی شدت میں کمی واقع ہونے لگی۔ اندھیرا پھیلنے سے چند لمحات پہلے گنے چنے افراد نے بابا بھروسے کے پاس جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ وہ اندھیرا پھیلنے سے قبل اپنے گھروں کی جانب چلے جانا چاہتے تھے۔ اس لیے ملاقات کا ارادہ ملتوی کرنے کے بعد واپس گھروں کی جانب چلے گئے۔ اب میدان میں راجو کے علاوہ مزید کوئی باقی نہیں بچا۔ برآمدے میں بیٹھے ہوئے بابا بھروسے کے چیلے نے استفہامیہ نگاہوں سے واجو کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ارادہ ہے تمہارا......؟ واپس گاؤں جاؤ گے یا پھر بابا بھروسے کا دیدار کرو گے۔" واجو نے ڈوبتے ہوئے سورج کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے اندھیروں سے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔ بلکہ ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔" چیلے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے کے آگے موجود چک کو اوپر اٹھایا۔ اور اسے اندر جانے کا اشارہ کردیا۔

واجو نے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ کمرہ ہر قسم کے ساز وسامان سے خالی تھا۔ زمین پر چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اور دام بھروسے چٹائی پر براجمان تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ حلیے میں نمایاں فرق موجود تھا۔ بال چٹے سفید ہوگئے تھے۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ اور جسم کمزور اور لاغر تھا۔ واجو دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کمرے کے ایک جانب کھڑا ہوگیا۔ بابا بھروسے نے اپنی بند آنکھوں کو کھولا۔ اور راجو کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"کافی عرصے کے بعد تم سے ملاقات ہو رہی ہے۔ یقیناً کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہوگے۔ چٹائی پر بیٹھ جاؤ۔ اور آنے کا مقصد بیان کرو۔" واجو خاموشی کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ گیا۔

پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ہمکلام ہوا۔

"بھروسے بابا...... مجھے جوانی کے وہی دن درکار ہیں۔ جو آج سے کم وبیش تیس سال قبل تھے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے۔ میں آپ کے پاس منڈوی کو حاصل کرنے کے لیے آیا تھا۔ لیکن حاصل نہیں کرپایا۔ اب دوبارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا ہونا ممکن ہو۔" بابا بھروسے نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا۔ پھر طنزیہ لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہیں احساس ہے کہ تم کیا بول رہے ہو۔ تم نہ ممکن

پر رہتے ہوئے چاند کو پانے کی خواہش کررہے ہو۔ بہت بڑی آزمائش میں مبتلا ہونے والے ہو۔"

راجو بات درمیان میں کاٹتے ہوئے بولا۔ "میں ہر قسم کی آزمائش کے لیے تیار ہوں۔ سندری کو پانے کے لیے میں پاتال میں جانے کی حامی بھی بھر سکتا ہوں۔ آپ بات کرکے دیکھئے میں ہر قسم کی آزمائش پر پورا اتر کر بتاؤں گا۔"

بابا بھرو سے نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ وقت تیزی کے ساتھ گزرنے لگا۔ کمرے میں گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ راجو کے جسم میں بے چینی کے اثرات پیدا ہونے لگے۔ بابا بھرو سے مکمل طور پر خاموش ہوگیا تھا۔ اس کا ساکت جسم کسی مردے کی مانند بے جان دکھائی دیتا تھا۔ پھر اس نے جھٹکے کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔ اور گھمبیر لہجے میں بولا۔

"تمہارا کام ہوجائے گا۔ لیکن اس دفعہ وصولی سخت ہوگی۔" راجو کرخت لہجے میں بولا۔

"میں سب کچھ بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ بات کو گھمائیں نہیں۔ بلکہ صاف صاف بتا دیجئے۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بابا بھرو سے بولا۔

"مجھے تمہارے گھرانے کی بھینٹ چاہئے۔ ابھی اور اسی وقت...... میں جانتا ہوں۔ کہ تم ان سے مطمئن نہیں ہو۔ وہ تینوں آوارہ اور بدمعاش ہیں انہیں میرے ٹھکانے پہنچا دو۔ تمہارا کام ہوجائے گا۔"

کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد راجو بولا۔ "میں تیار ہوں اپنے آدمیوں کو میرے ہمراہ چلنے کے لیے کہو۔ وہ ان تینوں کو یہاں لاسکتے ہیں۔" بابا بھرو سے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کل کے دن سے تمہارے لمحات میں واپسی کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ میں ماضی میں جھانکنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ لیکن حیرت مجھے اس بات پر محسوس ہورہی ہے کہ تمہارے ماضی کا انت اندھیروں میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ حصے شیشے کی مانند صاف ہیں۔ لیکن آخر والا اماوس کی اندھیری رات کی مانند سیاہ ہے۔ تم ابھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ تبدیل ابھی کرسکتے ہو۔ کیونکہ اندھیرے حصے کا مطلب کچھ بھی نکل سکتا ہے۔"

راجو نے پوچھا۔ "آپ اس اندھیرے سے کیا نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں۔"

بابا بھرو سے بولا۔ "اندھیرے مستقبل کو تم روشنی سے تشبیہ نہیں دے سکتے ہو۔ اور اندھیرے مستقبل کو تم سنوار بھی نہیں کرسکتے ہو۔ اگر میرے مشورے کی بات کرتے ہو۔ تب پھر میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا۔ کہ تمہارا حال زیادہ بہتر ہے۔ ماضی کے بجائے تھوڑی سی محنت کرکے اسے مزید بہتر بنا سکتے ہو۔"

راجو نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اپنے حال سے مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے اس بات سے کوئی بھی سروکار نہیں کہ تمہیں میرا ماضی اندھیروں میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ حال کو سنوارنے سے بہتر یہ ہے کہ میں ماضی کو روشن کرنے کی کوشش کروں۔ تمہیں میری بیوی بچوں کی بھینٹ چاہئے۔ وہ میں دینے کو تیار ہوں۔"

بابا بھرو سے نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور اپنے چیلے کو آواز دی۔ وہ الہ دین کے جن کی مانند کمرے میں داخل ہوا۔ بابا بھرو سے نے اسے حکم دیا کہ وہ مزید دو چیلوں کو ساتھ لے کر راجو کے ہمراہ اس کے گاؤں جائے۔ اور تین وجودوں کو اٹھا کر ٹھکانے پہ لے آئے۔" چیلے نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور راجو کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

اس رات خلاف معمول راجو کو بہت گہری نیند آئی۔ ساتھ والی تینوں چارپائیاں خالی پڑی تھیں۔ نا تو تو میں میں کی آواز آرہی تھی۔ اور نہ خراٹوں کی بلکہ خاموشی طاری تھی۔ راجو نے آنکھیں بند کیں۔ تو اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ اتھاہ گہرائیوں میں گرتا چلا جارہا ہو۔ اس کا جسم دفعتاً ہلکا ہونے لگا۔ جسم پر موجود بوجھ غائب ہونے لگا۔ جسم میں بھرپور توانائیوں کا احساس ہونے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا۔ جیسے وہ دوبارہ

جوان ہونے لگا ہو۔ پھر جیسے وقت تھمنے لگا۔ سب کچھ اپنی جگہ رکنے لگا۔ اسے دور سے مرغ کی بانگ سنائی دی۔ اردگرد کی چارپائیوں پر مختلف وجودوں کا احساس ہوا۔ ان میں سے خراٹوں کی آواز نمایاں تھی۔ اسے یاد پڑتا تھا۔ کہ رات کو اس نے اپنی بیوی اور دونوں بچوں کے سروں پر موٹا ڈنڈا مار کر انہیں بے ہوش کیا تھا۔ پھر اپنے ہمراہ آنے والے تینوں چیلوں کے حوالے ان کو کر دیا تھا۔ پھر بھلا چارپائیوں پر کون موجود ہوسکتا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

ماحول یکلخت بدل گیا۔ اس کے ساتھ والی چارپائی پر اس کی ماں محو نیند تھی۔ اگلی دو چارپائیوں پر دونوں بچیاں سو رہی تھیں۔ اور اس سے اگلی چارپائی پر اس کا باپ خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے خوشی سے بھرپور انداز میں اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ وہ صحت مند نوجوان تھا۔ صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ اندھیرا ابھی مکمل طور پر چھٹا نہیں تھا۔

راجو نے گرم چادر کو جسم کے ساتھ لپیٹا اور جوتے پہن کر گھر سے باہر نکل آیا۔ گاؤں میں ہو کا عالم طاری تھا۔ اسٹیشن اس کے گاؤں سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر موجود تھا۔ وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ اسٹیشن کی جانب چل دیا۔ گاؤں سے باہر نکلنے کے بعد سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا۔ گاؤں کے کتوں نے بھونک بھونک کر اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن راجو نے ان کی پرواہ نہیں کی اور تیز قدموں سے چلتا رہا۔ جب اس نے اسٹیشن کی عمارت میں قدم رکھا۔ تب سورج پہاڑوں کے پیچھے سے طلوع ہونے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ مختصر پہاڑی اسٹیشن سنسان پڑا ہوا تھا۔ سویرے والی گاڑی پلیٹ فارم کے ساتھ کھڑی تھی۔

راجو نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ پلیٹ فارم پر لگے ہوئے اکلوتے بینچ پر سیاہ چادر میں ملبوس وہ براجمان تھی۔ اس کے پاؤں کے پاس ہی سیاہ رنگ کا چمڑے والا بیگ رکھا ہوا تھا۔ راجو نے قدم آگے بڑھانے شروع کیے۔ وہ دماغ میں آنے والے حالات سے نمٹنے کے لیے پلاننگ ترتیب دے رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ کو محسوس کرتے ہوئے سندری نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ سویرے والی گاڑی نے روانگی کی وسل دی۔ تب اچانک ہی راجو کی نگاہ سامنے موجود پہاڑ پر پڑی۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس تین آدمی چہروں کو سیاہ کپڑوں میں چھپائے اسٹیشن کی جانب اترتے دکھائی دیئے۔ پہلی نظر میں ہی راجو نے انہیں پہچان لیا۔ وہ سندری کے بھائی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں پکڑی ہوئی تھیں۔ اور خونخوار خطرناک تھے۔

راجو نے سندری کے ہاتھ کو تھاما۔ اور سویرے والی گاڑی کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔ رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ سندری اپنے ہاتھ میں سیاہ بیگ تھامے اس کے ہمراہ بھاگ رہی تھی۔ درمیان والا ڈبہ بالکل سامنے تھا۔ وہ اس پر چڑھ گئے۔

راجو نے ڈبے میں چڑھنے سے پہلے پیچھے نگاہ دوڑائی۔ وہ تینوں ہاتھوں میں رائفلیں لہراتے ہوئے اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔ راجو نے انہیں گاڑی کے آخری ڈبے میں چڑھتے ہوئے بخوبی دیکھا۔ گاڑی ہلکی رفتار کے ساتھ اسٹیشن سے باہر نکلتی چلی جارہی تھی۔ وہ دونوں چوہے دانی میں پھنس چکے تھے۔ چلتی ہوئی ٹرین سے فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔ اور سندری کے بھائی ان دونوں کو ڈبوں میں تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے آتے۔ زیادہ دیر ان تینوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہنا ممکن نہیں تھا۔

لیکن راجو اتنی آسانی کے ساتھ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی گاڑی پہاڑی علاقے میں داخل ہوگئی۔ یہاں جابجا سرسبز جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اکا دکا درخت بھی دکھائی دے جاتے تھے۔ گاڑی ہلکی رفتار میں آگے بڑھنے لگی۔ سندری پریشان نگاہوں کے ساتھ راجو کی جانب دیکھ رہی تھی۔ راجو نے اسے بازو کے پاس سے تھاما۔ اور کھینچتے ہوئے مخالف جانب والے دروازے کی جانب چلا آیا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے سندری کے ہاتھوں میں موجود بیگ کو اپنے

کاندھے کے ساتھ لٹکایا۔ اور سندری کو چلتی ہوئی گاڑی سے نیچے اترنے کے لیے کہا۔ سندری نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ راجو کی جانب دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں اور عجلت میں ٹرین سے نیچے کود گئی۔ نیچے پہاڑی پتھر موجود تھے۔ اس کا پاؤں پتھروں پر پڑا۔ اسے شدید درد کا احساس محسوس ہوا۔ اور وہ زمین پر جھکتی چلی گئی۔

راجو اس کے پیچھے تھا۔ اس نے سندری کو کاندھے کے پاس سے تھاما اور پاؤں پر کھڑے کرنے کی کوشش کی۔ سندری کے منہ سے بے اختیار کراہ نمودار ہوئی۔ راجو نے پریشان نگاہوں کے ساتھ سندری کی جانب دیکھا۔ اس کے پاؤں کا تلوا زخمی ہو گیا تھا۔ خون نکل کر پتھروں کو رنگین کر رہا تھا۔ راجو نے اپنی پگڑی کو سرے سے پھاڑا۔ اور پٹی کی صورت میں سندری کے پاؤں والے زخم پر باندھ دیا۔ خون نکلنا وقتی طور پر بند ہو گیا۔ ٹرین پہاڑی درے میں گھومتی ہوئی نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی۔

راجو نے اردگرد کے ماحول پر نگاہ دوڑائی۔ دونوں جانب سرسبز پہاڑ موجود تھے۔ اور دور اسٹیشن کی عمارت کا لوکوشیڈ دکھائی دے رہا تھا۔ راجو نے سندری کو سہارا دیا۔ اور لوکوشیڈ کی جانب چل دیا۔ سندری کو چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ لاچاری کے عالم میں زمین پر بیٹھ گئی۔ اور ہانپتے ہوئے بولی۔

”بس مجھ سے مزید نہیں چلا جاتا۔“ سورج نکل آیا تھا۔ اور گرمی بڑھنے لگی تھی۔ راجو نے اردگرد دیکھنے کے بعد اچانک ہی آگے بڑھ کر سندری کو گود میں اٹھا لیا۔ پتلی دبلی سندری کا وزن کچھ زیادہ نہیں تھا۔ سندری نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ راجو کی جانب دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

راجو نے دوبارہ لوکوشیڈ کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ سندری کے پاؤں سے نکلتا ہوا خون وقتی طور پر رکنے کے بعد دوبارہ رسنا شروع ہو گیا تھا۔ اور اب شاید اسے کمزوری بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنا سر راجو کے کاندھے پر رکھ دیا۔ اور آنکھیں موند لیں۔ آہستہ آہستہ اس کا جسم بھی ڈھیلا پڑنے لگا۔ اور اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی راجو نے پریشان نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا۔ لیکن تیزی کے ساتھ اٹھتے ہوئے قدموں کو روکا نہیں۔ لوکوشیڈ اب زیادہ دور نہیں تھے۔ سندری کے پاؤں سے بہتا ہوا خون قطروں کی صورت میں پتھروں پر گرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے سراغ کے لیے نشان چھوڑ رہی تھی۔

دوسری جانب سندری کے تینوں بھائیوں نے تمام ٹرین چھان ماری۔ لیکن راجو اور سندری کو ٹرین میں موجود نہیں پایا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دونوں چلتی ہوئی ٹرین سے نیچے کود گئے تھے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا۔ جب ٹرین کی رفتار کم ہو۔ اور ٹرین کی رفتار صرف اسٹیشن سے باہر نکلنے سے کچھ دیر بعد تک کم رہی تھی۔ ان تینوں نے زنجیر کو کھینچ کر ٹرین کو روکا۔ پھر پیدل واپس گاؤں والے اسٹیشن کی جانب چل دیئے صرف اتنی سی دیر میں ٹرین نے کافی سے زیادہ فاصلہ طے کر لیا تھا۔ انہیں واپس گاؤں والے اسٹیشن کے قریب پہنچنے میں تقریباً پونے گھنٹے سے کچھ زیادہ کا وقت لگ گیا۔

اسٹیشن کے قریب لائنوں کے پاس انہیں خون کے دھبے دکھائی دیئے۔ سفید کپڑوں کی کچھ دھجیاں بھی اردگرد موجود تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسی رنگ کی پگڑی راجو پہنتا ہے۔ ان کے چہرے غصے سے سرخ ہونے لگے۔ انہوں نے ہاتھوں میں موجود رائفل کے دستوں پر گرفت مضبوط کی۔ پھر اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ اسٹیشن کی عمارت کے قریب واقع لوکوشیڈ پر ان تینوں کی نگاہیں جا ٹھہریں۔

تھوڑی دیر ایک دوسرے کے ساتھ صلاح و مشورہ کرنے کے بعد تینوں لوکوشیڈ کی جانب چل دیئے۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد انہیں دوبارہ خون کے دھبے دکھائی دینے لگے۔ ان کے قدموں کی رفتار یکلخت تیز ہو گئی۔ ابھی وہ لوکوشیڈ سے کچھ دور تھے کہ انہوں نے سندری کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنی۔ وہ

مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ تینوں بھائی راجو اندر اور لوکو شیڈ کی جانب بھاگنے لگے۔

☆......☆......☆

راجو نے شیڈ کی عمارت کے قریب پہنچ کر سندری کے بے ہوش وجود کو شیڈ کی ٹھنڈی زمین پر زمین پر رکھ دیا۔ اور تشویش بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور وہ ہولے ہولے سانس لے رہی تھی۔ اس کی بے ہوشی کو ختم کرنے کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ پانی ارد گرد موجود نہیں تھا۔ شاید پہاڑوں کے دوسری جانب کوئی ندی یا آبشار موجود ہو۔ یہی سوچتے ہوئے راجو شیڈ سے باہر نکل کر پہاڑ کے اوپر کی جانب چل دیا۔ گرمی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

سورج آسمان پر آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ لیکن راجو کو اس کی رتی بھر پروا نہیں تھی۔ وہ تو صرف سندری کو ہوش و حواس میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اگر اسے کھولتے ہوئے لاوے سے بھری ہوئی سڑک پر بھی چلنا پڑتا تو وہ گریز نہیں کرتا۔ اس لیے وہ پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا۔ سرسبز پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے میں اسے بیس منٹ لگ گئے۔ دوسری جانب گھنا جنگل موجود تھا۔ اور وہاں پانی کو تلاش کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ گاؤں کا اسٹیشن لوکو شیڈ سے زیادہ دور نہیں تھا اور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہینڈ پمپ لگا ہوا اس نے بخوبی دیکھا تھا۔

وہ واپس لوکو شیڈ کی جانب چل دیا۔ شیڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اندر جھانکتے ہوئے سندری کے بے ہوش وجود کی جانب دیکھا۔ وہ کسمسا رہی تھی۔ راجو نے آگے بڑھ کر اس کے سر کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور چہرے کو تھپتھپانے لگا۔ سندری نے جھٹکے کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔ اور حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ راجو اس کے پچھلی جانب موجود تھا۔ اس لیے وہ اسے نہیں دیکھ پائی۔

”میں کہاں ہوں......؟“ وہ بڑبڑائی۔ پھر جھٹکے کے ساتھ زمین سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ راجو نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامنے کی کوشش کی۔ راجو کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر چلاتے ہوئے بولی۔

”مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ تم میرے بھائیوں کو نہیں جانتے۔ اگر انہیں پتا چل گیا تب تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔“ راجو نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”میں بھلا تمہیں یہاں کیوں لاؤں گا۔ تم اپنی مرضی سے میرے ہمراہ آئی ہو۔ کہیں تمہاری یادداشت تو نہیں کھو گئی۔“

سندری دوبارہ چلاتے ہوئے بولی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ پر الزام لگانے کی۔ میں کیوں تمہارے ہمراہ یہاں آنے لگی۔ مجھ سے دور رہو۔ ورنہ میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔“ اس نے اچانک ہی زمین سے پتھر اٹھا لیا۔ معاملہ راجو کے اختیار سے بھی باہر ہونے لگا تھا۔ وہ تو اسے پہچاننے سے بھی صاف انکاری ہو گئی تھی۔ اور پہچاننا تو دور کی بات وہ تو اس کے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کر رہی تھی۔

غصے میں آ کر راجو نے جھنجلائے ہوئے انداز میں آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ تب سندری نے ہاتھوں میں موجود پتھر کو پوری طاقت کے ساتھ اس کے سر پر دے مارا۔ راجو نے بچنے کی کوشش نہیں کی۔ پتھر بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح اس کے سر پر لگا۔ راجو کو تمام لوکو شیڈ کی عمارت گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ خون کی پچکی دھار نکل کر اس کے چہرے کو بھگونے لگی۔ تب اسے اچانک ہی رام بھروسے کی چند باتیں یاد آئیں۔

”اگر تعویذ کے اثرات کے دوران لڑکی کا خون بہہ نکلا۔ تب تمام چمتکار پر پانی پھر جائے گا۔ اس لیے کوشش کرنا۔ کہ تعویذ کے اثرات کے دوران اس کا خون نہ نکل پائے۔ شادی کے بعد اگر ایسا ہو بھی گیا۔ تب کچھ نہیں ہوگا۔ اس وقت وہ تمہیں اپنا چکی ہوگی۔“

راجو نے ہڑبڑا کر سندری کے پاؤں کی جانب دیکھا۔ خون نکلنا بند ہو چکا تھا۔ لیکن بہرحال اچھا خاصہ

بہہ چکا تھا۔ اور تعویذ کے اثرات کا لامحالہ خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس نے بوکھلائی ہوئی نگاہوں کے ساتھ سندری کی جانب دیکھتے ہوئے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

''سندری میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اور تم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اور کرتے ہیں۔ آج کی صبح ہم نے سویرے والی گاڑی سے بھاگنے کا ارادہ کیا تھا۔ ثبوت کے طور پر یہ سیاہ بیگ تمہارے سامنے موجود ہے۔ جس میں تمہاری ماں کے زیورات موجود ہیں۔ تم خود دیکھ سکتی ہو۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔'' سندری نے ایک جانب پڑے ہوئے سیاہ بیگ کی جانب دیکھا۔ پھر زہر خند لہجہ میں بولی۔

''تو تم مجھے اغوا کرنے کے علاوہ میری ماں کے زیورات بھی چرا کے ہمراہ لے آئے ہو۔ ٹھیک ہے۔ اب معاملہ اختیار سے باہر ہے۔ میں ابھی اپنے باپ اور بھائیوں کو بلا کر لاتی ہوں۔'' اس نے لوکوشیڈ کی عمارت سے باہر بھاگنے کی کوشش کی۔ راجو نے آگے بڑھ کر اس کے جسم کو دونوں ہاتھوں کے درمیان تھام لیا۔ سندری نے اس کی مضبوط گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ لیکن راجو کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ بے بس ہوکر سندری نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔

شیڈ کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ راجو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سندری کے تینوں بھائی ہاتھوں میں رائفلیں تھامے شیڈ میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے تیور خطرناک تھے۔ رائفلوں کا رخ راجو کی جانب تھا۔

سندری نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو راجو کی گرفت سے آزاد کیا۔ اور چیختے چلاتے ہوئے اپنے بھائیوں کے درمیان جا کھڑی ہوئی۔ وہ روتے ہوئے انہیں معاملے کی پیچیدگیوں کے متعلق آگاہ کر رہی تھی۔ اس کے بھائیوں کے چہرے غصے سے لال بھبوکا ہونے لگے۔ پھر انہوں نے سندری کے وجود کو ایک جانب کرتے ہوئے رائفلوں کا رخ راجو کے جسم کی جانب کیا۔ اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے فائر کھول دیا۔ تین گولیاں اسی راجو کے جسم کو چھیدتی ہوئی دوسری جانب نکل گئیں۔ وہ گولیوں کے دھکے کو برداشت نہیں کر پایا۔ اور اچھل کر پیٹھ کے بل لوکوشیڈ کے درمیان میں جا گرا۔

سندری کے بھائیوں نے رائفلوں کو ایک دفعہ پھر لوڈ کیا۔ اور تین گولیاں مزید راجو کے کانپتے ہوئے جسم میں اتار دیں۔ اس کا جسم یکلخت ساکت ہو گیا۔ تینوں بھائیوں نے اس کے بے سدھ جسم پر تھوکتے ہوئے ایک جانب موجود سیاہ بیگ کو اٹھایا۔ اور بہن کا ہاتھ تھامے ہوئے لوکوشیڈ سے باہر نکل گئے۔

راجو کے جسم میں تھوڑی بہت سانسیں ابھی موجود تھیں۔ اس کے بند ہوتے ہوئے دماغ میں بابا بھردے کے الفاظ گردش کرنے لگے۔

''میں ماضی میں جھانکنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ لیکن حیرت مجھے اس بات پر محسوس ہو رہی ہے۔ کہ تمہارے ماضی کا انت اندھیروں میں پڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ حصے شیشے کی مانند شفاف ہیں۔ لیکن آخر، اداس کی اندھیری رات کی مانند سیاہ ہے۔''

راجو کے چاروں جانب اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے آنکھوں کو بھینچتے ہوئے حواسوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چھ گولیوں کی موجودگی میں اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ گذشتہ لمحات کے دوران وہ گاؤں کے اسٹیشن سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ اور سندری کے نصیب میں اداس کا اندھیرا لکھا گیا تھا۔ اور موجودہ حالات میں سندری بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ لیکن اسے اندھیروں کو قبول کرنا پڑا۔ شاید ان دونوں کے نصیب میں یکجا ہونا لکھا ہی نہیں تھا۔ دونوں صورتوں میں جدائی لکھدی گئی تھی۔

راجو کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں۔ سوچیں ختم ہونے لگیں۔ پھر چاروں طرف اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔ اور اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

عجیب الخلقت

مدثر بخاری۔شہر سلطان

جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا ایک حقیقی وجود جو کہ دنیا میں آتے ہی قریب کے لوگوں کو گھورنے لگا، اور پھر یہی نہیں بلکہ اس کے بند لب کھلے اور کرخت آواز اس کے منہ سے نکلی اور پھر.....

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی ایک دلخراش تحریر

میری بیوی کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ وہ اچانک رات کو درد سے بلبلا اٹھی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ پیٹ میں اٹھنے والا درد انتہائی شدید تھا۔ یہ شادی سے پانچ ماہ بعد کا واقعہ تھا۔ ان دنوں میری بیوی ماں بننے والی تھی۔ خصوصاً میں اس کی طبیعت کا خیال رکھتا۔ ماہانہ چیک اپ اور پرہیز کے ساتھ ان تمام اصولوں پر مکمل عملدرآمد کرانا میرا اخلاقی فرض تھا۔

یہ بات اس حوالے سے بھی اہمیت کے حامل تھی کہ میرے دو بھائیوں کی آٹھ دس سال شادی کے گزرنے کے بعد بھی کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ خاندان کو وارث کی ضرورت تھی اس حوالے سے میرے والدین نے خوب دعائیں اور منتیں مانی تھیں، یہ سب کی محبت تھی یا خواہش کہ میرے گھر کی اولاد ضرور ہو۔

دعاؤں کے طفیل خدا نے صوفیہ کو امید سے کر دیا تھا۔

اس رات سے پہلے صوفیہ کو اچانک درد پہلے کبھی نہ اٹھا تھا، وہ چیخ رہی تھی کہ فوراً کوئی اپائے نہ ہوا تو شاید وہ مر جائے گی، اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے میں 15 منٹ لگے۔

رات گیارہ کا عمل رہا ہوگا لیڈی ریڈنگ ہاسپتال میں نائٹ ڈیوٹی پر ڈاکٹرز موجود تھے میں بڑی مشکل سے صوفیہ کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ غضب خدا کا کہ رات کے وقت کوئی اسٹریچر یا وہیل چیئر موجود نہ تھی۔ مجبوراً میں نے صوفیہ کو بانہوں میں اٹھا لیا تھا، صوفیہ بے ہوش ہو چکی تھی انتہائی ایمرجنسی میں ڈاکٹر کو بلایا گیا۔

ڈاکٹر سب سے پہلے صوفیہ کو ہوش میں لایا۔ صوفیہ کی حالت ابتر تھی وہ نیم پاگلوں کی طرح مجھے گھور رہی تھی ڈاکٹر نے اسے سب سے پہلے Pain Killer انجکشن لگایا۔ جب اس کی حالت درست ہونے لگی تو اس کا الٹرا ساؤنڈ کیا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد رپورٹ سامنے تھی۔

صوفیہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

میں نے اسے سہارا دیا، درد میں کچھ افاقہ ہوا تھا۔

ہم ڈاکٹر کے روم میں موجود تھے۔ رپورٹ ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھی ڈاکٹر کے چہرے پر حیرت و خوف کے آثار تھے۔ کافی دیر تک رپورٹس پڑھتا رہا پھر مخاطب ہوا۔

"آپ میرے ساتھ لیب میں آ جائیں۔"

"میں صوفیہ کو تسلی دیتا ہوا لیب میں داخل ہو گیا۔"

ڈاکٹر نے کمپیوٹر کے ساتھ منسلک الٹرا ساؤنڈ مشین آن کی۔ پھر مشین آف کر کے کمپیوٹر کو آن رہنے دیا۔

"یہ آپ کی بیوی کی ریڈیو رپوٹ ہے جو ہم نے ان کی چیک اپ کے دوران ریکارڈ کر لی ہے۔"

ڈاکٹر نے ریڈیو چلائی۔ پہلے تو کچھ سمجھ نہ آیا پھر کچھ کچھ سمجھ آنے لگی۔ وہ کچھ عجیب سا تھا جو نہ تو ڈاکٹر کو سمجھ آیا اور نہ مجھے...... وہ جو بھی تھا انتہائی ڈراؤنا اور خطرناک شکل کا تھا۔

☆......☆......☆

اس دوران صوفیہ کا رویہ کافی حد تک جارحانہ ہو گیا تھا، بات بات پر چڑ جاتی۔ کبھی غصہ نہ کرنے والی صوفیہ برتن تک توڑنے لگی اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑ گئے تھے۔ پھر کچھ عجیب و غریب واقعات شروع ہو گئے جس نے مجھے خوف زدہ کر رکھا تھا، صوفیہ کی ذہنی حالت دن بدن گرتی جا رہی تھی، وہ راتوں کو اکثر بستر سے غائب نظر آتی۔

اس رات حیرت انگیز طور پر صوفیہ رات کو بستر سے گم ہو گئی تھی، میں روم سے باہر نکلا صحن میں کسی کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھی وہ صوفیہ کی ہنسی تھی۔ صحن میں لیموں اور امرود کے درخت لگے تھے، میں نے ٹارچ لی اور صحن میں موجود امرود کے درخت کے پاس آ گیا۔

صوفیہ بال کھولے اکڑوں بیٹھی تھی وہ وقفے وقفے سے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی زور زور سے ہنسنے لگتی۔ اس کی آنکھیں جیسے سرخ انگارہ ہو چکی تھیں یہ خطرناک حالت تھی۔

میں نے جلدی سے صوفیہ کو پکڑ لیا۔ اور جھنجھوڑنے لگا۔

"صوفیہ...... کیا ہو گیا ہے تمہیں...... کیا کر رہی ہو یہاں۔" میں اس سے مخاطب ہوا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ میرے قریب مت آؤ۔" وہ نفرت سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔ سخت پریشانی میں مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا دماغ ماؤف تھا مجھ سے یہ حالت دیکھی نہ جا رہی تھی۔

میں نے اپنی بڑی بھابھی کو فون کیا، ان کا گھر پندرہ منٹ کی مسافت پر تھا تیسری کال پر بھابھی نے فون اٹینڈ کیا۔

"ہیلو...... بھابھی میری بات غور سے سنیے۔"

صوفیہ کی طبیعت خراب ہوگئی ہے آپ بھیا کو لے کر فوراً آجائیں۔"

"ارے...... زیادہ پریشانی کی تو بات نہیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں بھابھی...... آپ فوراً گھر آجائیں۔" میں نے کہا۔

☆......☆......☆

امی کی وفات میری شادی کے دو ماہ بعد ہوئی تھی شادی کے بعد ہم سب لوگ الگ الگ گھروں میں شفٹ ہوگئے تھے۔ لیکن مجھے محسوس ہورہا تھا کہ صوفیہ کی اس حالت میں اکیلا رہنا رسک تھا۔ اسے گھر میں کسی عورت کی ضرورت تھی آفس سے میری واپسی شام تک ہوتی تھی، شام تک گھر کا نظام درہم برہم ہوچکا تھا، صوفیہ نیم پاگل ہوگئی تھی۔

بھائی فیاض سے مشورہ کرکے میں صوفیہ کو ماہر نفسیات کے پاس لے گیا۔

اس دن صوفیہ کی حالت نارمل تھی وہ نارمل انداز میں گفتگو کررہی تھی۔

صوفیہ نے ڈاکٹر سے نارمل انداز میں گفتگو کی۔ ڈاکٹر نے اسے پریگننسی کے دوران آنے والے مسائل قرار دیا۔ یہ ڈاکٹر کی نظر میں عام سا کیس تھا مگر میں نے صوفیہ کی الٹرا ساؤنڈ رپورٹ اور ویڈیو کا بتایا تو معاملہ اس کی سمجھ سے باہر نظر آیا۔

اس دوران میں نے ایک عدد آیا کی خدمات لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے اخبار میں اشتہار دے دیا تھا۔

ایک لڑکی میرے آفس آئی۔ ایف اے پاس تھی۔ جاب کی ضرورت بھی تھی میں نے اسے صوفیہ کے پاس بھیج دیا۔ ایک دن کے بعد ہم نے اسے مستقل طور پر جاب آفر کردی جسے اس نے قبول کرلیا۔

بچے کی آمد دو ماہ کے بعد تھی صوفیہ کچھ نارمل ہوگئی تھی۔ وہ روٹین میں صبح اٹھتی تب تک لڑکی ثانیہ گھر آجاتی۔ اس کا گھر بھی ہمارے محلے میں تھا وہ ناشتہ تیار کرتی میں آفس چلا جاتا، ثانیہ پورے گھر کو سنبھالنے لگی تھی۔

ایک دوپہر مجھے ثانیہ نے گھر سے کال کی۔

"ہیلو صاحب جی......! صوفیہ میڈم بے ہوش ہوگئی ہیں۔ آپ جلدی گھر آجائیں......"

میں نے ساری بزنس میٹنگز ملتوی کی اور گھر آگیا۔

صوفیہ بیڈ پر ڈھیر تھی، ثانیہ پریشان صورت کھڑی تھی۔ میں نے ڈاکٹر کو آفس سے نکلتے ہی فون کردیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر آگیا۔

چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔

صوفیہ کو ہوش آگیا تھا مگر اس نے اپنا پیٹ پکڑا ہوا تھا، میں اور ثانیہ اسے اسپتال لے گئے۔

اس رات صوفیہ نے ایک بچے کو جنم دیا...... ہم سب حیران تھے وہ عجیب و غریب بچہ تھا کالا سیاہ چہرہ بالوں کا گھونسلہ سر پر جما ہوا تھا۔ اوپر والا دھڑ لمبا اور نچلا دھڑ نہ ہونے کے برابر...... اس کے چہرے پر کالے سیاہ بال خاصے بھدے تھے اس کی آنکھیں بہت بڑی تھیں مزید حیران کن یہ کہ وہ مسکرا رہا تھا اور دو گھنٹے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

اگلے چار گھنٹے میں وہ انسانی آواز میں بولنے لگا تھا۔

وہ ہنس رہا تھا۔ اس کی ہنسی میں خوف ناک لرزش تھی۔ ڈاکٹر نے ہمیں فوراً ڈسچارج کردیا اور ہم گھر آگئے۔ وہ دن بدن بڑا ہوتا جارہا تھا وہ انتہائی مکروہ صورت بچہ تھا وہ جب بولتا تو خوف محسوس ہوتا صوفیہ کو خاصا ڈر لگتا تھا البتہ ثانیہ نے خوب سہارا دیا ہوا تھا ثانیہ ایک بہادر لڑکی تھی۔ اس مکروہ صورت بچے کی ساری ذمہ داری ثانیہ کے اوپر تھی وہ اسے کھانا دیتی۔ مگر وہ کھانا نہیں کھاتا تھا سارا دن وہ اپنے کمرے میں پڑا رہتا یہ کمرہ بھی اس نے خود چنا تھا صوفیہ نے اس معاملے میں ابھی تک ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا۔ ڈلیوری کو پندرہ دن گزر گئے تھے مگر وہ اس انتہائی اہم

معاملے پر خاموش بھی۔ یہ بچہ بے شک ہمارا تھا مگر نارمل نہ تھا، پیدائش کے بعد چلنا اور پھر بولنا شروع کردینا ہماری سمجھ سے باہر تھا جبکہ اس صورت حال سے ہم خوف زدہ ہی نہیں بلکہ دہشت زدہ بھی تھے۔

☆......☆......☆

اس بچے کی پیدائش کے بعد ایک بہتری ضرور آئی تھی کہ صوفیہ کی طبیعت بالکل نارمل ہوگئی تھی، اب بہترین صورتحال تھی میرے لئے بھی اور صوفیہ کے لئے بھی۔ البتہ یہ بچہ اپنی تمام تر خوف ناکیوں کے ساتھ ہمارے گھر میں گھومتا رہتا تھا، صوفیہ سے اس معاملے پر بات چیت نہ ہوسکی۔ صوفیہ کچھ چھپا رہی تھی۔ کچھ ایسا تھا کہ صوفیہ مجھ سے آنکھیں چرا رہی تھی کچھ ضرور تھا جس کی پردہ داری تھی۔

ایک شام میں آفس سے واپس آرہا تھا، اس روز ٹرانسپورٹ کی ہڑتال تھی۔ البتہ میرے پاس کار تھی میں مال روڈ سے گزر رہا تھا کہ فٹ پاتھ پر موجود ایک بزرگ آدمی نے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بھی بلا سوچے سمجھے گاڑی روک دی۔

بزرگ میری طرف آئے۔

"السلام علیکم بیٹا۔"

"وعلیکم السلام بزرگوار۔" میں نے جواب دیا۔

"بیٹا...... میرے بچے کی طبیعت خراب ہے، آج گاڑیاں بند ہیں مجھے کلمہ چوک تک جانا ہے۔ احسان ہوگا اگر لے چلیں گے۔" ان کی آواز میں التجا تھی مجھے اپنے ابو یاد آگئے وہ ایسے ہی تھے۔ سادہ اور ملنسار......!

"ضرور باباجی۔" میں باہر نکل آیا گھوم کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور باباجی کو بیٹھنے کا کہا۔

انہوں نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیوں تکلیف کرتے ہوئے بیٹا...... میں خود کھول کر بیٹھ جاتا۔"

"اس میں میری خوشی ہے۔ تشریف رکھیں۔"

"شکریہ بیٹا۔" دروازہ بند کرکے میں ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔

"آپ کے بیٹے کو کیا ہوا ہے باباجی۔؟" میں نے پوچھا۔

"اسے شوگر ہوگیا ہے بیٹا۔ 20 سال کا ہے، خاندانی مرض نے میرے بچے کو بھی نہیں چھوڑا، ہم دو افراد ہیں گھر میں ابھی اس کا فون آیا کہ اسے زیادہ تکلیف ہورہی ہے۔"

"اوہ...... یہ خطرناک مرض ہر عمر کے لوگوں کو اپنے شکنجے میں لے رہا ہے اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں اللہ صحت یاب کرے گا۔" میں نے کہا۔

"شہر کے اچھے ڈاکٹر کو ہی چیک اپ کرایا ہے۔ اللہ اسے صحت دے۔" انہوں نے کہا۔

"بیٹا یاد رکھنا۔ خدا ہی اس کائنات کے تمام رازوں کو جانتا ہے مجھے تم سے ملنا تھا مگر آج مناسب نہیں کل میرے گھر آجانا جو مسئلہ ہوگا سامنے آجائے گا۔" انہوں نے کہا تو میں اچنبھے میں پڑ گیا کہ آخر انہیں میرے بارے میں معلوم کیسے ہوا۔

کلمہ چوک آگیا تھا باباجی نے گاڑی سے اترتے ہوئے مجھے کہا۔

"میں آپ کو کچی آبادی میں ملوں گا امام مسجد رحیم علی ...... کل شام میرے غریب خانے پر آجانا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرے دماغ میں جھماکہ ہوا میرا اپنا بچہ میرے لئے درد سر بنا ہوا تھا وہ کون تھا؟ کیا تھا؟ یہ سوالات میرے ذہن میں تھے۔

باباجی نے اگلے روز آنے کا کہا تھا یہ اچھا موقع تھا کہ میں روحانی طاقتوں سے فائدہ اٹھاؤں میں نے امام مسجد رحیم علی کی مدد کی تھی بدلے میں وہ بھی کچھ دینا چاہتے تھے شہر میں جعلی پیروں کا سلسلہ لگا ہوا تھا جگہ جگہ باباؤں کے آستانے لگے ہوئے تھے مگر اصل کون تھا؟ کون تھا اصل روحانی طاقتوں کا مالک اس کے لئے مخصوص آنکھ کی ضرورت تھی جو ہم جیسے لوگوں کے لئے ناممکن تھا مگر جس طرح امام مسجد رحیم علی نے مجھے دعوت

وی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس راز سے واقف ہیں۔

☆......☆......☆

گھر کا ٹی وی فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا آج اس پر میرے بچے نے پروگرام دیکھا تھا ثانیہ نے اسے ٹی وی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی مگر انجام یہ ہوا تھا کہ ٹی وی نجانے کیسے زمین پر آ گرا اور ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔

میں شام میں واپس آتا اور ثانیہ سے سارے دن کی رپورٹ لیتا تھا۔ آج ثانیہ خوف زدہ تھی چہرے پر اڑتی ہوائیاں بتا رہی تھیں کہ کچھ غیر معمولی ہوا ہے۔

"سر...... آپ کا بیٹا خطرناک قسم کے جمپ لگاتا ہے، آج دوپہر اس نے دوسری منزل سے جمپ لگایا تھا اور پھر نیچے کھڑا مسکرا رہا تھا میرا دماغ گھوم گیا ہے سر...... اس کی خوراک کچھ نہیں مگر اس کا اوپر والا دھڑ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔" وہ بولی۔

"تم پریشان نہ ہو اس کا کچھ سوچتے ہیں ہم اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تم اسے پیار سے سمجھا کر اس کا خیال رکھا کرو۔ اور ہاں اس کا ذکر پلیز کسی سے نہ کرنا تمہیں اس راز کے الگ سے پیسے ملا کریں گے۔"

"نہیں سر جی...... جن کا نمک کھایا جاتا ہے ان کے دکھ سکھ میں ساتھی ہونا چاہئے۔" وہ بولی۔

اس کے جواب سے مجھے اطمینان حاصل ہوا۔ ثانیہ اپنے جاب سے مطمئن تھی اور خاصی مخلص بھی اس سے کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔ اگلی شام کا انتظار صبح سے ہی شروع ہو گیا۔ کیونکہ شام کو مجھے امام مسجد رحیم علی سے ملنا تھا۔

سورج اپنی آخری سانسوں پر تھا جب میں بستی آبادی میں داخل ہوا امام صاحب نے مکمل پتہ سمجھا دیا تھا۔ یہ کم آمدنی والے متوسط طبقے سے نیچے کی زندگی گزارنے والے مکینوں کا علاقہ تھا میری گاڑی کو دیکھ کر لوگ مرعوب ہو رہے تھے میں نے ایک چوک میں گاڑی روکی اور ایک لڑکے کو بلایا جو میرے قریب سے گزر رہا تھا۔

"سلام صاحب جی۔" وہ میرے قریب آ کر بولا۔

"وعلیکم السلام...... بیٹا...... مجھے امام مسجد رحیم علی کے گھر جانا ہے۔ جانتے ہو کس طرف جانا چاہئے مجھے۔"

"جی ضرور...... وہ میرے چچا ہیں آپ گاڑی ادھر پارک کر لیں۔ گھر ساتھ ہی ہے۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے......" میں نے ایک اوپن جگہ گاڑی پارک کی اور باہر نکل کر اس لڑکے کی رہنمائی میں ایک سادہ سے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔

مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تھا فلاح کا اعلان ہو رہا تھا دعوت فلاح دی جا رہی تھی میرا دل شدت سے اذان کے الفاظوں پر رونے لگا تھا ایک مدت ہو گئی تھی مسجد کی طرف جانا نصیب نہ ہوا تھا۔

اذان مکمل ہو گئی تھی امام صاحب قریبی مسجد میں تھے میرا دل مسجد کی طرف جانے کا کر رہا تھا خود بخود قدم اٹھ رہے تھے۔ لڑکا مجھے مسجد میں لے گیا۔ میں نے جوتے موزے اتارے وضو کر کے امام صاحب کے پیچھے نماز ادا کی۔

نماز ادا کرنے کے بعد ایک روحانی سکون نصیب ہوا نماز کے بعد ہم امام صاحب کی بیٹھک میں آ گئے یہاں چارپائیاں موجود تھیں میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا امام صاحب نے تکلف سے کام لیا اور ٹھنڈی بوتل منگوائی...... پھر وہی سلام دعا کے بعد اصل موضوع کی بات شروع ہوئی۔

"بیٹا...... خدا نے آپ کو ایک امتحان میں ڈالا ہے میں جانتا ہوں کہ آپ کے گھر جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ انسانی خمیر سے نہیں ہے۔ میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔ فیصلہ آپ خود کر لو۔"

"میں سمجھا نہیں امام صاحب۔ انسانی خمیر سے مراد؟"

"یہ ساری کنفیوژن ہے امید ہے آپ سب کچھ ملاحظہ کرنے کے بعد صحیح اور مناسب فیصلہ کرو گے۔"

"میں آپ سے ضرور مشورہ لینا چاہوں گا۔"

ٹھیک ہے۔ آپ بسم اللہ پڑھ کر آنکھیں بند کریں اور جیسا میں کہوں اس کو اپنے دماغ میں لائیں۔“ امام صاحب بولے۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے دماغ کو امام صاحب کی آواز پر جمالیا۔

”تم ایک ویران جنگل میں ہو، جنگل میں سب کچھ خشک خزاں نما ہے پھر اچانک ہوا چلنے لگی ہے۔ تم محسوس کرو کہ وہ ٹھنڈی ہوا تمہارے بال اڑا رہی ہے تم صوفیہ کو پکار رہے ہو۔ پھر ایک اور نام لو عالیان ......عالیان...... پھر تم صوفیہ اور عالیان کو جنگل سے اکٹھے آتے دیکھو گے۔“

مجھے حقیقت میں محسوس ہوا جیسے میں واقعی کسی جنگل میں ہوں ہر طرف خشک قطعہ نما خزاں نما ماحول ہے پھر واقعی جیسے ٹھنڈی ہوا نے میرے بالوں کو اڑانا شروع کر دیا تھا پھر میں صوفیہ اور عالیان کو پکارنے لگا مجھے کچھ دیر بعد دونوں ایک طرف سے آتے نظر آئے۔

”اب آنکھیں کھول دو۔“ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

”بیٹا...... تم ایک اچھے معمول ہو۔ بہت جلدی حالات پر گرفت حاصل کر لیتے ہو۔ یہ ٹیلی پیتھی کا عمل ہے لیکن اب تم روحانی عمل سے پیچھے تمام واقعات ملاحظہ کرو گے اور آنے والے بھی۔“

☆......☆......☆

صوفیہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھنے والی میچور لڑکی تھی وہ ایم اے فائنل سمسٹر کا دورانیہ تھا جب یونیورسٹی میں اس کی ملاقات عالیان نیازی سے ہوئی تھی عالیان بھی ایک امیر گھرانے سے تھا مگر کافی حد تک سلجھا ہوا اس کا ایم اے انٹرنیشنل ریلیشنز شپ کی آخری سمسٹر تھا دونوں کی ملاقات الوداعی تقریب کے دوران ہوئی ۔صوفیہ کے تعلیمی کیریئر میں اس کے قریب بہت سے لڑکے آئے مگر صوفیہ کے معیار پر کوئی پورا نہ اترا نتیجتاً دوستی ختم ہوجاتی مگر عالیان ایک منفرد خصوصیت کا حامل نوجوان تھا۔

وہ اپنی گاڑی کا بونٹ کھولے سڑک کنارے پریشان کھڑی تھی جب عالیان وہاں سے گزرا عالیان دیکھ چکا تھا کہ صوفیہ کی گاڑی خراب ہوگئی ہے اس نے ریورس گیئر لگایا اور سر باہر نکال کر پوچھا۔

”اینی پرابلم۔“

صوفیہ نے دیکھا۔ عالیان خلوص نیت سے اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ قریب چلی آئی۔ ”مجھے گھر تک ڈراپ کر دیں گاڑی میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہے۔ ملازم آکر ورکشاپ لے جائے گا۔“

”ضرور...... آجائیں۔“ عالیان بولا۔

صوفیہ کو عالیان پہلے سے پسند تھا۔ اس نے کافی دفعہ یونیورسٹی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں صوفیہ کا ساتھ دیا تھا۔ عالیان مکمل وجاہت کا نمونہ تھا لڑکیاں اس کی طرف دوستی کے لئے بھاگتی تھیں مگر مجال ہے جو عالیان پر کسی لڑکی کے ڈائیلاگز کا ذرا سا بھی اثر ہوتا۔ اتفاق تھا کہ صوفیہ اور عالیان کا مزاج ایک جیسا تھا دو تین ملاقاتوں میں صوفیہ اور عالیان قریب آگئے۔

پہلے مہینہ، پھر ہفتہ اور پھر ہر شام ملاقات ہوجاتی۔ صوفیہ نے عالیان کے متعلق اپنے گھر میں سب کچھ بتا دیا تھا اور پھر کچھ عرصہ بعد دونوں کی ایک تقریب میں منگنی ہوگئی۔ دونوں کی محبت عروج پر پہنچ گئی۔

کاشف ایک نوجوان تھا وہ بھی صوفیہ سے محبت کرتا تھا، نہ صرف یونیورسٹی سے بلکہ کالج لائف کے دوران ہی کاشف نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ آوارہ بدمزاج اور عیاش طبیعت کاشف نے صوفیہ کو اس کی منگنی کے بعد دھمکی دی تھی کہ وہ کاشف سے کورٹ میرج کرلے یا پورے خاندان کے سامنے منگنی توڑ کر اس سے منگنی کرلے مگر صوفیہ نے یہ بات اپنے ابو کے علم میں لاکر کاشف کو فون کر کے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ باز نہ آیا۔

ادھر میں نے عالیان اور صوفیہ کی کہانی پہلی قسط بذریعہ خواب دیکھی تھی یہ تمام واقعات مجھے ایسا لگا جیسے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں مگر یہ صرف خواب تھا میں نے بابا رحیم علی کو تمام واقعات سنائے اگلے تمام

واقعات بذریعہ خواب میرے علم میں آئے...... آگے کے واقعات لکھنے سے پہلے اس مکروہ بچے کا کردار بتانا چاہوں گا۔

دو رات میں غائب ہوجاتا تھا، نہ کچھ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔ سارا دن کمرے میں دبکا رہتا اور رات ہوتے ہی باہر نکل جاتا۔

اس رات وہ خود نہ آیا مگر اس کی لاش ضرور گھر آئی ساتھ ہی مجھے انسپکٹر خاور کی کال آئی۔

"آپ پلیز! فوراً تھانے آجائیں۔"

"خیریت تو ہے ناں...... انسپکٹر صاحب!"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے بس آپ آجائیں۔"

میں تھانے پہنچا مجھے ایک شخص کی تازہ لاش دکھائی گئی تھی وہ نوجوان آدمی تھا۔

مجھے شناخت نہ ہوئی مگر انسپکٹر صوفیہ اور عالیان کی اسٹوری سے واقف تھا کیونکہ خاور بھی انہی کے گروپ کا تھا، ان تمام لوگوں نے اکٹھے ہی جامعہ سے ڈگری حاصل کی تھی۔ اور وہ لاش بھی کاشف کی ہی تھی۔

☆......☆......☆

اس شام عالیان اور صوفیہ کھانے کی میز پر موجود تھے جب کاشف اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آدھمکا۔ اس کے ساتھ چار غنڈے نما آدمی تھے ہال میں داخل ہونے کے بعد کاشف اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی میز پر آیا اس کا انداز خاصا جارحانہ تھا صوفیہ گھبرا گئی تھی کاشف نے میز سے بوتل اٹھائی اور میز کے کنارے پر زور سے دے ماری تو بوتل ٹوٹ گئی...

"مسٹر عالیان...... یہ بوتل تمہارے سر پر بھی لگ سکتی تھی سیدھی طرح اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ تمہارا انجام دردناک ہوگا۔" اس کے انداز میں دھمکی تھی۔

"اپنی حرکتوں سے باز تم آجاؤ مسٹر کاشف...... تم سرعام غنڈہ گردی کرکے ہمیں دھمکا رہے ہو۔" عالیان نے بھی اسی انداز سے جواب دیا۔

کاشف غضب ناک ہوکر صوفیہ کو دیکھنے لگا۔

کاشف نے جیب سے پستول نکالا اور صوفیہ کے سامنے عالیان کے سینے پر گولیاں ماردیں۔

عالیان مرچکا تھا مگر کاشف سرگرم دندناتا پھر رہا تھا اس کے خلاف ایف آئی آر کٹ چکی تھی معاملات کاشف کے خلاف تھے کورٹ کے آرڈر کے بعد کاشف کورٹ میں پیش ہوا مقدمہ چلا۔

فیصلہ صوفیہ کے حق میں ہوا بعدازاں کاشف جیل سے فرار ہوگیا تھا۔ پولیس نے ہر جگہ ڈھونڈا مگر کاشف کہیں نہ ملا۔

اور اب کاشف کی لاش میرے سامنے تھی۔ اس شام اس مکروہ صورت بچے کی بھی موت ہوگئی تھی۔ انسپکٹر خاور سے اس سارے معاملے پر میں بات کرتا رہا تھا۔

مخبری شاہدین کے مطابق کاشف پچھلے کئی برسوں سے جنگل میں مقیم تھا اس کا ایک مکمل نیٹ ورک بنا ہوا تھا جو سارے علاقوں میں چوری ڈکیتی کی وارداتوں میں ملوث تھا قتل کے جرم میں پکڑے جانے والے کاشف نے جیل کے بعد ایک بہت بڑا گینگ بنالیا تھا جس کا کام چوری اور ڈکیتیوں جیسی وارداتوں کو انجام دینا تھا۔

ایک آدمی بھی پکڑا گیا تھا جو کاشف کا خاص آدمی تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ کاشف کی موت کی وجہ ایک مکروہ شکل والا خطرناک بچہ تھا۔ جو نجانے کس طرح جنگل میں موجود ہیڈکوارٹر میں داخل ہوگیا۔ اس خطرناک بچے نے کاشف کی گردن پر کاٹ لیا تھا خون نکلا۔ مگر کاشف نے پرواہ نہ کی وہ سمجھا کہ یہ عام سا گھاؤ ہے مگر پھر وہ اچانک زمین پر گرا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ جیسے اس کی جان نکلی جارہی ہو بچہ غائب ہوگیا تھا ہم نے بچے کو ہر جگہ ڈھونڈا مگر بچہ غائب تھا ادھر کاشف زندگی کی بازی ہار چکا تھا اسی لمحے پولیس نے چھاپہ مارا ہمارے بہت سے ساتھی بھاگ گئے۔"

انسپکٹر خاور نے بتایا کہ "مجھے اچانک ایک کال موصول ہوئی تھی ایک خوف ناک آواز نے اطلاع دی کہ جنگل میں ایک بہت بڑا گروہ اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔" ہم نے چھاپہ مارا ایک آدمی اور یہ لاش

کی اس لاش کو جانتا ہوں یہ کاشف منفرد دکھائی دیتا تھا جیل سے......

البتہ ایک حیران کن چیز سامنے آئی کہ کاشف کی موت گھاؤ سے ہوئی ایک بچے نے اسکی گردن پر کاٹ لیا تھا۔ رپورٹ میں یہ ثابت ہوا ہے کہ اس بچے کے دانتوں میں زہر تھا جس کی وجہ سے موت واقع ہوئی۔

واپسی پر مین روڈ پر ایک مکروہ صورت لاش نظر آئی۔ وہ ایک بچہ تھا گینگ کے آدمی نے تصدیق کی کہ یہی وہ بچہ ہے جس نے کاشف کو قتل کیا اس کے گلے میں ایک فون نمبر اور ایڈریس کارڈ تھا ایڈریس اور فون نمبر آپ کا تھا جناب! ہم نے لاش کو آپ کے گھر بھیج دیا۔"

☆......☆......☆

معاملہ ابھی تک الجھاؤ کا شکار تھا۔ کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ اس بچے نے کاشف کو دانتوں سے کیسے اور کیوں مار ڈالا تھا؟

اس بچے کو کس نے مارا تھا۔ اس کا جواب صوفیہ نے یوں دیا۔

"عالیان سے منگنی میری دلی خوشی تھی میں عالیان سے محبت کرتی تھی ہم چند ہی دنوں میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے والے تھے کہ کاشف جو مجھے آئے روز دھمکاتا رہتا تھا اس نے ہوٹل میں سب کے سامنے عالیان کو قتل کر دیا میری دنیا اجڑ گئی مقدمہ چلا کاشف کو سزائے موت ہوئی بعد میں پتہ چلا کاشف جیل سے فرار ہو کر روپوش ہو گیا ہے۔"

معاملہ پھر یوں صاف ہوا جب صوفیہ نے ایک حیرت انگیز بیان دے ڈالا۔ "میرا دل چاہ رہا تھا کہ خودکشی کرلوں، کیونکہ وہی ہوا جس کا شک تھا وہ بچہ میرا نہیں تھا۔" صوفیہ نے بتایا۔

میں باتھ روم میں نہا رہی تھی جب مجھے محسوس ہوا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے میں نے اچھی طرح چیک کیا مگر وہاں سوائے میرے کوئی موجود نہ تھا مگر میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی مجھے ضرور دیکھ رہا ہے۔"

میں شاور لے کر کمرے میں آئی میں نے ڈریس چینج کر دی تھی کہ کسی نے میرے کپڑے میرے جسم سے اتار لئے اور مجھے بیڈ پر دھکیل دیا مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا میری گردن پر ہلکا سا دباؤ تھا وہ کوئی تھا جو مجھے مارنا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے مارا نہیں میرے جسم پر لباس نہ تھا میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر مجھے لگا جیسے میں جکڑی ہوئی ہوں۔

اچانک مجھے اپنے ہونٹوں اور پورے جسم پر innisible کسی دکھائی نہ دینے والے وجود کا احساس ہوا اور پھر میں بے ہوش ہو گئی۔ میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ کون تھا کیونکہ بعد میں جب مجھے ہوش آیا تو وہ جا چکا تھا مجھے اپنے جسم پر نشانات نظر آئے بیڈ کے نیچے ایک پرچہ ملا اس پر واضح لکھا تھا۔ "مجھے معاف کر دینا فقط تمہارا عالیان۔"

اس واقعے کے بعد میری آپ سے شادی ہو گئی میرے اندر عالیان کا بچہ پل رہا تھا۔ میں ہر روز روتی رہی مگر یہ بات کسی کے علم میں نہ لائی۔ معاملہ صاف ہو گیا تھا۔

مرنے کے بعد عالیان کی روح واپس آئی اور صوفیہ سے ملاپ کیا مگر اس بات کو دل ماننے کو تیار نہ تھا مگر حالات صرف اس طرف اشارہ کر رہے تھے۔

عالیان کے بچے نے کاشف کو اس لئے مار ڈالا کیونکہ کاشف عالیان کا قاتل تھا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مکروہ صورت بچے کو کس نے اور کیوں مارا؟

میں نے اس معاملے کو امام رحیم علی سے ڈسکس کیا تو انہوں نے دعا دی، گھر کو مکمل حصار کر ڈالا، مجھ پر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر چکا تھا، امام صاحب نے اس معاملے میں بہت مدد کی میں انکا شکر گزار ہوں ویسے آج تک اس واقعہ پر مجھے خود بھی یقین نہیں اس کے بعد ہمارے حالات بالکل نارمل رہے، صوفیہ میرے ساتھ خوش و خرم وقت گزارنے لگی۔ اس کے بعد ہمارے دو بچے ہوئے جو کہ بالکل نارمل تھے۔ خیر اب ہم اپنی خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔

خواب حقیقت

رفعت محمود۔ پنڈ لمبور راولپنڈی

بچے کے منہ سے آواز نکلی امی وہ دیکھیں وہ پری مجھے بلا رہی ہے وہ مجھے لینے کے لئے آگئی ہے، یہ سننا تھا کہ والدین ہی کیا وہاں پر موجود سارے لوگ دل پکڑ کر بیٹھ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے.....

دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی اور جسم و جاں میں خون کو منجمد کرتی کربناک، دردناک کہانی

اکتوبر کی ایک چمکتی ہوئی حسین صبح تھی۔

میرا بڑا بیٹا نوری جسے ہم پیار سے نوری بابا کہتے تھے حسب معمول مسکراتا ہوا اٹھا اور اسکول جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

''امی۔'' اس نے بوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ ''آج میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔''

میرا دل دھڑک کر رہ گیا۔ میں نے اس کا خواب سننے سے پہلے پوچھا۔ ''نوری بابا اچھا خواب ہے تو سناؤ ورنہ نہیں۔''

کیونکہ اس کے خواب ہمیشہ سچے نکلتے تھے۔

میرے ابا مرحوم کی وفات سے کئی ماہ پہلے اسنے ان کی موت کے متعلق بتادیا تھا۔

اپنے چھوٹے بھائی کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے آنے کے بارے میں ہمیں بتادیا تھا۔ اس طرح

چھوٹی موٹی خوشیوں اور دکھوں کے بارے میں وہ پہلے ہی سے بچھ نہ کچھ اشارہ کر دیتا۔ اگر وہ کہتا کہ "خواب اچھا نہیں ہے تو میں بغیر سے خاموشی سے صدقہ خیرات کر دیتی۔"

"امی آپ گھبرائیں نہیں۔ بہت اچھا خواب ہے۔" اس نے میری ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا پھر سناؤ۔" میں نے پیار سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"امی میں نے دیکھا کہ آسمان پر ایک بہت نورانی چہرہ بزرگ کی سواری جارہی ہے اور وہ بزرگ اپنا چہرہ مبارک کالے کپڑے سے ڈھانپے ہوئے مجھے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔"

پھر میں دیکھتا ہوں کہ میں نے نہایت خوبصورت سنہرے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ تلوار کمر سے بندھی ہوئی ہے اور میں کسی بادشاہ سے ملنے جارہا ہوں سامنے بادشاہ کا سنہرا محل نظر آرہا ہے۔ گیٹ پر کھڑے گارڈز مجھے جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مجھے محل میں اپنے نانا ابو کا چہرہ نظر آتا ہے۔ میں محل کی سیڑھیاں چڑھتا ہوں تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ نانا ابو ہی اس محل کے بادشاہ ہیں وہ مجھے چاندی کی پلیٹوں میں انگور کھانے کے لئے دیتے ہیں اور ہنس کر کہتے ہیں کہ "بیٹا اب تم گھر جاؤ۔"

گھر آتے ہوئے واپسی پر میں راستہ بھول جاتا ہوں اور خاردار کانٹوں اور دلدل میں پھنس جاتا ہوں۔ بڑی مشکل سے ہاتھ پاؤں مار کر نکلتا ہوں تو سامنے اسکول کی عمارت اور سڑک نظر آتی ہے۔

بزرگ کی زیارت کو میں نے ایک نیک فال قرار دیا اور اپنے ابو کو بادشاہ کی حیثیت سے تخت پر بیٹھے کو انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام حاصل ہونا تصور کیا۔ اپنی تسلی کے لئے میں نے ایک عالم سے اس خواب کی تعبیر بھی پوچھی اور صدقہ خیرات دے کر مطمئن ہوگئی۔

رمضان شروع ہوگیا تھا ناصر اور بچے روزے رکھ رہے تھے پانچ اکتوبر کا دن تھا۔ پاکستان اور کشمیر میں زبردست قسم کا زلزلہ آیا تھا زندگی اور موت کی جنگ شروع تھی ملک کی فضا گھٹی گھٹی سی تھی۔ راولپنڈی سے بہت سے لوگ سامان کشمیر کو بھجوا رہے تھے ہر طرف عجیب خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔

نومی بابا اس دن روزے سے تھا۔ صبح اسکول گیا تو اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اس نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ وہ گھر آنا چاہتا ہے کیونکہ اسے چکر سے آرہے ہیں اور جسم گرم ہے میں نے اسے فوراً گھر بلوالیا ہاتھ پکڑ کر دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ نارمل بخار ہے۔

"امی میں نے بیکار میں آپ کو پریشان کیا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ معصومیت سے بولا۔

میں نے اسے زبردستی روزہ افطار کرایا پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے اس کا بایاں ہاتھ کانپا اور اس نے فوراً گلاس دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

ناصر سے میں نے ذکر کیا اور اصرار بھی کہ آج ہی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں، شام کو چار بجے اسپیشلسٹ نے تین گھنٹے اس کے مختلف ٹیسٹ کئے اور کہا۔ "معدے میں وائرس کا اثر ہے ٹیسٹ سب نارمل ہیں لیکن کچھ دنوں کے لئے اسے اسکول نہ بھیجیں اور کھانے کا خاص خیال رکھیں۔"

چند دوائیں بھی ڈاکٹر نے لکھ کر دیں۔ میرے دل پر نجانے کیوں انجانے خدشے سے چھا گئے میں بہت دیر تک روتی رہی میں نے بار بار خود کو سمجھایا کہ بچے آخر بیمار ہوجاتے ہیں اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔

لیکن ایک عجیب سا خوف مجھ پر طاری رہا اور میں اسے بڑے غیر محسوس انداز میں دیکھتی رہی کہ کوئی غیر معمولی تبدیلی تو اس میں نہیں ہوئی لیکن وہ دن بھر نارمل رہا۔

وقت آگے کو چلتا رہا۔ دن گزرتے رہے نومی کو اسکول جانے سے روک دیا گیا تھا، وہ ہر روز اسکول جانے کے لئے ضد کرتا تو میں ٹال جاتی وہ ٹیلی فون

پھر اپنے دوستوں سے پوچھتا کہ آج کیا کیا پڑھایا گیا ہے اور پھر اپنی کتابیں لے کر گھنٹوں بیٹھ کر پڑھتا رہتا۔ صبح لان میں اخبار کتابیں اور موبائل اٹھا کر لے جاتا اور خود کو ہر طرح سے صحت مند ظاہر کرتا۔ ایک دن وہ باغ میں بھاگتے بھاگتے گر گیا۔

"کیا ہوا نوی بابا۔" میں اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔

"امی مجھے یوں لگا تھا کہ میری بائیں ٹانگ میرے ساتھ نہیں ہے لیکن تھوڑی دیر کے لئے ہی ایسا محسوس ہوا تھا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

پھر کچھ دن بعد ہم نے ڈاکٹر سے بات کی تو اس نے اسپتال میں داخل کروانے کا مشورہ دیا تاکہ اس کا اچھی طرح چیک اپ کیا جاسکے۔ ہم نے اسے اسی شام کو اسپتال میں داخل کروادیا۔

اسپتال میں اس کا چیک اپ طویل ہوتا گیا میں نے دوسرے بچوں کو پشاور اپنی خالہ کے پاس بھیج دیا اور خود اسپتال میں رہنے لگی۔

ناصر دن کا وقت زیادہ تر ہمارے ساتھ گزارتے اگر کام کیلئے جاتے بھی تو کئی کئی چکر اسپتال کے لگاتے۔

ایک ماہ میں بے شمار ٹیسٹ ہوئے سب نارمل اور ٹھیک تھے جانے کیسے ڈاکٹروں کو شک ہوا کہ معدے کے بائیں حصے میں کچھ رکاوٹ ہے اس کو کبھی کبھی سخت تکلیف ہوتی تھی وہ پیٹ پکڑ رہا تھا۔

"امی۔" ایک دن وہ مجھے اسپتال میں کہنے لگا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب بڑا ہو کر سیاست میں نہیں جاؤں گا بلکہ ڈاکٹر بنوں گا معدے کا سرجن، ان ڈاکٹروں سے بھی بہت اچھا۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں سوچنے لگی کہ معصوم بچے کے دل میں جانے کیسے کیسے خیال آتے ہیں، اور وہ اپنی بیماری کے بارے میں جانے کیا سوچتا رہتا ہے۔

ہم اسپتال ہی میں تھے کہ ہمیں پتہ چلا کہ زلزلے سے بہت نقصان ہوا ہے۔ نوی بابا سن کر بہت اداس ہوا تھا۔

خوف.....!

خوف کا پسندیدہ مسکن اس انسان کا دل ہے جس میں احساس گناہ تو ہو لیکن گناہ چھوڑنے کی طاقت نہ ہو۔ خوفزدہ انسان کی ہر بازی مات، ہر جنگ شکست اور ہر کوشش ناکام ہوتی ہے۔ خوف خوراک سے طاقت اور نیند سے راحت چھین لیتا ہے۔ سب سے بدقسمت ہے وہ انسان جو اپنے مستقبل سے خائف ہو، جدا ہونے والے ہمراز اور ادب نہ کرنے والی اولاد سے خوف آتا ہے۔

اگر خیال کی اصلاح ہو جائے تو خوف دور ہو سکتا ہے۔ ماضی کی غلطیوں پر توبہ کرلی جائے تو خوف دور ہو جاتا ہے۔ کوئی رات ایسی نہیں جو ختم نہ ہوئی ہو اور کوئی غلطی ایسی نہیں جو معاف نہ کی جاسکے۔ کوئی انسان ایسا نہیں، جس پر رحمت کے دروازے بند ہوں۔ دعا سے خوف دور ہوتا ہے اور دعا کا حاصل ہی یہ ہے کہ یہ ہمیں ہمارے خوف سے نجات دلاتی ہے۔

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

"امی۔" وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ "یہ سب ہمارے اعمالوں کی وجہ سے ہے ہم احکام خداوندی کو بھول گئے ہیں جیسے ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے۔"

"بیٹا۔" میں نے اس سے کہا۔ "یہ زلزلے سیلاب ہماری حماقتوں کی وجہ سے آرہے ہیں جب ملک کے بادشاہ ہی رعایا کا خیال نہ کریں تو زلزلے ہی آئیں گے۔"

ایک روز ہم نے ڈاکٹر سے کہا۔ "نوی کی تکلیف بڑھ رہی ہے اگر بیرون ملک سے آئے ہوئے ڈاکٹر سے مشورہ لے لیا جائے تو شاید اس کی جان بچ جائے۔"

اس وقت تو ڈاکٹر صاحب مان گئے لیکن انہیں یہ بات بہت بری لگی کہ ان کے مریض کے لئے کسی

دوسرے ڈاکٹر کو بلا کر ان کی قابلیت پر شک کیا گیا ہے دو ماہ بعد جب نوی کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر آپریشن کیا گیا تو ان ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا۔

"اگر یہ بچہ کسی غریب اور غیر معروف آدمی کا ہوتا تو اس وقت بھی کا اسکول جا رہا ہوتا اور تندرست ہو گیا ہوتا آپ نے بیرون ملک سے آئے ہوئے ڈاکٹر کو بلا کر میرے پیشے پر شک کیا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب۔" میں نے ان سے کہا۔ "ہم والدین ہیں ہم نے جو کچھ کیا بچے کی بہتری کے لئے کیا پھر ہم نے آپ کی رائے بھی لی تھی آپ کا فرض تھا کہ ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہمیں بتاتے کہ بچے کا آپریشن ضروری ہے عام آدمی چاہے پڑھا لکھا بھی ہو ان باتوں کے متعلق کیا جانتا ہے۔"

"میں کیا کہوں آپ کو۔" وہ کہنے لگے۔ "آپ نے میری موجودگی میں دوسرے ڈاکٹر کو بلا لیا اور مجھ سے بہتر سمجھ کر اس کی رائے لی میرے پاس مریضوں کی کوئی کمی نہیں ہے میں تو بے حد معروف ڈاکٹر ہوں۔ میرے مریض دروازے کے باہر بیٹھ کر میرا انتظار کرتے ہیں۔"

زندگی اور موت تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے لیکن لاپروائی خود غرضی اور بے مروتی، خدمت خلق جیسے پیشے میں بھی اتنی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ دل میں اندھیرے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ نوی کی حالت سے ہم مطمئن نہیں تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ معدے کی اس بیماری کی ابھی تک سمجھ نہیں آ رہی۔

اس صبح میں نے نماز پڑھ کر اپنے معصوم بچے کے لئے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی۔

"اے رب ہم نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے جس کی اتنی سخت سزا مل رہی ہے۔ بے شک تو اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ لیکن ہم کو کمزور بے بس ناتواں انسانوں کو ایسی آزمائشوں سے نہ گزار جسے ہم سہہ نہ سکیں۔ میرے بچے کو صحت بخش دے زندگی دے دے۔ اے میرے خدا یہ کیسے اندھیرے ہیں کیسی ظلمتیں ہیں۔ کیسی ویرانیاں ہیں جو میرے دل کو چین نہیں لینے دیتیں۔ ایک بے بس ماں کی فریاد سن لے میرے معبود مجھے روشنی عطا کر۔"

نوی کی حالت میں ذرا برابر فرق نہ آیا چند دنوں سے اس کے پیٹ میں سخت درد ہو رہا تھا ڈاکٹر اب گھر پر ہی اسے دیکھنے آتے رہے تکلیف اور کرب کے باوجود اس کے خوبصورت چہرے پر فرشتوں جیسی مسکراہٹ تھی۔ میں زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارتی ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کا دل خوش کرتی۔

ایک دن اس پھول نے مجھے ایسا رلایا کہ میری روح بھی اندھیروں میں بھٹکتی رہی۔

"امی۔" وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔ "رات کو میں نے خواب دیکھا کہ ایک پری مجھے آسمان کی طرف لے جانا چاہتی ہے اور میں اس سے الجھ پڑتا ہوں وہ مجھے مارنے لگ جاتی ہے۔"

"یا اللہ اس معصوم کے دل پر کیسے کیسے تیر لگتے ہیں یہ سزا اسے ہی کیوں ہے۔ اس معصوم پر رحم فرما اسے زندگی کی خوشیوں سے نواز دے۔" میں نے دل ہی دل میں دعا کی ہمارے لئے زندگی بالکل بے کیف ہو گئی تھی۔ دوسرے بچوں کی خوشیاں بھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔

"امی۔" ایک دن وہ چھوٹے بھائی کو پاس بیٹھا کر بولا۔ "آپ اسے نوکروں کے گھروں میں نہ جانے دیا کریں ان کے بچوں سے بری باتیں سیکھ رہا ہے۔"

"نوی۔" میں نے کہا۔ "آپ اچھے ہو جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یا خدایا ہماری سن اور اس بچے کو شفا دے۔ ہم سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی اس کی آنکھوں سے بے بسی چھلکتی ہے۔ ہر وقت خاموش سا رہتا ہم دونوں میاں بیوی اس کی حالت دیکھ کر پتھر کے ہو گئے تھے۔

اس روز نوی کو ڈاکٹر کے پاس جانا تھا کہ اچانک اسے قے ہوئی اور تین روز تک انجکشن اور دواؤں سے

تے بند نہ ہوئی پھر ایک مصیبت اور ٹوٹی۔

اچانک اس کی زبان بند ہوگئی اور کوشش کے باوجود اس کے منہ سے آواز نہ نکلی۔

ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ ''اس کے ایک حصے میں ایسی کوئی چیز ہے جو آہستہ آہستہ اس کے پورے اعصابی نظام کو مفلوج کر رہی ہے وہ کیا چیز ہے یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔''

یا خدایا! کیسا قہر ہے کیسی قیامت ہے یہ کس گناہ کی سزا ہے۔ اسے ہمارے پاس رہنے دے ذہن مفلوج ہوگیا ہے۔ سارے ذہن میں ایک آگ لگی ہوئی ہے وہی اندوہناک شب وروز وہی افسردہ لمحے میری آنکھوں کی بارش مسلسل برس رہی تھی۔

نوی مسلسل اسپتال میں داخل تھا زبان اس کی بند غنودگی میں رہتا ہے، نیم بے ہوش، آواز دو تو آنکھیں کھولتا ہے۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرتے۔

معصوم سا بچہ دل میں سوچتا ہوگا '' کہ وہ کس مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔ اس عمر میں کیسے کیسے ولولے ہوتے ہیں کیسی آرزوئیں خواہشات سب کچھ گھٹ کر رہ گیا تھا۔ ذہن ہوگیا تھا اسے ہر چیز سیکھنے کا شوق تھا ایک بھرپور زندگی گزارنے کا ولولہ تھا۔

''یا اللہ میرے اتنے قابل بچے کو تو نے یوں کیوں مفلوج کر دیا ہے۔''

انجکشن اب بھی لگ رہے تھے معصوم کے بازو اور ٹانگیں چھلنی ہوگئی تھی زندگی اتنی بے کیف اتنی آزردہ اتنی گھناؤنی اتنی رلا دینے والی بھی ہوسکتی ہے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

آج ڈاکٹروں کے بورڈ نے مل کر فیصلہ کیا کہ کل صبح نوی کا دوبارہ آپریشن کر دیا جائے یہ آپریشن انتہائی خطرناک تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔

''امی۔'' اس نے کہا۔'' میں زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوں، شاید وہ پری حقیقت میں مجھے لینے آرہی ہے۔''

''چپ کر جاؤ۔'' میں نے پیار سے ڈانٹ دیا۔

اب میں سوچتی ہوں وہ واقعی زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔

''نوی کا دس گھنٹے کا طویل آپریشن ہوا۔ وہ دس گھنٹے سو برسوں سے زیادہ طویل تھے آپریشن تھیٹر کے باہر سب۔ بہن بھائیوں اور رشتہ داروں کا ہجوم تھا اور یوں یہ آپریشن بھی ناکام ثابت ہوا۔

آج کئی روز سے نوی اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں بے ہوش پڑا تھا۔ حسین پھول کی پتیوں جیسا معصوم چہرہ جس پر بیماری کا زور ابھرا تھا پٹیوں میں لپٹا بے سدھ پڑا تھا خون گلوکوز دنیا بھر کے طاقت اور ہوش میں لانے والے انجکشن لگائے جا رہے تھے۔ ہر پندرہ منٹ بعد اس کی نبض اور بلڈ پریشر کو دیکھا جاتا۔ لیکن ہر طرح کی دیکھ بھال اور علاج کے باوجود دل پر انجانے خوف مسلط تھے۔

چند روز کے بعد ہم نے راولپنڈی کے ایک مشہور پیر کمال پاشا کو بلوایا انہوں نے اپنے موکلوں کے ذریعے ہمیں بتایا کہ '' بچے پر کسی پری کا سایہ ہے اور وہ اسے نہیں چھوڑ رہی اس بچے نے اسکول میں پیپل کے درخت کے نیچے پیشاب کیا ہے اور اس نے اسے پکڑ لیا ہے میں نے اسے پری کو اپنے موکلوں کے ذریعے بہت کہا ہے کہ اسے چھوڑ دے مگر وہ راضی نہیں ہو رہی ہے۔ اس نے اسے پیار کیا ہے وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے اسے قابو کرنا کسی کے بس کی بات نہیں پریوں کی ملکہ ہے میرا علم اس کے آگے بے بس ہے۔'' اتنا کہہ کر پیر کمال پاشا چپ ہوگئے۔

''نوی نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں کھولیں اور بے تحاشہ رو دیا اور دوسرے روز بھی آنکھیں کھولیں اور پھر ایسی بند کیں جیسے دنیا سے کنارہ کش ہوگیا ہو۔

نوی نے کس بہادری اور جوانمردی سے بیماری اور غیبی طاقت کا مقابلہ کیا سب رشتہ دار دعائیں مانگ رہے تھے۔ لیکن سب کی دعائیں رائیگاں گئیں خاندان میں اس بچے سے کون محبت نہیں کرتا تھا ایسے بچے کس کو اچھے نہیں

لگتے ایسا کرب ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا شب و روز طویل ہوتے گئے زندگی نفسوں میں گھٹ کر سسک رہی تھی۔

نوی کی حالت میں ذرہ بھر فرق نہ آیا ڈاکٹروں نے گلوکوز اور خون دینا بند کردیا وہ مایوس سے ہوگئے تھے۔

''یا خدا یا یہ کیسی زندگی ہے کیسا کرب ہے کیسا درد ہے کیسا دکھ ہے جس کا مداوا نہیں ہمارا جگر گوشہ زندگی سے بے گانہ پڑا ہے اور ہم لاچار بے بس ہاتھ مل رہے ہیں، آہیں بے کار ہوگئی ہیں، آنسو خشک ہوگئے ہیں دعائیں بے اثر ہوگئی ہیں علم و حکمت بے معنی ہم کیا کریں کہاں جائیں۔''

آنے جانے والوں کا اسپتال میں ایک تانتا بندھا رہتا ہے کون سا ایسا شخص ہے جو اس معصوم کے لئے آنسو نہیں بہاتا۔ دل کی گہرائیوں سے دعا نہیں کرتا۔

''اے رب تو کہاں ہے تیری رحمتوں کو کیا ہوگیا ہے تو ہماری سنتا کیوں نہیں۔ اگر زندگی ایسی کڑی آزمائش کا نام ہے تو مجھ سے میری زندگی واپس لے لے مجھے بلا لے لیکن میرے معصوم بچے کو صحت بخش دے میں یہ غم کیسے برداشت کروں گی مجھے اس دن کے لئے زندہ نہ رکھ یا اللہ وہ کون سا دن ہوگا جب میرا بچہ ہم میں واپس آئے گا ہمیں کس کی نظر کھا گئی ہے اس ہنستے مسکراتے گھر پر کیسی آفت کیسی مصیبت آگئی ہے۔''

سب رشتہ داروں کے دل پژمردہ ہوگئے چہروں پر حسرت و یاس کے بادل چھائے رہتے۔ کاش ایک بار نوی ہماری طرف مسکرا کر دیکھے ایک بار تو آنکھیں کھول کر ہماری آہیں سن لے۔ ان دکھوں کا نام آخر زندگی ہے۔ تو آخر زندگی کیا ہے اگر ایسے دکھوں کے لئے ہمیں زندہ رہنا ہے تو ہم مر کیوں نہیں جاتے خدا نے ہمیں ایسا کیوں بنایا ہے کہ کسی چیز پر اختیار نہ ہونے کے باوجود ان پیاری چیزوں سے ایسا دل لگا لیتے ہیں گویا ہماری اپنی ہو۔

دن رات کی مسلسل اذیت اور کرب کے باوجود ہمیں ایسی صبح کا انتظار رہا کہ ایک دن نوی تندرست ہوجائے گا اور ایک بار پھر پہلے کی طرح شرارتیں کرتا چلتا پھرتا نظر آئے گا مگر وہ صبح کب آئے گی۔

آہ یہ کیا ہوگیا یہ کیسی قیامت گزر گئی یقین نہیں آتا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہمیں چھوڑ کر افق کی بلندیوں میں کہیں گم ہوگیا۔ اندھیروں میں ڈوب گیا جانے کس جہاں میں کھو گیا اتوار کی منحوس رات کو دو بجے نوی زندگی اور موت کی کشمکش میں زندگی کو شکست دے گیا۔

لاڈلے بیٹے کی المناک موت ہمارے لئے ایک بڑا سانحہ ہے۔

گھر میں ابھی تک لوگوں کا رش ہے وہی لوگوں کے ہمدردی کے بے معنی جملے، ذہن مفلوج ہوکر رہ گیا ہے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا جی چاہتا ہے میں بھی ان ہی اندھیروں میں کھو جاؤں جہاں میرا معصوم بچہ چلا گیا ہے۔

ناصر بالکل خاموش ہیں ان کی خاموش آہ و زاری بہت تکلیف دہ ہے، کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ گیلی لکڑی کی طرح سلگتے رہتے ہیں اس بچے کے ساتھ انہیں بے انتہا پیار تھا رات کو سونے سے پہلے جب تک اسے لپٹا کر پیروں یا نمیں نہ کرلیتے تھے انہیں چین نہیں آتا تھا۔

اے خدا ہمارے ہنستے کھیلتے گھر کو کس کی نظر کھا گئی، یا رب تیری خدائی میں کس چیز کی کمی تھی کہ تو نے اپنے بھرپور خزانوں میں اضافے کے لئے ہمارے جگر گوشے کو چھین لیا، ہماری آہیں ہماری کراہیں۔ ہماری دعائیں ہماری گڑگڑاہیں تجھ پر کوئی اثر نہ کرسکیں تو تو صدق دل سے نکلی ہوئی دعائیں سنتا ہے ہماری آواز پھر تجھ تک کیوں نہ پہنچی۔ کاش! تو اسے زندگی دیتا۔

اتنا پیارا بچہ ایسے چلا گیا جیسے تیز ہوا کا جھونکا اسے اڑا لے گیا ہو۔

ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس خواب حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے کہ خوابوں کی دنیا میں ہمارا کچھ نہیں یہ سب ایک خواب حقیقت ہے آنکھ کھلی اور خواب ٹوٹ گیا ہمارا دنیا میں کچھ نہیں سب کچھ تیرا ہے تو ہی سب کا مختار ہے یہ زندگی چند روزہ اور فانی ہے۔''

☠

مجھ سے دوستی کرو گے

امتیاز تاج - کراچی

اچانک موبائل کی اسکرین روشن ہوگئی، مگر یہ کیا! موبائل میں بیٹری موجود نہیں تھی مگر اس کے باوجود موبائل آن ہوگیا تھا، جسے دیکھ کر دونوں نوجوان ہکا بکا اور اچنبھے میں تھے اور پھر......

دل و دماغ کو شکنجے میں جکڑتی اور سوچ کے افق پر...... رواں دواں...... عجیب کہانی

دسمبر 2005ء کی بات ہے مجھے ایک کاروباری سلسلے میں اپنے منیجر نعمان کے ہمراہ لاہور جانا تھا۔ ہماری سیٹیں اے سی سلیپر میں بک تھیں۔

ریل گاڑی کراچی کینٹ سے روانہ ہوئی تھی مگر روانگی سے تین گھنٹے قبل ہمیں کراچی کے قائداعظم ائیرپورٹ کسی اہم کام سے جانا پڑ گیا۔ طے یہ پایا کہ اپنے بیگ ساتھ لے جائیں اور لانڈھی اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوا جائے۔

لہٰذا ہم دونوں لانڈھی اسٹیشن سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ کیونکہ یہاں گاڑی بہت مختصر وقفے کے لئے ٹھہرتی ہے اس لئے جب تک ہم اپنی نشستوں پر پہنچے گاڑی نے رینگنا شروع کردیا۔

بوگی تقریباً خالی تھی۔

میں اپنی برتھ F-13 پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ خالی

نہیں ہے۔ اس پر ایک جواں سال محترمہ بڑے مزے سے جنت جائے نیم دراز ہوکر کسی جاسوسی رسالے سے شوق فرما رہی ہیں۔

میں نے ایک بار پھر اپنا ٹکٹ جیب سے نکالا اور سیٹ نمبر چیک کرنے کے بعد ان سے مخاطب ہوا۔

"آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر یہ میری سیٹ ہے آپ اسے خالی کردیں۔"

انہوں نے ایک شان بے نیازی سے رسالے سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

"کہیں بھی بیٹھ جائیں، پورا ڈبہ تو خالی پڑا ہے۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔

"آپ کہیں بھی بیٹھ جائیں۔ مگر براہ کرم میری سیٹ چھوڑ دیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ آگے جاکر اس ڈبے کو بھر جانا ہے۔ خوامخواہ کی بدمزگی سے بچنے کے لئے بہتر ہے کہ اسی سیٹ پر سفر کیا جائے جو آپ کے لئے محفوظ کی گئی ہے۔

وہ خاتون جھلائی ہوئی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی اپنی چیزیں سمیٹتی ہوئی برتھ سے اتریں اور سامنے کی برتھ پر جا بیٹھیں وہ محترمہ غالباً اپنے والد کے ساتھ سفر کررہی تھیں۔ نعمان کی سیٹ نیچے تھی۔ میری توقع کے عین مطابق ہماری بوگی اسٹیل مل پر آکر بھر گئی۔

پاکستان اسٹیل مل کے 30-25 محنت کش جو شاید کسی جلسے وغیرہ میں شریک ہونے کہیں جارہے تھے اس میں سوار ہوگئے وہ سب نائٹ ڈیوٹی کرکے آرہے تھے اس لئے وہ آتے ہی اپنی اپنی برتھوں پر چڑھ کر سوگئے۔

میں بھی کافی تھکا ہوا تھا اپنی کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا اور آج کا اخبار پڑھنے لگا۔

برابر کی برتھ پر وہ محترمہ بدستور کسی جاسوسی ڈائجسٹ میں بزدبی ہوئی تھیں۔

میں نے کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا تو مجھے موصوف کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلتے نظر آئے۔ پھر ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ اتنی دیر پڑھنے کے بعد بھی انہوں نے رسالے کا ایک ورق بھی نہیں پلٹا تھا۔

میری جاسوسی کی رگ پھڑکی اور ایک اور انکشاف ہوا کہ رسالہ تو ایک بہانہ تھا وہ ایک ننھا سا "ہینڈ فری" لگائے اپنے موبائل سے کسی سے محو گفتگو تھیں۔

میں ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر دوبارہ اخبار کی جانب متوجہ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد میں اس سے بھی اکتا گیا اور اخبار رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا، مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ بوگی کی چھت کو یونہی بے مقصد گھورتے ہوئے میری نظر کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر پڑی جو عین میرے چہرے کے سامنے ٹیپ سے چپکا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے کھینچ لیا۔ اس ہلکے نیلے کاغذ کے ٹکڑے پر کالی روشنائی سے نہایت خوش خط میں تحریر تھا۔

"مجھ سے دوستی کروگے؟"

اور نیچے ایک دس حرفی موبائل نمبر درج تھا۔ "مجھ سے دوستی کروگے۔" میں نے زیرلب الفاظ دہرائے۔ یہ کسی لڑکی کا پیغام معلوم ہورہا تھا۔

بغیر کسی ارادے کے میرا ہاتھ میری پینٹ کی جیب میں رینگ گیا اور میں نے اپنا فون نکال کر اسی کا نمبر ڈائل کردیا۔ نمبر تو میں نے ملا دیا مگر مجھے امید نہیں تھی کہ اس پر کوئی جواب بھی ملے گا۔ میرے اندازے کے بالکل برعکس پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھالیا گیا اور ایک مترنم سی آواز نے کہا۔

"ہیلو فرید۔ اتنی دیر لگادی۔ بہرحال مجھے معلوم تھا کہ تم فون ضرور کروگے۔"

میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور چلی گئی۔

"کون ہیں آپ اور مجھے آپ کیسے جانتی ہیں۔ اور آپ کو کیسے معلوم تھا کہ میں فون ضرور کروں گا؟"

میں نے ہڑبڑا کر ایک سانس میں بہت سارے سوالات کردیئے۔

دوسری جانب سے جواب آیا۔

"ابھی تو آپ کا سفر شروع ہی ہوا ہے ابھی تو گاڑی میں کافی وقت گزارنا ہے بہت دور جارہے ہیں آپ اس وقت اپنے گھر سے۔ جلد ہی سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے آپ کو۔" "اپنے بارے میں بتاؤ کہاں گھر ہے تمہارا۔"

اس نے بڑے فلسفانہ لہجے میں جواب دیا۔

"گھر تو مل ہی جائے گا ایک نہ ایک دن اچھا تم فون بند کرو میں، موقع ملتے پر خود فون کروں گی۔" اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نے اس کا نمبر "ریل گاڑی" کے نام سے ریل گاڑی گرل Save کرلیا۔

اب ہم حیدرآباد پہنچنے والے تھے، میں نے نیچے اتر کر جوتا پہنا وہ محترمہ ابھی تک رسالے کے اس صفحے میں ڈوبی جانے کس سے باتیں کر رہی تھیں۔

مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے منہ دوسری طرف کرلیا اور کمبل کانوں کے اوپر اوڑھ کرلیا۔

حیدرآباد اسٹیشن پر ہم دونوں دوست اترے چائے سگریٹ اور کچھ سامان کھانے پینے کا لے کر دوبارہ گاڑی میں چڑھ گئے

گاڑی کے چلنے کے آدھے گھنٹے بعد مسافروں کے ٹفن کھلنا شروع ہوگئے اور پوری بوگی میں مختلف کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیل گئیں۔

ہم نے بھی اپنے تھیلے نکالے اور مرغ چھولے اور نان نکال کر کھانے لگے۔

رسالے یا موبائل والی محترمہ بھی نیچے آچکی تھیں۔ اور ایک بڑے ٹفن سے کباب پراٹھے اور نہ جانے کیا کیا نکالنے لگیں۔

ان کے ابا جان ایک پراٹھے پر اچار اور دو کباب لے کر ہماری طرف بڑھے اور نہایت نرم لہجے میں کہا۔

"قبول کیجیے گا جناب۔"

میں نے انکار کرنا چاہا مگر نعمان نے ہاتھ بڑھایا اور شکریے کے ساتھ "قبول کرلیا۔" بوگی میں محنت کش حضرات بھی کھانا کھانے کے لیے اٹھ گئے تھے۔ سب نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور فوراً ہی لمبی تان کر سو گئے۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ میں پھر اپنی برتھ پر چڑھ گیا۔

وہ موصوفہ بھی برتن وغیرہ سمیٹ کر پھر اوپر آگئیں اور رسالہ کھول کر بظاہر اس میں کھو گئیں میں نے بھی کتاب اٹھائی مگر میرا دل اس میں نہیں لگا، میں نے اپنا فون نکالا اور اس کا نمبر ملایا مگر فوراً ہی کینسل کا بٹن دبا دیا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ خود فون کرے گی۔

پیٹ کچھ زیادہ کھانے کی وجہ سے بھاری بھاری ہو رہا تھا، کباب واقعی بہت لذیذ تھے، میں نے واجھک کر نعمان سے کارمینا مانگی سامنے والی لڑکی کے چہرے پر کارمینا کا نام سن کر ایک مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ کتاب سے نظر ہٹائے بغیر اب مسکرائے جارہی تھی۔ میں شرمندہ سا ہو گیا نعمان نے مجھے کارمینا کی دو ٹکیاں دیں اور میں نے منہ میں دبا لیں اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

اچانک میرے فون میں جھنجھناہٹ شروع ہوگئی اور رنگ ٹون کی موسیقی بجنے لگی۔

میں نے فون کے اسکرین پر دیکھا۔ لکھا تھا RAIL GARI GIRL CALLING میں نے بے صبری سے YES کا بٹن دبا دیا۔

وہی مترنم آواز آئی۔

"اتنا کھاتے ہی کیوں ہو کہ کارمینا کی ضرورت پیش آئے۔"

میں نے چونک کر سامنے والی برتھ کو دیکھا موصوفہ میری طرف پیٹھ کیے رسالے میں "غرق" تھیں۔

"اوہو۔"

میں نے اپنی جاسوسی اور جیمس بانڈ کے چلن پر تین حروف بھیجے۔

اتنی معمولی بات بھی میری عقل میں نہیں آسکی۔ موصوفہ مجھ سے پہلے اسی برتھ پر براجمان تھیں اور مجھے دیکھ کر انہوں نے وہ کاغذ بوگی کی چھت پر چپکا دیا تھا اور میں اتنا بے وقوف کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔

"ذرا چہرہ تو دکھائیں۔ ایسی بھی کیا بے رخی ہے؟"

"اتنی بے صبری اچھی بات نہیں، اب بند کریں اور روہڑی کے بعد تفصیل سے بات ہوگی ٹھیک ہے۔"

اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں برتھ پر ٹانگیں نیچے کر کے بیٹھ گیا اور قدرے بلند آواز میں پوچھنے لگا۔

"یار نعمان روہڑی کب آئے گا۔"

نعمان نے پوچھا ابھی کافی دور ہے وہاں
کیا کام ہے۔ میری بلند آواز سن کر فون والی محترمہ نے
پلٹ کر میری طرف غور سے دیکھا۔

میں نے اپنی بہترین مسکراہٹ چہرے پر سجائی
اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ میرے
اس طرح دیکھنے سے وہ شرم سے سرخ ہوگئی اور ادھر ادھر
دیکھنے لگی اور منہ پھیر کر لیٹ گئی۔

مجھے اس کا یہ انداز بھی بہت پیارا لگا۔

وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی اور ایک خوبصورت چہرہ
اگر آپ کی طرف راغب ہو جائے تو دنیا بہت اچھی لگنے لگتی
ہے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا میرے دل میں پیار کے
نغمے گونجنے لگے اور میرا دل شاعری کرنے کو مچلنے لگا۔

اب مجھے روہڑی کا بے چینی سے انتظار تھا۔

میں اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔

کہ وہ کون ہے؟

کہاں جا رہی ہے؟

اس کا گھر کہاں ہے؟

وغیرہ وغیرہ۔

میں اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے اس کی
طرف مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔

بوگی میں مکمل خاموشی تھی ریل گاڑی تیزی سے اپنی
منزل کی طرف بھاگے جا رہی تھی۔

روہڑی اسٹیشن پر بڑی گہما گہمی تھی۔

میں نعمان کے ساتھ چائے پینے اترا اور کھڑکی
سے دو کپ اس لڑکی کے باپ کو پکڑا دیے نعمان کو میں نے
کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

مجھے ٹرین کا اسٹیشن پر رکنا بے حد ناگوار گزر رہا تھا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے دیکھا وہ لڑکی کھڑکی
میں آ گئی تھی اور ہاتھ میں دبے ہوئے کپ سے چائے پی
رہی تھی۔

اچانک میں نے ایک لمبے تڑنگے نوجوان
کو کھڑکی کی طرف آتے دیکھا اور وہ لمحے کے لیے رکا
اور لڑکی سے کچھ کہا اور آگے بڑھ گیا پھر وہ لڑکی بوگی کے
دروازے میں آن کھڑی ہوئی اس کے ہاتھ میں چائے
کا کپ ابھی تک تھا اور وہ باڈی بلڈر قسم کا نوجوان بھی
ہاتھ میں بسکٹ کا پیکٹ لا کر لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔

میرا حسد کے مارے برا حال تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ
نوجوان کو پکڑ کر دو تھپڑ لگاؤں مگر اس کے شاندار و کسرتی
بدن نے مجھے اپنی اس حرکت سے باز رکھا۔ آخر ٹرین کی
وسل بجی نوجوان دوسری بوگی کی طرف چل دیا۔ ہم ڈبے
میں چڑھ گئے نعمان آگے تھا۔ لڑکی نے اس کو راستہ دیا
اور وہ اپنی سیٹ پر چلا گیا میں گزرنے لگا تو اس نے مدہم
لہجے میں کہا "پلیز ذرا اپنا CELL نمبر تو دیجیے گا۔"

میں نے جیب سے کارڈ نکال کر اسے دیا اس نے
اسے جلدی سے مٹھی میں دبا لیا۔

میں آہستہ سے بولا۔

"محترمہ اب اسے مس نہیں کر دیجیے گا۔"

اور اپنی برتھ پر چلا آیا ٹرین نے ابھی رفتار پکڑی
ہی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور باتھ روم کی طرف چلی گئی
جو اس کی سیٹ سے زیادہ دور نہ تھا۔

فوراً ہی میرا فون بجنے لگا۔

میں نے اسکرین کو دیکھا "دل گاڑی گرل"

میں نے بٹن دبا دیا۔

وہی مترنم آواز آئی "ہاں بھئی چائے پی لی۔ خود
بھی اور دوسروں کو بھی پلا دی۔"

"چائے تو بہت چھوٹی چیز ہے یہاں تو جان
حاضر ہے۔"

میں نے ایک سستی سی فلم کا فقرہ مار دیا۔

"اچھا جان دے سکو گے؟"

میں نے برتھ پر لیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ ایک حکم کر دیں۔"

اچانک مجھے سامنے برتھ پر کچھ سرسراہٹ کی آواز
اور برتھ پر رکھے ہوئے تکیے کے نیچے سے رنگ برنگی
روشنیاں نظر آئیں اور اس کے سامنے ہی پرانے انڈین
گانے "گھر آیا میرا پردیسی آس بجھی میری انکھین کی"
"ٹیون سنائی دی۔

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا پھر وہ لڑکی تیز قدموں سے اپنی سیٹ کی طرف آئی اپنے ہاتھوں کو رومال سے صاف کرتی ہوئی تکیے کے نیچے سے موبائل نکال کر سننے لگی۔

پورے ڈبے میں سکوت طاری تھا۔

وہ لڑکی رسالہ لئے بلوتو تھ کان پر لگا کر پہلے والا انداز اختیار کر چکی تھی۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ میرا دل بلیوں کی طرح اچھل رہا تھا۔

یا اللہ یہ لڑکی تو مجھے فون نہیں کر رہی اور کون مجھے فون کر رہا ہے پورے ڈبے میں وہی صرف ایک لڑکی تھی باقی سارے مسافر سو رہے تھے۔

"کیا ہو گیا......؟"

"فون میں سے آواز آئی۔"

"کیوں سفید پڑ گئے ہو کوئی بھوت پریت دیکھ لیا ہے کیا۔"

میرا منہ کھلا تھا۔

"کون ہو تم ...... اور کدھر ہو......" میں نے ہمت کر کے سوال پوچھا۔

کہنے لگی۔ "نیچے اتر کر کھڑکی سے دیکھو۔"

میں نیچے آ گیا نعمان سونے کا ماسٹر تھا اب تک سارے گھوڑے بیچ کے سو چکا تھا۔ اس لڑکی کے ابا بھی خراٹے لے رہے تھے اور وہ فون پر بات کرتے ہوئے میری حالت دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

میں کھڑکی کے پاس نعمان کے پاؤں سرکا کر بیٹھ گیا۔

فون میرے کان سے لگا تھا۔

فون سے مترنم سی آواز آئی۔

"باہر دیکھو غور سے۔"

میں نے ہاتھ کا چھجا بنا کر شیشے سے لگا دیا اور باہر اندھیرے میں جھانکنے لگا۔

باہر کسی چھوٹے اسٹیشن کے آثار نظر آ رہے تھے قریب سے نظر آیا سیمنٹ کے بورڈ پر کالے رنگ سے لکھا تھا۔

"نور پور"

جہاں گاڑی کو رکنا نہیں تھا البتہ آہستہ ضرور ہو گئی تھی۔

زود رنگ کی روشنی میں میں نے ویران عمارت کے پلیٹ فارم پر سفید کپڑوں میں ملبوس ایک دراز قد لڑکی کو دیکھا جو اپنے چہرے پر ایک سوگوار مسکراہٹ لئے ایک ہاتھ سے فون کان پر رکھے اور دوسرے ہاتھ سے مجھے دیکھ کر ہلا رہی تھی۔

لڑکی کے ابا کے خراٹوں کے علاوہ بوگی میں بالکل خاموشی تھی۔

"نظر آئی میں۔"

فون میں سے پھر آواز آئی۔ میں احمق بنا رہ گیا۔

"نہیں آئی تو پھر دیکھو۔"

پھر اچانک دوبارہ سے ویسے ہی اسٹیشن کی آمد ہوئی اور وہ ویسے ہی سفید سیمنٹ کے بورڈ پر نظر پڑی جس پر لکھا تھا۔

"نور پور"

پھر میں نے زود رنگ کی روشنی میں اس سفید ساڑھی میں ملبوس دراز قد اسی لڑکی کو دیکھا وہ فون کان سے لگائے مجھے ہاتھ ہلا رہی تھی۔

"دیکھ لیا اچھی طرح یا اور دکھاؤں۔"

میرے بدن میں لہو نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور میں زور زور سے کانپ رہا تھا پھر مجھے اس کا قہقہہ سنائی دیا اور میرے ہاتھ سے موبائل گر پڑا۔

اوپر برتھ پر لڑکی نے رسالہ چھوڑ دیا تھا اور وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

میں فون اٹھا کر تیزی سے اپنی برتھ پر چڑھ گیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرنے لگا میری بے چینی تھوڑی کم ہوئی کہ اچانک میرا فون پھر بج گیا میں نے چونک کر اسکرین پر دیکھا۔

کوئی نیا نمبر تھا۔

میرے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔

”ہیلو۔“

دوسری جانب سے ایک مردکی آواز ابھری۔

”مسٹر میں تم کو نہایت شرافت سے سمجھا رہا ہوں تمہارے ساتھ میری منگیتر سفر کررہی ہے۔ اس نے تمہاری شکایت کی ہے کہ تم اس سے بدتمیزی کررہے ہو۔ اب میں نے کوئی شکایت سنی تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔“ اور فون بند ہوگیا۔

یہ بات تو میری سمجھ میں آگئی کہ رسالے والی لڑکی کے ساتھ وہ باڈی بلڈر ٹائپ کا نوجوان اس کا منگیتر ہے۔ اور وہ مجھے فون نہیں کررہی۔ میرا نمبر تو اس نے اس نوجوان کو دینے کے لئے لیا تھا۔

”مگر مجھے فون کون کررہی ہے؟ اور وہ سفید ساڑی والی کون ہے؟“

میں نے چہرہ گھما کر رسالے والی لڑکی کو دیکھا وہ پھر کسی سے دھیمے لہجے میں بات کررہی تھی یقیناً وہی نوجوان ہوگا جسے وہ بتارہی ہوگی کہ تمہارے فون کے بعد تو اس کی گھگھی بندھ گئی ہے اور وہ تو بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ میرے لئے ہمدردی کے جذبات بھی محسوس کئے۔

میرے موبائل میں پھر سرسراہٹ محسوس ہوئی اسکرین پر ربل گاڑی گرل کا لنک نمودار ہوگیا۔ میں نے فون آف کردیا۔

میں زندگی میں اتنا خوف زدہ نہیں ہوا تھا پھر ایسا واقعہ ہوا جسے سوچ کر آج بھی مجھے جھرجھری سی آجاتی ہے کیونکہ میرا آف فون خود بخود آن ہوگیا۔

اور اسکرین روشن ہوگئی تھی..... ”ریل گاڑی گرل۔“

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فون کی بیٹری نکال دی۔

مگر اسکرین ویسے کا ویسے روشن تھا پھر فون میں سے آواز آئی۔

”مجھ سے دوستی کرلی ہے۔ اب بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ بہت مہنگا ثابت ہوگا۔“

یہ سب میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اچانک میرے پاؤں کے انگوٹھے کو کسی نے ہلایا۔ میرا دل حلق میں آچکا تھا۔

میں نے اٹھ کر دیکھا وہی کسرتی جسم والا نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھ سے کہا آؤ اور بوگی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں فوراً اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اس نے ایک دو دفعہ پلٹ کر دیکھا پھر تیز قدموں سے آگے چلنے لگا ساری گاڑی کے مسافر سوئے ہوئے تھے ہم مختلف ڈبوں سے ہوتے ہوئے ڈائننگ کار میں پہنچ گئے وہاں بھی ایک دو آدمیوں کے علاوہ کوئی نہ تھا وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے اپنے سامنے والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں خاموشی سے بیٹھ گیا اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا ایک سگریٹ سلگا کر پیکٹ میرے سامنے کردیا میں نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ منہ سے لگایا اس کے دیئے ہوئے لائٹر سے جلالیا۔

”مسٹر تم ٹھیک تو ہو۔“

وہ میری طرف گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے ہکلاتے ہوئے اس کو شروع سے لے کر آخر تک کی کہانی سناڈالی اور کہا۔

”آپ کی منگیتر والا معاملہ سراسر غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ مگر باقی واقعات سمجھ نہیں آرہے۔“

وہ میری پوری بات غور سے سنتا رہا اور بیچ میں کہیں بھی مجھے نہیں ٹوکا سب جان لینے کے بعد وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا کہ میری کہانی سچ پرمبنی ہے یا اس سے بچنے کے لئے میرے دماغ نے فرضی ہے۔

سگریٹ کا دھواں ناک سے خارج کرتے ہوئے کہا۔

”میرا نام کمال شاہ ہے شازیہ میری ہونے والی بیوی ہے اس کے ساتھ اس کے والد ہیں کسی وجہ سے میں ان کے ساتھ سفر نہیں کررہا ہوں۔ اس کے والد کو اگر پتا چل گیا کہ میں شادی سے پہلے اس سے واقف ہوں اور اس سے ملتا رہتا ہوں تو وہ کسی صورت میری شادی اس سے نہیں کریں گے دوسری صورت میں انہیں ہماری شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا انہوں نے ابھی تک مجھے دیکھا بھی نہیں ہے۔

میں ان کے بڑے داماد کا دوست ہوں۔ تم مجھے ایسے دیکھے
دکھائی نہیں دیتے اس لئے میں نے تم سے بات کرنا
مناسب سمجھا۔"

اس نے مزید کہا۔

"کیا تم مجھے عقل سے گزرا ہوا سمجھتے ہو کہ تم مجھے
جو کہو اس پر یقین کرلوں ہوسکتا ہے تم یہ پراسرار کہانی بنا کر کسی
اور کو تو بے وقوف بنا سکتے ہو۔ مگر میں ریلوے پولیس کا
انسپکٹر ہوں میری زندگی بھی انہیں ٹرینوں، اسٹیشنوں
اور پٹریوں پر گزری ہے۔ ہم جس ٹریک پر چل رہے ہیں اس
ٹریک پر نور پور نام کا کوئی اسٹیشن نہیں ہے۔

"ہاں ایک غیر آباد اور ویران اسٹیشن اس نام کا ضرور
ہے لیکن وہ مین ٹریک سے ہٹ کر ہے ہماری گاڑی تو اس
کے قریب سے بھی نہیں گزری۔ تم نے اسے کیسے دیکھ لیا؟"

میں سوچ رہا تھا کہ میری باتوں کا اس کو کیا، کسی
کو بھی یقین نہیں آئے گا۔ یکایک میری جیب میں
میرے CELL فون کی سرسراہٹ ہوئی۔

میں نے اس کو گھورتے ہوئے جیب سے فون نکال
کر میز پر رکھ دیا اور پھر دوسری جیب سے موبائل کی بیٹری
نکال کر اسے میز پر موبائل فون کے ساتھ رکھ دیا۔

کمال نے میرے فون کو غور سے دیکھا اور ہاتھ
میں اٹھالیا اسکرین پر "RAIL GARI GIRL
CALLING" روشن تھا اور ہلکی سی موسیقی بج رہی تھی
اس نے اسے پلٹ کر دیکھا اور موبائل کے پچھلے حصے
میں بیٹری رکھنے کی جگہ خالی تھی پھر اس نے دوسرے
ہاتھ سے بیٹری اٹھائی اور حیرانی سے مجھے تکنے لگا۔

پھر اس نے YES کا بٹن دبا کر فون کان سے
لگالیا اور آہستہ سے بولا۔

"ہیلو۔"

دوسری طرف سے کچھ سن کر پھر اس کی آنکھیں
پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہ ایک دم سے کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا
پھر ایک جھٹکے سے بیٹھ گیا اور فون مجھے دے دیا۔ میں نے
کپکپاتے ہاتھوں سے فون لیا اور کان سے لگالیا۔

آواز آئی۔

"اچھی دوستی ہے ہر برے غیرے سے ہمارا
ذکر ہو رہا ہے۔"

پھر اچانک وہ شوخ آواز بھرا گئی اور کہنے لگی۔

"میں تمہارا انتظار نور پور میں کر رہی ہوں۔ مجھے
تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔"

پھر کچھ دیر سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز آتی رہی
پھر فون بند ہوگیا۔

میں نے فون میز پر رکھ دیا۔ جو کمال نے فوراً اٹھالیا
اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا پھر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔
مگر بیٹری ہوتی تو فون کام کرتا۔ اس کے چہرے پر مجھے
ڈر اور خوف کے سائے سے زیادہ تجسس کا رنگ نظر آیا۔

وہ حیرت سے بتانے لگا۔

"میں نے فون اٹھایا تو آواز آئی۔" آپ اچھے
پولیس والے ہیں کسی کی بات کا یقین ہی نہیں کرتے۔" میں
کھڑا ہوا تو بولی۔" آرام سے بیٹھے جائیں اور فون بند کردیں۔
وہ ہمیں کہاں سے دیکھ رہی تھی۔ یہاں تو کوئی لڑکی پورے
ڈائننگ کار میں نہیں ہے۔" پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم سے کیا بات ہوئی۔؟"

میں نے کمال کو بتایا کہ" اس نے مجھ سے روتے
ہوئے مدد مانگی ہے اور وہ میرا نور پور میں انتظار کررہی ہے
۔" کمال گہری سوچ میں پڑ گیا۔

"ہمیں اس راز سے پردہ اٹھانا پڑے گا۔ میں
تمہارے ساتھ نور پور چلنے کو تیار ہوں۔ کسی کو کچھ بتانے کی
ضرورت نہیں ہم دونوں خانیوال اتر کر نور پور کی گاڑی لیتے
ہیں وہاں اسٹیشن پر کوئی نہ کوئی واقف کار مل ہی جائے گا۔
بولو کیا خیال ہے۔"

مجھے اس شخص کی جوانمردی، بے خوفی اور خلوص نے
بہت متاثر کیا۔ پرائی آگ میں کودنے والے آج کل کہاں
ملتے ہیں۔

میں راضی ہوگیا خانیوال تین گھنٹے بعد آتا تھا۔

میں اپنی برتھ پر چلا گیا اور کمال اپنی بوگی میں۔

کچھ دیر کی پکی نیند لینے کے بعد میں نے فرمان کو

اٹھا کر بتایا کہ "ایک بہت اہم اور ضروری کام کی وجہ سے مجھے خانیوال اترنا ہے وہ جا کر لاہور میں پارٹی سے مل کر سارے معاملات طے کر لے میں اس سے دو دن بعد ملتا ہوں۔"

خانیوال اسٹیشن پر ریلوے کے محکمے کے فرد ہونے کی وجہ سے ہمیں ایک ریسٹ ہاؤس مل گیا نور پور کی گاڑی صبح نو بجے ملی اور شام سات بجے ہم نور پور پہنچ گئے۔

یہ ایک غیر آباد اور سنسان اسٹیشن تھا۔

اس جگہ ایک آدھ گاڑی کے علاوہ کوئی گاڑی نہیں رکتی تھی، ہماری گاڑی بھی کمال کی واقفیت کی وجہ سے صرف ایک آدھ منٹ رکی اور ہم جلدی سے اتر گئے۔

ویران عمارت میں جیسے الو بول رہے تھے۔

اسٹیشن کے گیٹ کے پاس چارپائی ڈالے ایک دیہاتی قسم کا آدمی سو رہا تھا سردیوں کی وجہ سے شام کے سائے اندھیرا جلدی چھانے لگا تھا کمال نے اس کو اٹھایا اسٹیشن ماسٹر کے بارے میں پوچھا وہ فوراً ان کو بلانے کے لئے دوڑ گیا۔

اس نے اسٹیشن ماسٹر کو نہ جانے کیا بتایا کہ اسٹیشن ماسٹر، پوری وردی اور جوتے ٹوپی وغیرہ پہن کر فوراً ہی آ گیا۔ اس کو دور سے آتا دیکھتے ہی کمال اس کو پہچان گیا۔ وہ اس کے کوئی دور کے عزیز تھا وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

کمال نے میرا تعارف ایک دوست کی حیثیت سے کرایا۔

اسٹیشن ماسٹر نے ہمیں اسٹیشن کے ساتھ ہی کسی گاؤں میں واقع اپنے گھر لے جانا چاہا مگر کمال نے بمشکل یہ کہہ کر ٹالا کہ پھر کبھی آپ کے پاس حاضر ہوں گے ابھی ہم صرف ایک دن کے لئے یہیں اسٹیشن پر رکنا چاہتے ہیں۔

اس نے وہیں اسٹیشن پر ہی ایک ریسٹ روم کھلوا دیا، رات کوئی آٹھ بجے سخت سردی میں ہم کھانا کھا کر لیٹ گئے تھے۔ میرے فون کی گھنٹی بجی وہی مترنم آواز آئی۔

"مجھے امید تھی دوست تم ضرور آؤ گے...... اب میری کہانی سنو۔"

چار سال پہلے کی بات ہے...... ہمیں نور پور سے تیس کلو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے گاؤں "گوٹھ گوٹھ" میں اپنی خالہ کی شادی میں فیصل آباد جانا تھا میرے ساتھ میرے ابا اماں اور چھوٹا بھائی بھی تھا۔ ہم لوگ شادی کے بعد واپس آ رہے تھے کہ ہماری بوگی میں بدمعاش قسم کے آدمی چڑھ گئے وہ مجھے بری نیت سے دیکھ رہے تھے۔ رات کے وقت جب سب سو گئے تو انہوں نے رومال میں بے ہوش کرنے والی دوائی کے ذریعے سب کو بے ہوش کر دیا اور مجھے اٹھا کر قریبی اسٹیشن نور پور اتر گئے۔ مجھے ہوش آیا تو پتہ چلا کہ وہ علاقے کے ایک چوہدری کے بیٹے اور بھتیجے ہیں اسٹیشن بالکل سنسان تھا رات کا کوئی ایک بجا ہوگا۔ جب انہوں نے میرے ساتھ زیادتی کرنا چاہی تو میں پاس پڑی ایک لکڑی سے ان میں سے ایک کا سر پھاڑ دیا۔ میرا وار اتنا شدید تھا کہ وہ وہیں بے ہوش ہو گیا۔ دوسرے کو میرا وار اچٹتا سا لگا۔ اس پر اس نے اپنی ٹانگ سے بندھا ہوا ایک خنجر نکالا اور میرے سینے میں گھونپ دیا اور میں وہیں گر گئی۔

اس کے بعد میں نے دیکھا وہ میری لاش کے پاس کھڑا ہے، میں اس کے برابر میں کھڑی تھی مگر وہ مجھے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

اس نے سب سے پہلے اپنی زخمی ساتھی کی مرہم پٹی کی پھر وہ دونوں مجھے لے کر پلیٹ فارم سے آگے لے گئے جہاں ان دنوں کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا اور بڑے بڑے گڑھے کھدے ہوئے تھے۔ ان دونوں نے میری لاش کو اس میں ڈالا اور مٹی برابر کر دی، میری لاش کے ساتھ ہی میرے قاتل نے اپنا خنجر بھی وہیں پھینک دیا میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ مگر کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ آؤ میں تمہیں وہ جگہ دکھاؤں۔"

میں نے جلدی سے کمال کو، جو منہ کھولے مجھے فون پر صرف ہاں ہوں کرتے دیکھ رہا تھا پوری کہانی سنائی اور گرم جیکٹ پہن کر باہر نکل آئے۔

اسٹیشن پر بالکل ہو کا عالم تھا۔

ہم پلیٹ فارم پر پہنچے تو ہمیں دور ایک سفید سا سایہ دکھائی دیا، ہم اس کے پاس پہنچے تو وہ پلٹ گئی اور ہم اس

کے پیچھے چل پڑے، میرا خوف کے مارے برا حال تھا مگر کمال نہایت بے خوفی سے ہاتھ میں ایک طاقتور ٹارچ لئے چل رہا تھا۔

پلیٹ فارم کے پکے فرش سے اتر کر اب وہ زمین پر چل رہی تھی جو صبح کی بارش کے باعث ابھی تک گیلی تھی، وہ عورت یا روح ایک جگہ جا کر رک گئی۔

زمین پر ایک جگہ اشارہ کرنے لگی۔

ہم جب اس جگہ پہنچے تو وہ آگے بڑھ گئی۔

کمال نے اسے آواز دی۔

سنیے! "محترمہ ایک منٹ سنیے۔"

مگر وہ رکی نہیں۔ نہ ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ چلتی گئی۔ اور اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

ہم تیزی سے اس جگہ پہنچے۔

کمال بیٹھ کر اس جگہ کا معائنہ کرنے لگا۔

پھر اس نے قریب پڑی ہوئی ایک لکڑی اٹھائی اور اس جگہ نشانی کے طور پر گاڑ دی۔

اپنے کمرے میں آ کر کمال نے تھرماس میں سے گرم گرم چائے نکالی پھر کہنے لگا۔

"یار تمہاری دوست تو صرف فون پر ہی لمبی لمبی باتیں کرتی ہے۔ سامنا ہوا تو بالکل چپ۔ بڑی شرمیلی لگتی ہے۔" میں ابھی تک خوف زدہ تھا، کیا جواب دیتا۔

ساری رات خوف کے باعث نیند نہ آئی تھی۔ صبح سویرے اٹھ کر اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سارا قصہ بتا دیا۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا جیسے کہ انہوں نے اس کہانی پر یقین نہیں کیا ہو۔

پھر بھی انہوں نے قریبی تھانے سے دو سپاہی اور مزدور منگوا لئے۔ اور ہم سب مل کر رات والی جگہ پہنچ گئے۔

مزدوروں نے وہ جگہ کھودنی شروع کر دی۔

کچھ دیر بعد ہی مٹی میں کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا اور بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس ایک ڈھانچہ نظر آیا۔ اس کے پاس ہی ایک لمبے پھل والا زنگ آلود خنجر بھی پڑا تھا خنجر نہایت نفیس لکڑی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اس پر نہایت خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ایک سپاہی اس کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔

کمال نے اس سے پوچھا کہ "کیا وہ اس خنجر کو پہچانتا ہے؟"

تو اس نے بتایا یہ تو بڑے چوہدری صاحب کا خاندانی خنجر لگتا ہے۔"

مختصر یہ کہ پولیس پارٹی نے چوہدری صاحب کے گھر چھاپہ مارا۔ ان کا بڑا بیٹا چوہدری اکمل لڑکی کا قاتل نکلا۔ اس نے فوراً ہی اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ کیونکہ اس کے مطابق اس لڑکی کی روح اس کو بھی کافی عرصے سے تنگ کر رہی تھی اور وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔

پھر ہم پولیس پارٹی کے ساتھ لڑکی کے گھر گئے اس کی لاش یا ہڈیوں کا پنجر اس کے لواحقین کے حوالے کیا اور انہوں نے اسے کفنایا، نماز جنازہ پڑھی اور گاؤں کے قبرستان میں اسے دفنا دیا۔ ان سب معاملات کے بعد ہم واپس اسٹیشن آ گئے۔ اس دوران اس لڑکی کا فون نہیں آیا۔

اسٹیشن ماسٹر کے بے حد اصرار کے باوجود ہم نے مزید رکنے سے انکار کر دیا اور انہوں نے ہی ہمیں گاڑی رکوا کر ہمیں اس میں بیٹھا دیا۔

میں اور کمال بوگی کے دروازے پر کھڑے تھے ہماری نظریں اس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

اچانک اسٹیشن کی عمارت کے ایک ستون کے پیچھے سے وہ سامنے آ گئی اور میرا فون بجنے لگا، میں نے اس کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے فون کان سے لگا لیا۔

"شکریہ میرے دوست۔ تم نے واقعی دوستی نبھائی، تمہارے دوست کا بھی شکریہ۔ اچھا اب میں جا رہی ہوں۔ مجھے سکون دینے کا بہت شکریہ۔"

میرا فون بند ہو گیا اور وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے ہماری گاڑی سے دور ہوتی چلی گئی۔ ہم دونوں بھی آخر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔

بعد ازاں میں نے اپنے فون میں ریل گاڑی گرل کا نمبر تلاش کیا تو مٹ (DELETE) ہو چکا تھا۔

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 112

وہ وقتی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

دنگل جیتنے کے بعد بالی کی ستائشی نگاہیں چاروں طرف سرگرداں تھیں اور دیکھی نہیں اس پر مزید گھبراہٹ بھی طاری تھی کیونکہ وجو بابا کہیں بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ بالی کی خواہش تھی کہ کشتی جیتنے پر اسے جو میڈل ملا تھا اسے وہ وجو بابا کے گلے میں ڈالنا چاہتا تھا کیونکہ وجو بابا کی ہی محنت اور مدد سے وہ کشتی کا دنگل جیت گیا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی بالی وجو بابا کو تلاش نہ کرسکا تھک ہار کر وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو چارپائی پر ایک رقعہ پڑا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔ "بیٹا بالی...... مجھے از حد خوشی ہے کہ تم یہ دنگل جیت جاؤ گے اور مجھ سے زیادہ کون خوش ہوگا کیونکہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ اب تم عقل و شعور سے کام لینا دوست دشمن میں تمیز رکھنا، ہوسکتا ہے کہ اب ہماری ملاقات نہ ہوسکے کیونکہ میرا ازلی دشمن زالوسا نے مجھے پابند کردیا ہے اور وہ مجھ پر حاوی ہوجائے اور مجھے ایک حد میں رہنے پر مجبور کردے، اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہوسکتا ہے ہماری ملاقات دوبارہ ہوجائے، اپنا خیال رکھنا۔" وجو بابا۔ رقعہ پڑھ کر بالی پریشان ہوگیا اور پھر اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وجو بابا، میں آپ کو ضرور زالوسا کی قید سے نجات دلاؤں گا۔ ایک دن جنگل میں تین دوست مچھلی کا شکار کھیلنے گئے وہاں پر جھیل میں انہیں ایک لاش تیرتی ہوئی ملی جسے دیکھ کر وہ پریشان ہوگئے۔ راستے میں کسی نے پولیس کو خبر کردی کہ فلاں جنگل میں ایک لاش پڑی ہے، جب پولیس وہاں پہنچی تو واقعی لاش موجود تھی۔ خیر ان تینوں دوست میں سے دو پکڑے گئے، پولیس کو ان دونوں پر شک تھا کہ انہوں نے ہی اس کو قتل کیا ہے۔ اس لاش کو لاکر سرد خانے میں رکھ دیا گیا۔ ادھر بالی کو خبر ملی کہ تمہاری رپورٹ کے مطابق تمہارے استاد وجو بابا کی وہ لاش ہے تو بالی بھاگا بھاگا سرد خانے میں پہنچ گیا اور لاش پر نظر پڑتے ہی دہل گیا کیونکہ وہ لاش واقعی وجو بابا کی تھی...... "بابا......" بالی کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لیکن جیسے ہی وہ لاش پر جھکا...... لاش کے دونوں ہاتھ اٹھے اور بجلی کی سرعت سے بالی کے گرد حمائل ہوگئے۔ ساتھ ہی ایک دہشت ناک بھیانک قسم کا قہقہہ سرد کمرے میں گونج کر رہ گیا۔ وہ قہقہہ بھی اس لاش کے حلق سے برآمد ہوا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

راحیل اور طارق آخر کار تھانے پہنچ گئے۔ جب انہوں نے کامران سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو کانسٹیبلوں نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"تم لوگ کون ہو......؟" سوال پوچھا گیا۔

"ہم...... کامران کے دوست ہیں......" راحیل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

دونوں کوشش کررہے تھے کہ خود کو پرسکون رکھ سکیں۔

"ہوں......" ایک نے ہنکارا بھرا۔ "تو تم لوگ اسی گروپ سے تعلق رکھتے ہو......؟"

"کون سا گروپ......؟ ہمارا گروپ صرف دوستی کا ہے...... اور کسی چیز سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے......!" طارق بھی بول اٹھا۔

بہرحال اسی قسم کے چند جملوں سے گزرنے کے بعد انہیں کامران سے ملنے کا موقع مل سکا۔

دونوں اس کا حال دیکھ کر افسردہ ہوگئے، بے چارے کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

اسے ابھی تک کسی قسم کے ریمانڈ میں تو نہیں لیا گیا تھا، لیکن تھانے کا ماحول بھی کسی شریف آدمی کے لئے روح فرسا ہی ہوتا ہے۔

انہیں دیکھ کر کامران کی بجھی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی چمک نمودار ہوگئی وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم لوگ...... آ گئے......؟"

"ہاں کامران......" راحیل کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ اس نے سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ ڈال کر کامران کا ہاتھ تھام لیا۔

"دوست کے بغیر کیا مزہ...... ! تم کو اس حال میں چھوڑ کر ہم کہاں رہ پاتے...... اور اب ہم تم کو اپنے ساتھ ہی لے کر جائیں گے۔"

"سچ......" کامران کے منہ سے نکلا۔

طارق نے جھٹ سے راحیل کی شکل دیکھی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ "ہم کامران کو کیسے لے کر جائیں گے......؟"

"تم نے کچھ کھایا پیا بھی......؟" راحیل نے دوبارہ کامران کو مخاطب کیا۔

"نہیں بھائی......" کامران بولا۔

"کیوں......؟"

"دل ہی نہیں چاہ رہا......" کامران نے جواب دیا۔

پھر وہ لوگ اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ انہیں عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اور بے ساختہ وہ لوگ ادھر متوجہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

یہ سب کچھ چند تانیے میں ہوا تھا۔

اس جگہ...... جہاں چاروں طرف مردہ جسموں کا انبار لگا ہوا تھا، جہاں کونے کونے میں ہیبت ناک خاموشی طاری تھی۔

اس سکوت کو توڑ دینے والا یہ قہقہہ خود بھی کم بھیانک نہیں تھا اور پھر اس مردہ جسم نے جس طرح مانی کو جکڑا تھا......!

یہ منظر نہ تو انچارج سے برداشت ہو سکا اور نہ ہی انسپکٹر دلاور سے...... دونوں کے حلق سے خوف کے مارے چیخیں بلند ہوئیں اور وہ دروازے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے...... لیکن یہ کیا......؟

دروازہ تو لاک تھا...... کوشش کے باوجود نہ کھل سکا۔ دونوں نے وحشت زدہ ہو کر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

ادھر مانی کا جو حال تھا اسے وہ خود ہی بہتر جان سکتا تھا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ وحشت کے مارے لگ رہا تھا کہ جیسے دل سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔

اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کا دل ہی کام کرنا چھوڑ دیتا۔ وجو بابا کا مردہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا، دفعتاً اس مردے کے ہونٹ ہلے۔

"اب تو بچ کر کہاں جائے گا......؟ میں تیرا وجو بابا نہیں ہوں...... میں زالوشا ہوں...... تیرا دشمن...... تیرے استاد کا دشمن......"

مانی کے ذہن میں جھماکہ سا ہوا...... یہ نام تو اسے خود وجو بابا نے بھی بتایا تھا۔

زالوشا کی گرفت آہنی تھی، مانی کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

عین اسی وقت کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"مانی بیٹا...... گھبراؤ مت...... ہمت رکھو...... اور اس سے مقابلہ کرو...... اپنا مخصوص داؤ لڑاؤ۔"

آواز جانی پہچانی سی تھی۔ مانی نے چونک کر نظریں گھمائیں۔ لیکن آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔

ادھر انسپکٹر دلاور اور انچارج ابھی تک دروازہ پیٹ رہے تھے۔ لیکن وہ کھل نہیں رہا تھا۔

اس آواز میں کوئی جادوئی اثر تھا۔ مانی کو یوں لگا جیسے اس کے جسم میں کوئی انجانی طاقت سرائیت کر گئی ہو۔

"تو...... تم وجو بابا نہیں ہو......؟" اس نے اپنی ہمت کو مجتمع کر کے پوچھا۔

"نہیں......" زالوشا کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ "میں روپ بدل لیتا ہوں۔ اور لوگوں کو خوف زدہ کر کے مارنے میں مجھے مزہ آتا ہے...... دیکھ تجھے لانے والوں کا کیا حال ہے ہاہا......"

زالوشا کا اشارہ مانی کے ساتھیوں کی طرف تھا۔ لیکن وہ انہیں کیسے دیکھتا، اس کی گردن پر تو زالوشا کی گرفت تھی۔

"وہ آواز کس کی تھی.....؟" یہ سوچنے کا مانی کے پاس قطعی وقت نہیں تھا۔

اس نے اپنی طاقت صرف کرکے بایاں ہاتھ گھمایا اور زالوشا کی گردن میں اپنی کہنی کی قینچی بنالی..... یہ تھا داؤ.....!

زالوشا کی آنکھوں میں شدید حیرت کے دیئے صرف چند لمحوں کے لئے جل اٹھے اور پھر بجھ گئے۔

اگلے ہی لمحے اس نے اپنے جسم کو زور سے جھٹکا، مانی اس جھٹکے کی تاب نہ لاسکا اور دور ہی ہوگیا۔

زالوشا نے اس پر ایک وحشیانہ چھلانگ لگائی، لیکن مانی پلٹنی کھا چکا تھا نتیجہ یہ کہ زالوشا نے منہ کی کھائی۔

ادھر مقابلہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف اب انسپکٹر ولاور اور مردہ خانے کا انچارج دروازے کو چھوڑ کر حیرت بھری آنکھوں سے یہ خون ریز تماشہ دیکھ رہے تھے۔

شاید زندگی میں کبھی انہوں نے ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔

مانی پھرتی سے اٹھا اور زالوشا کے سینے پر سوار ہوکر اس کے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"اب تم بتاؤ.....؟ میرے ہنو بابا کہاں ہیں.....؟"

"مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے....." زالوشا لاپروائی سے بولا۔ "ویسے ایک بات ماننا پڑے گی۔ اس نے تم پر بہت محنت کی ہے..... ورنہ.....تم ایک ہی لمحے میں لمبے لیٹے ہوتے....."

مانی کے لئے شدید مشکل ثابت ہو رہا تھا کہ وہ زالوشا کو اپنی گرفت میں رکھ سکے۔

عین اسی وقت وہی سرگوشی اس کے کان میں گونجی۔

"اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لو۔"

فوراً ہی مانی نے اس سرگوشی پر عمل کر ڈالا۔ اگلا لمحہ حیرت انگیز ثابت ہوا۔ کیونکہ زالوشا ہکا بکا رہ گیا تھا اور اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہوگئے۔

"میرے.....بال چھوڑ دو....." وہ چیخا۔

دفعتاً انسپکٹر دلاور کو اپنی پستول کا خیال آیا۔ اس نے فوراً ہی ہولسٹر میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لی۔

اب شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ گولی کس طرح چلائے۔ زالوشا کو نشانہ بنانے کے چکر میں مانی بھی لپیٹ میں آسکتا تھا۔

ادھر وہ دونوں اب بھی ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔

"نہیں چھوڑوں گا....." مانی بھی گرجا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ ہنو بابا کہاں ہیں؟"

"میں نے کہا نا مجھے نہیں معلوم....." زالوشا نے بھنائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "آخری بار اس سے وہیں ملاقات ہوئی تھی، جہاں تم نے پہلوانی کا مقابلہ جیتا تھا.....کیمپ میں....."

"اوہ....." مانی کے منہ سے نکلا۔ "کیمپ میں آگ کیوں لگی تھی.....اور وہ راکھ کا انبار.....؟"

"وہ جادوگری کا کھیل تھا....." زالوشا تکلیف میں بھی مسکرایا۔ "ہمارے جادوئی چلوں میں آگ لگ گئی تھی۔ اتنی راکھ تو ہونا تھی..... یہ اسی بدبخت انکش کا کام تھا.....مجھ سے بحر گیا تھا وہ....."

"سونی جھیل میں راکھ کس نے ڈلوائی تھی.....؟" مانی نے سوال کیا۔

"پہلے میرے بال چھوڑ دو.....پھر بتاؤں گا۔"

"ایسے ہی بتاؤ....." مانی نے بالوں کو جھٹکا مارا۔

"تم حد سے بڑھ رہے ہو....." زالوشا غرایا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "تم کو میرے بالوں کے بارے میں اسی خبیث نے بتایا ہوگا..... آہ..... چھوڑو میرے بال۔"

"میری بات کا جواب دو....." مانی نے اس کا جملہ یکسر نظرانداز کردیا۔

"میں نے ہی ڈلوائی تھی....." زالوشا نے بتایا۔ "کیونکہ کوئی بھی جسم اختیار کرنے کے لئے مجھے کھارے پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں....." مانی الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

’’تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔‘‘ زالوشا نے دانت کسکسائے۔

’’مجھے بتاؤ کہاں ہیں وجو بابا......‘‘ مانی نے سوال کیا۔

زالوشا کے بال اب تک اس کی مٹھی میں تھے۔

’’وہ میری قید میں ہے......‘‘ زالوشا نے انکشاف کیا۔ اور اب وہ زندگی کی آخری سانس تک میری قید میں رہے گا۔

’’ایسا نہیں ہوگا......‘‘ مانی کی آواز غصے میں بلند ہوگئی۔ ’’میں انہیں تمہاری قید سے نکالوں گا۔ آزاد کراؤں گا ان کو......‘‘

’’اچھا......!‘‘ زالوشا نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی، پھر زرا سا ہنس کر بولا۔ ’’میں انتظار کروں گا...... اگر تم نے اسے آزاد کروالیا تو میری طرف سے انتش کے ساتھ ساتھ انعام بھی دوں گا...... ایسا انعام کہ تم سوچ بھی نہ سکو گے...... میں آج تم کو موت کے گھاٹ اتارنے آیا تھا...... لیکن اب تمہیں مہلت دے رہا ہوں...... یا تو انتش کو ڈھونڈ لینا، یا موت کو گلے لگا لینا۔‘‘

’’میں انہیں......‘‘ مانی نے بولنا چاہا لیکن اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔

اسی وقت ایک دھماکہ ہوا، اور بے ساختہ مانی کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔

زالوشا کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے چشم زدن میں اپنے بال چھڑا لئے۔

انسپکٹر ولاور نے جھٹ سے اپنے ریوالور سے دوسرا فائر جھونک مارا صاف، دیکھا گیا کہ گولی زالوشا کے بازو پر لگی تھی۔

لیکن عین اسی وقت اس کے ارد گرد دھواں پھیل گیا۔

اس دھوئیں میں اتنی شدت تھی کہ مانی، انچارج اور انسپکٹر ولاور بری طرح کھانسنے لگے۔

ساتھ ہی زور سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

تینوں گرتے پڑتے اپنے اندازے سے دروازے کی طرف بھاگے۔

باہر والوں نے اب اس طرف توجہ دی تھی، جب مانی وغیرہ بدحواسی کے سے عالم میں باہر نکلے تھے۔

مردہ خانے کا عملہ مجسمہ سوال بنا ہوا تھا، دھوئیں کا مرغولہ اب باہر نکل رہا تھا۔

’’میں تم لوگوں کو آوازیں دے رہا ہوں......‘‘ انچارج ان لوگوں پر برس پڑا۔ ’’دروازہ پیٹ رہا ہوں...... اور تم لوگوں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی...... کہاں سوئے ہوئے تھے تم لوگ......؟‘‘

’’ہم سوئے کہاں تھے جناب......‘‘ عملے کا ایک آدمی گھبرا کر بولا۔ ’’ہمیں تو نہ تو آپ کی آواز آئی اور نہ دروازہ پیٹنے کی......‘‘

’’کیا کہہ رہے ہو......‘‘ انچارج حیران رہ گیا۔ ’’ایسا کیسے ہوسکتا ہے......؟‘‘

’’آپ ان لوگوں سے پوچھ لیں......‘‘ وہ آدمی دوسرے لوگوں کی طرف اشارہ کرکے بولا۔

سب نے ہی اس کی سچائی کی گواہی دی۔

’’اندر کیا ہوا ہے......؟‘‘ اس آدمی نے پوچھا۔

’’دھواں کیوں نکل رہا ہے انچارج صاحب......؟‘‘

’’ابھی دیکھتے ہیں......‘‘ انچارج نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ’’زرا صبر کرو...... یہ بتاؤ کہ اب کس نے کھولا تھا دروازہ......؟‘‘

’’آپ نے خود ہی کھولا ہوگا...... ہم میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں ہے۔‘‘

یہ سن کر انچارج ان دونوں کی شکل دیکھنے لگا۔

کچھ باتیں راز میں ہی رہ گئیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دھواں خود بخود ختم ہوگیا۔

اور وہ دھواں اسی وقت ظاہر ہوا تھا جب انسپکٹر ولاور نے زالوشا پر گولی چلائی تھی۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ زالوشا مزید گرفت میں آجائے، لیکن ہوا بالکل برعکس۔

وہ دھواں اس کی کوئی جادوگری تھی، کیونکہ دھواں

چھتا تو وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔

"اوہ......" مالی چونکا۔ "ہم لوگوں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی، وہ یقیناً اسی نے کھولا ہوگا۔"

"کیا آپ اس کو جانتے ہو......؟" انسپکٹر دلاور نے پوچھا۔

"زیادہ نہیں...... بس نام ہی سنا تھا......"

"کیا چیز تھی وہ......؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا......"

"مجھے تو کوئی بھوت پریت لگ رہا تھا......" انسپکٹر نے جھرجھری سی لی۔ "کس طرح اس نے ایک مردے کا روپ بھرا تھا۔"

"اور......" مالی مسکرایا۔ "آپ نے تو اس کے قاتل کو بھی جیل میں بند کر رکھا ہے۔"

انسپکٹر نے چونک کر اسے دیکھا، پھر کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بغلیں جھانکنے لگا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، اس نے تو محض اپنی جیب گرم کرنے کے لئے اسے حوالات میں بند کیا تھا...... تاکہ کچھ "لک مکا کر" اپنا کام نکال لے۔

ورنہ اسے بھی اندازہ تھا کہ کامران نامی لڑکا شریف ہے۔

☆......☆......☆

تینوں ادھر ہی متوجہ تھے، پھر انہوں نے دیکھا کہ پولیس والوں کے درمیان میں ایک دراز قد کا خوب صورت سا نوجوان چلتا ہوا ان ہی کی طرف آ رہا تھا۔

وہ نوجوان کافی مضبوط اور توانا جسم کا مالک تھا، راحیل کو پہلی ہی نظر میں وہ دیکھا بھالا سا لگا۔

ان کے قریب آ کر وہ اپنے ساتھ آنے والے پولیس والوں کی طرف گھوم گیا۔

"جی انسپکٹر صاحب......!" وہ بولا۔ "یہی ہے وہ لڑکا......؟"

اس کا اشارہ کامران کی طرف تھا...... کامران کا دل دھڑک اٹھا نہ جانے وہ کون تھا......!

"جی ہاں......" ایک نے آگے بڑھ کے جواب دیا۔ یہ انسپکٹر دلاور تھا۔

"تو پھر اس بے چارے کو آزاد کر دیں...... جب مردہ ہی بھاگ کھڑا ہوا تو پھر......"

"جی ہاں...... بالکل......" انسپکٹر دلاور نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔

پھر کامران کو فوری طور پر حوالات سے نکالا گیا، تینوں دوست ایک دوسرے سے گلے ملے، جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔

پھر باہر نکلتے ہوئے کامران نے نوجوان سے پوچھا۔

"آپ کون ہیں جناب......؟"

وہ آہستہ سے مسکرایا اور بولا۔

"میرا نام...... مالی ہے...... میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ کسی حد تک میری ہی وجہ سے تم کو حوالات کا منہ دیکھنا پڑا...... اسی لئے میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ تم کو یہاں سے نجات مل جائے۔ ٹھیک ہے ناں......؟"

ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، راحیل کے منہ سے نکلی ہوئی بات پوری ہو رہی تھی اور کامران اب ان کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔

"جان بچی سو لاکھوں پائے......" طارق نے طویل سانس لے کر کہا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے......؟" کامران نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔ "میں بدھو ہوں......؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے......" طارق کے انداز میں حیرت تھی پھر وہ راحیل کی طرف مڑا۔ "کیوں راحیل...... میں نے کامران کو بدھو بولا ہے کیا......؟"

"بولا تو نہیں......" راحیل نے سر ہلایا۔ "مگر بولنے والے تھے...... یہ اور بات ہے کہ تم بولتے بولتے رک گئے کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے......"

"اچھا چھوڑو......" طارق جلدی سے بولا۔ "یہ بتاؤ کہ اس لاش کا......؟"

’’ارے......‘‘ اچانک راحیل چلتے چلتے رک گیا۔

’’کیا ہوا......؟‘‘ دونوں نے بیک وقت پوچھا۔

’’اب مجھے یاد آ گیا ہے......‘‘ راحیل بڑبڑایا۔ ’’میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے دیکھا بھالا لگ رہا تھا...... آخر وہ ہے کون......؟‘‘

’’تم کس کی بات کررہے ہو......؟‘‘ کامران نے پوچھا۔

’’جو تھانے میں ملا تھا......‘‘

’’اچھا...... کون تھا وہ......؟‘‘

’’وہ یقیناً مانی تھا...... مایہ ناز پہلوان...... مانی......!‘‘

’’اوہ......‘‘ دونوں کے منہ سے نکلا۔

اب وہ لوگ کامران کے گھر کے قریب آ چکے تھے۔ یعنی چند لمحوں بعد کامران کے گھر والوں کی پریشانی ختم ہونے والی تھی۔

☆......☆......☆

زالوشا اس وقت عجیب و غریب قسم کے لباس میں تھا۔ اگر اسے دور سے دیکھا جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے ایک چھوٹی سی سیاہ رنگ کی چٹان متحرک ہوگئی ہو۔

اس کے جسم پر کالے رنگ کا لباس تھا، جس میں باقاعدہ ایک کنٹوپ بھی تھا۔ جسے اس نے اپنے سر پر جمار کھا تھا۔

رات اپنی عروج پر تھی...... چاروں طرف گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی...... کبھی کبھی کسی جنگلی جانور کی آواز گونجتی اور پھر پر سکوت فضا متحرک کررہ جاتی۔

یہاں کوئی موذی کیڑا یا کوئی خونخوار درندہ بھی موجود ہو سکتا تھا...... لیکن زالوشا ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اس جنگل میں وہ آنکھیں بند کر کے بھی چل سکتا ہے۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون کسی چھری کی لکیر کی طرح ثبت تھا۔

اسی طرح درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ ایک ایسی جگہ آ پہنچا، جہاں درختوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ موجود تھی۔

یہ ایک کھوہ تھی...... کیونکہ اس سے آگے پہاڑی سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ دائیں جانب ایک چھوٹی سی جھیل موجود تھی۔

زالوشا نے کھوہ کے قریب پہنچ کر اس کھوہ میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز ٹٹول کر نکالی اور پھر اسے اسی کھوہ کے سرے پر رگڑا۔

فوراً ہی چنگاریاں سی اڑیں، یہ شاید کسی درخت کی ٹہنی تھی جو یک بیک کسی مشعل کی طرح اس کے ہاتھ میں روشن ہوگئی تھی۔

زالوشا فوراً ہی اس کھوہ میں اتر گیا۔

یہ کھوہ اندر سے بے حد کشادہ ثابت ہوئی...... بالکل کسی بڑے غار کی طرح...... زالوشا زیرلب کچھ پڑھ رہا تھا...... وہ آگے بڑھتا رہا۔

جب یہ غار مزید کشادہ ہوا تو 2 راہوں پر تقسیم ہوگیا...... زالوشا نے بائیں جانب والے راستے کا رخ کیا۔

یہ راستہ کافی تنگ تھا...... لیکن چند قدم چلنے کے بعد ہی ایک کمرہ نما جگہ سامنے آ گئی...... زالوشا اس میں داخل ہوگیا۔

’’ٹرچ...... ٹرچ...... ٹرچ......‘‘

عجیب و غریب قسم کی آوازوں سے کمرہ گونج اٹھا...... یوں لگ رہا تھا جیسے کسی جانور کے نوزائیدہ بچے نے اپنے حلق سے آواز نکالی ہو۔

زالوشا کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے۔ اس نے بائیں جانب گھوم کر مشعل ایک کونے میں کسی چیز پر اٹکائی اور آگے قدم بڑھا دیئے۔

یہاں ایک کونے میں چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس چٹائی کے بالکل سامنے کھوہ کی دیوار میں ایک بڑا سا سوراخ تھا۔

’’ٹرچ...... ٹرچ...... ٹرچ......‘‘

ایک بار پھر آوازیں ابھریں اور یہ آوازیں اسی سوراخ سے آرہی تھیں۔ زالوشا کے چہرے پر مرعوب ہوجانے والے تاثرات واضح دکھائی دے رہے تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت کسی مقدس معبد خانے میں آگیا ہو۔

وہ چٹائی پر جا بیٹھا...... اس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں...... مشعل کی روشنی میں دیوار پر پڑنے والا زالوشا کا سایہ کافی ہیبت ناک دکھائی دے رہا تھا۔

وہ کافی دیر تک کچھ پڑھتا رہا اور پھر یک لخت اس نے اپنا سر زمین پر ٹکا دیا۔

یوں جیسے وہ کسی کی تعظیم میں سرنگوں ہوگیا ہو۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دفعتاً کسی چیز کے زمین پر گرنے کی آواز گونجی، اور پھر چند ہی لمحوں بعد زالوشا کو اپنے سر کے بالوں پر کسی کے پنجے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔

زالوشا نے چند طویل سانس لیے، لیکن وہ اب بھی اسی حالت میں پڑا رہا، پھر اس کے ہونٹ ہلے۔

"مقدس شابولا......! مقدس شابولا......!"

اس کے ساتھ ہی زالوشا کے سر پر پنجوں کی گرفت کچھ اور بھی سخت ہوگئی۔ لیکن وہ بدستور اسی حالت میں پڑا رہا۔

پھر اس کے ہونٹ دوبارہ ہلے۔

"اے مقدس شابولا......! مجھے معاف کردے...... مجھے معاف کردے...... مجھ سے ضرور کوئی غلطی ہوگئی ہے...... میں اپنی اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں...... مجھے تو اپنی پناہ میں لے لے...... میں تیری پوجا میں، تیری طاقت کے سائے میں اور تیرے منتروں کی چھاؤں میں اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہوں...... تو مجھے اپنی طاقت دے دے...... تو مجھے اپنی شکتیوں کا حصہ بنالے...... میں تیرا تابع ہونا چاہتا ہوں، تاکہ پھر ہر جادو اور ہر ایک منتر میرے تابع ہوجائے...... اے الٹے ہاتھ والے راستے کے راہبر......! مجھے اپنی ذات میں شامل کرلے...... جو تیرا کتن ہے، وہی میرا کتن ہے...... تو برائی اور بدی کا شہنشاہ ہے...... اور میں بھی تیرے ہی قدموں کے نشانوں پر اپنے قدم رکھنا چاہتا ہوں...... آہ...... مقدس شابولا...... مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دے دے۔"

بولتے بولتے اس کی آواز دھیمی ہونے لگی اور پھر بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہوگئی، کھوہ کی دیوار پر لرزنے والا سایہ اب پوری دیوار پر پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

اس واقعہ کے بعد مانی کی انسپکٹر دلاور سے کافی حد تک اچھی گٹھ جوڑ ہوگئی تھی۔

انسپکٹر دلاور نے اسے دینو بابا کی بازیابی کے لئے بار بار تسلی بھی دی تھی اور کہا تھا۔ "آپ بالکل فکر مت کرو مانی صاحب......" اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا تھا۔ "بہت جلد آپ کے بابا کو میں ڈھونڈ نکالوں گا......"

"بس مجھے فکر یہ ہے کہ...... کہیں وہ کسی مشکل میں نہ پڑے ہوں۔" مانی بولا۔

"ویسے وہ بندہ تھا کون......؟" انسپکٹر دلاور نے پوچھا۔ "جس نے تمہارے بابا کا روپ دھارا تھا۔؟"

"میں بذات خود اس سے واقف نہیں ہوں......" مانی نے گول مول جواب دیا۔" دینو بابا خود بھی کسی زمانے میں پہلوانی کے گروپ کے ماہر تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک سرکس کے گروپ میں بھی حصہ لیا تھا۔"

"یعنی انہیں شعبدے بازی بھی آتی تھی......؟" انسپکٹر دلاور نے پلکیں جھپکائیں۔

"یہی سمجھ لو......" مانی نے طویل سانس لی۔ "اور چونکہ وہ میرے استاد تھے اس لئے میری اس جیت سے متنفر ہوکر کسی مخالف نے یہ گھٹیا حرکت کی ہے۔"

"کیا آپ کسی مخالف کا نام لے سکتے ہو......؟" انسپکٹر دلاور نے روایتی انداز میں پوچھا۔ "اگر آپ کسی کا نام بتادو گے تو میرے لئے ذرا آسانی

ہو جائے گی۔"

"اس مقابلے کو دیکھنے والے لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے......" مانی نے جواب دیا۔ "اب میں کس طرح کسی کا نام لوں......؟"

"ہوں......" انسپکٹر بولا اور سوچ میں گم ہو گیا...... پھر تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

"ٹھیک ہے مانی صاحب...... میں آپ سے رابطے میں رہوں گا۔ اور جیسے ہی کسی جانب سے مجھے کوئی اطلاع ملی تو آپ کو ضرور آگاہ کروں گا۔"

مانی نے سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا...... وہ کافی دیر سے تھانے میں ہی موجود تھا۔

اس وقت اسے بھوک بھی ستا رہی تھی۔ آج اس نے صبح کا ناشتہ بھی نہیں کیا تھا...... اکیلے گھر میں اب اس کی یہی روٹین تھی...... کسی وقت کھا لیا...... اور کسی وقت نہیں......!

اس نے سوچا کہ کسی ہوٹل میں کھانا کھا لینے کے بعد کارخانے کا رخ کرے گا۔ ان دنوں وہ اپنا کچھ وقت اپنے مرحوم باپ کے کارخانے میں بھی گزارنے لگا تھا۔

جہاں یوسف علی اسے آہستہ آہستہ اس کاروبار کے معاملات سمجھا دیتا تھا۔ کیونکہ یوسف علی کو اب پوری امید تھی کہ مانی جلد ہی اس کارخانے کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھال لے گا۔

لیکن ابھی کون جانتا تھا کہ مانی کی زندگی میں کتنے موڑ آنے تھے......؟ کتنی کروٹیں تھیں اور کتنے مراحل سے اسے ابھی گزرنا تھا۔

مانی نے تھانے سے نکلنے کے بعد گلنار ہوٹل کی راہ لی......

یہ اس قصبے کا ایک مشہور ہوٹل تھا۔

اس ہوٹل کی ذائقے دار مکس سبزی اس علاقے میں کافی پسند کی جاتی تھی...... مانی نے ایک میز منتخب کی اور کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ اس لئے ہوٹل میں کافی رونق نظر آ رہی تھی۔ تقریباً ساری میزیں آباد تھیں۔

تو ویٹر اس کی طرف بڑھا۔ مانی نے اسے آرڈر دیا اور میز پر رکھے ہوئے گلاس میں جگ سے پانی انڈیلنے لگا۔

اس کی پشت پر دو آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ان کی باتیں وہ صاف طور پر سن سکتا تھا۔

دفعتاً مانی کے کان کھڑے ہو گئے۔

"یار...... پھر بھی ہمیں احتیاط کرنی چاہئے......" ایک آواز ابھری۔ "تم بہت زیادہ لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے...... حد سے زیادہ خود اعتمادی اکثر انسان کو لے ڈوبتی ہے۔"

"تمہارے جسم میں تو کوئی بوڑھی روح گھسی ہوئی ہے......" دوسری آواز آئی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس لائن میں کیوں آئے ہو؟"

"بس...... حالات......" ٹھنڈی سانس بھر کر کہا گیا۔

"تو بھیک ہی مانگ لیتے...... اس سے تو بہتر تھا......" دوسرا بولا تھا۔

جواب میں پہلے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ اتنی دیر میں ویٹر نے مانی کی میز پر کھانا سرو کیا اور سر کو خم کر کے دوسری طرف چلا گیا۔

مانی نے کھانے کا لقمہ لیا۔ لیکن اس کا ذہن اب بھی پچھلی میز پر بیٹھے ہوئے دونوں افراد کی طرف لگا ہوا تھا۔

"آج پھر رات کی جگار ہو گی۔" دوسرے آدمی کی آواز ابھری تھی۔ "لال حویلی میں آج بھی مال اترے گا۔"

"اوہ......" پہلے آدمی کے منہ سے نکلا۔ "تو کیا آج بھی ہم دونوں ہی......"

"دیکھو......" دوسرے نے اس کی بات کاٹی۔ "یہ تو جاگر استاد کی مرضی ہے کہ آج وہ کس کو وہاں بھیجتا ہے۔"

"یہ جاگر استاد آخر ہمارے سامنے کیوں نہیں

آتا......؟" پہلے کے انداز میں شکوہ تھا۔" اس کی کیا وجہ ہے۔"

"جس دن اسے ہم لوگوں پر بھروسہ ہوجائے گا...... وہ ہمارے سامنے ضرور آئے گا۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"یار پہلے پرانے سلاٹر ہاؤس میں مال اترتا تھا۔ وہی جگہ اچھی تھی......" پہلے والے نے شاید منہ بنا کر کہا تھا۔

"کیوں...... لال حویلی میں کیا خرابی ہے......؟" دوسرے نے پوچھا تھا۔

"لال حویلی کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں معلوم......؟" پہلے کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"نہیں......"

"پھر تمہیں معلوم ہی کیا ہے......" پہلے نے جواب دیا۔" لال حویلی پر ایک عرصے سے ایک چڑیل کا قبضہ ہے اور وہاں کئی لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔"

یہ سن کر دوسرے آدمی کے ایک زوردار قہقہہ کی آواز گونج اٹھی اور یہی وہ موقع تھا کہ جب مانی نے گھوم کر ان دونوں کی طرف دیکھا ان میں سے ایک گٹھیلے جسم کا مالک تھا۔ جبکہ دوسرا لمبے قد کا اور دبلا پتلا تھا۔ شکل وصورت سے دونوں ہی اوباش ٹائپ کے دکھائی دے رہے تھے۔

مانی ان پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا وہ دونوں بھی کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چائے پی رہے تھے۔

"اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے جونی......؟"

"یار سونو......! کیا تم واقعی کسی پرانے زمانے کی بوڑھی روح ہو......؟"

"ہاں...... چڑیل......!" جونی نے دوبارہ ہنس کر کہا تھا۔

"اسے لال حویلی میں میرے ماموں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" سونو نے یقین دلایا۔" اور ان کے علاوہ بھی وہ کئی لوگوں کو نظر آئی ہے۔ بعض لوگوں کو وہ صرف پریشان کرتی ہے اور ڈراتی دھمکاتی ہے اور بعض لوگوں کو جان سے بھی مار ڈالتی ہے۔"

"ابے وہ مارتی نہیں ہوگی، بلکہ لوگ وہم اور خوف سے خود ہی مر جاتے ہوں گے۔" جونی کی آواز آئی۔

"تم کو شاید ان باتوں پر بالکل بھروسہ نہیں ہے۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گا۔" سونو نے کہا۔

"یار تم تو جورو کی طرح ناراض ہوگئے...... تم کو آخر کیا سوچ کر جاگر......"

"جونی تم موقع محل بھی دیکھ لیا کرو......" سونو نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔" اس طرح کھلے عام ان باتوں سے پرہیز کرو۔"

"اچھا استاد جی...... اب اٹھ چلو...... مجھے تو اب نیند آرہی ہے...... کل رات بھر جوا کھیلا ہے...... اور اب آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی ہیں۔"

"ہاں...... چلو......!"

پھر دونوں مانی کے سامنے سے گزرتے ہوئے کاؤنٹر پر پہنچے...... ساتھ ہی انہوں نے بل کی رقم دی اور باہر نکل گئے۔

مانی نے بھی زیادہ دیر نہیں لگائی، اس نے بھی ویٹر کی بلند آواز میں بتائی ہوئی رقم ادا کی اور خود بھی ہوٹل سے نکل آیا۔

جونی اور سونو باتیں کرتے ہوئے پیدل ہی ایک جانب قدم اٹھا رہے تھے۔ مانی مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑا۔

دراصل ان دونوں کی باتوں نے ہی اسے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ ان کے چند جملوں سے ہی مانی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ دونوں کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے تھا۔

لال حویلی...... مال کی آمد اور پھر جاگر استاد کا نام...... یہ تثلیث اسی بات کو ظاہر کر رہا تھا۔

حالانکہ مانی نہ تو لال حویلی سے واقف تھا اور نہ ہی جاگر استاد سے...... لیکن تجسس نے اسے ان دونوں کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیچھا کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

سڑک کراس کرنے کے بعد فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جونی اور سونو ایک گلی میں داخل ہوگئے۔

یہاں اور بھی لوگوں کی چہل پہل تھی لہٰذا مانی کا بھی اس گلی میں گھس پڑنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

مزید دو گلیاں اور چلانگنے کے بعد وہ دونوں ایک گھر کے دروازے پر آ کر رک گئے، یہ متوسط طبقے کا رہائشی علاقہ تھا...... جس کے آخری سرے پر کچی آبادی بھی واقع تھی۔

مانی ان دونوں سے بے پرواہ ہو کر آگے نکلتا چلا گیا۔ جونی اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دروازے پر لگے ہوئے تالے کی چابی نکال رہا تھا۔

دفعتاً مانی کے کانوں سے جونی کی آواز ٹکرائی۔

"اے لڑکے......! تم ہمارا پیچھا کر رہے تھے......؟"

مانی کے اٹھتے قدم رک گئے، ساتھ ہی وہ ان دونوں کی طرف پلٹ گیا۔

"جی...... آپ نے مجھ سے کچھ کہا......؟" مانی نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

اس کے اعتبار بھرے لہجے پر جونی گڑبڑا کر رہ گیا، خود سونو بھی اسے تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔

"نہیں بھائی ...... تم جاؤ......" سونو نے معذرت بھرے انداز میں کہا۔ "ہم دونوں کو تھوڑی غلط فہمی ہوگئی تھی۔"

"اوکے...... کوئی بات نہیں......" مانی نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا اور جانے کے لئے مڑ گیا۔

مانی کے آگے نکلنے کے بعد سونو، جونی پر برس پڑا۔

"حد کر دی تم نے...... خواہ مخواہ ہی اس بے چارے کو روکا تھا۔"

"مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کافی دیر سے ہمارے تعاقب میں تھا......" جونی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کا انداز...... خیر......!"

"اگر وہ ہمارے تعاقب میں ہوتا تو ہمارے قریب سے کیوں گزرتا......؟" سونو نے کہا۔

"مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ ہوٹل سے ہمارے ساتھ ہی رہا ہو...... اور اب یہاں بھی ہمارے ساتھ آیا ہو......" جونی بولا۔

"اوئے تو یہ کون سا اچنبھے کی بات ہے...... یہ بھی کھانا کھا کر نکلا ہوگا اور...... آگے کہیں رہتا ہوگا۔"

"دفع کرو...... ہوگا......" جونی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

سونو نے اس کی تقلید کی، لیکن وہ اب بھی بولے جا رہا تھا۔

"میں اس لئے کہہ رہا تھا کہ تم خواہ مخواہ اس سے الجھ پڑتے اور پھر یہاں بلاوجہ کا تماشہ کھڑا ہو جاتا...... جو کہ ہمارے لئے سراسر نقصان دہ ہے...... جاگرا استاد کی ہدایات کے مطابق ہمیں یہاں کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں...... مجھے معلوم ہے۔" جونی نے سر ہلایا۔ "چاہے کوئی ہماری گردنوں پر چھری ہی کیوں نہ پھیر دے...... کیوں......؟"

"میں اس بارے میں کیا کہوں......" سونو نے کمرے میں موجود صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اگر میں کچھ کہوں گا تو تم کو برا لگ جائے گا۔"

"نہیں لگے گا......" جونی نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ "تم بولو......!"

"میرے خیال سے جاگرا استاد نے خود کو ہر لحاظ سے محفوظ رکھا ہوا ہے اور ہم لوگ ہر آن خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔"

"یہ تو سب کا ہی اصول ہوتا ہے......" جونی نے لاپروائی سے کہا۔

اب وہ خود بھی صوفے پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ چکا تھا۔

"اور ہمیں زبردستی اس گروہ کا طوق نہیں پہنایا گیا۔" جونی دوبارہ بولا۔ "یہ پھندا ہم نے خود ہی اپنی خوشی سے اپنے گلے میں ڈالا ہے۔"

ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

"یہ کون آ گیا......؟" جونی اٹھتے ہوئے بڑبڑایا۔

پھر وہ دروازے پر پہنچ کر بلند آواز میں بولا۔

"کون ہے بھئی......؟"

"پوسٹ مین......" جواب ملا۔

جونی نے طویل سانس لے کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے واقعی پوسٹ مین اپنی کھٹارا سی موٹر سائیکل پر موجود تھا۔

جونی اس سے واقف تھا، کیونکہ اکثر اس سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ پوسٹ مین نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا اور ساتھ ہی دانتوں کی نمائش بھی کر ڈالی۔

"آج بیرنگ ہے......" ڈاکیے نے گویا اطلاع دی۔

"پھر......؟" جونی نے اسے گھورا۔

"20 روپے...... فقط......!" ڈاکیے کے دانت مزید نمایاں ہو گئے۔

جونی نے منہ بنا کر جیب سے 20 کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ڈاکیہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

خط پر واقعی بھیجنے والے کا پتا موجود نہیں تھا، لیکن اگر پتا ہوتا بھی تو کیا فرق پڑتا۔

جونی اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس خط پر ارسال کرنے والے کا ایڈریس لکھا ہوتا تو وہ فرضی ہوتا...... کیونکہ جونی کو معلوم تھا کہ یہ خط کس نے بھیجا ہے۔

سونو بھی سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جونی نے اس پر ایک نظر ڈالی اور لفافہ چاک کر کے اندر سے پرچہ نکال لیا۔ لکھا تھا۔

"جونی تم اور سونو......! آج پھر لال حویلی...... کیا وہ بجے پہنچ جانا......!"

☆......☆......☆

انسپکٹر دلاور نے ہونٹوں کا دائرہ سا بنایا۔

"لال...... حویلی......!" اس کے منہ سے نکلا۔

مانی کو دوبارہ تھانے میں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی، اور جب اس نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو انسپکٹر دلاور کی آنکھوں میں دبا دبا سا جوش جھلکنے لگا لیکن لال حویلی کا تذکرہ سنتے ہی اس کا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا۔

انسپکٹر دلاور کا ماتحت قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے اپنے افسر کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھیں تو فوراً ہی آگے بڑھ کر بولا۔

"جناب عالی......! اگر آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو...... اس نیک خدمت کے لئے میں حاضر ہوں۔"

انسپکٹر دلاور نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر اکڑتے ہوئے بولا۔

"ہاں...... ٹھیک ہے...... لال حویلی ایک عرصے سے بے آباد اور ویران عمارت ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ بعض عناصر اپنی مجرمانہ کارروائیوں کے لئے اسے استعمال کر رہے ہوں۔"

"یہ لال حویلی ہے کہاں......؟" مانی نے پوچھا۔

"یہ عمارت قصبے کے پرلے سرے پر واقع ہے۔" انسپکٹر دلاور نے بتایا۔ "اور اس کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں...... سنا ہے...... بلکہ لوگوں نے وہاں ایک خوب صورت عورت کو منڈلاتے ہوئے دیکھا ہے...... اور جو شخص اس کے جال میں پھنس جاتا ہے وہ یا تو پاگل ہو جاتا ہے یا پھر...... مر جاتا ہے......"

"اوہ......" مانی نے آہستہ سے کہا۔ "یہ تو کافی سنگین صورت حال ہے۔"

"ہاں......" انسپکٹر دلاور نے سر ہلایا۔

دفعتاً مانی کو ایک خیال آیا، وہ فوراً ہی بول اٹھا۔

"اور...... وہ دونوں کسی جاگرا استاد کا بھی نام لے رہے تھے۔"

"کیا......؟" انسپکٹر دلاور اچھل ہی تو پڑا تھا۔

اس کا ماتحت بھی چونک کر مانی کو دیکھنے لگا۔

"یہ آپ نے کیا نام لے دیا مانی صاحب......؟"

"کیوں......کیا ہوا......؟"

"مجرمانہ سرگرمیوں میں جاگر استاد کا صف اول میں نام آتا ہے......لیکن......وہ چھلاوا ہے۔ وہ اپنے کارندوں سے بھی پوشیدہ رہتا ہے......وہ کہاں ہے؟......کون ہے؟......آج تک یہ سوال ہی ہے......اس کا جواب کبھی نہیں مل سکا۔"

"ہوں......" مانی نے سر ہلایا۔ "آپ لوگ لال حویلی پر چھاپہ مارو......ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا جواب مل جائے۔ بلکہ میرے خیال سے چھاپہ مارنے کے بجائے اس جگہ کی نگرانی کرنی چاہئے......اور ساتھ ساتھ ان دونوں بندوں جونی اور سونو کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے۔"

"ہاں......چونکہ اس معاملے میں جاگر استاد کا نام آرہا ہے۔ اس لئے میں آئی جی صاحب کے سامنے یہ معاملہ رکھ رہا ہوں......پھر ان کا جو فیصلہ ہوگا۔"

مانی نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

سونو اور جونی اپنے وقت مقررہ پر لال حویلی کے علاقے میں پہنچ گئے۔

وہ یہاں ٹیکسی میں آئے تھے اور ذرا فاصلے پر اترنے کے بعد ٹیکسی والے کو کرایہ دیا اور پیدل ہی لال حویلی کی طرف روانہ ہوگئے۔

سردی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی، اس لئے فضا میں ہلکی خنکی موجود تھی ایک چوڑی سڑک کے خاتمے پر ہی ایک کچا راستہ تھا، جس کے دونوں جانب درختوں کے جھنڈ موجود تھے۔

ان ہی درختوں کے درمیان میں موجود تھی لال حویلی......!

جس کے بارے میں کئی پراسرار داستانیں مشہور تھیں۔ لال حویلی کے اطراف میں چار دیواری کھنچی ہوئی تھی، جس کے پھاٹک سے گزرنے کے بعد ذیلی عمارت موجود تھی۔

یہ بے آباد اور ویران کھنڈر جیسی عمارت اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

پھاٹک سے اندر داخل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹارچیں روشن کر لی تھیں۔

"یار جونی......" سونو نے کہا۔ "یہاں آکر نہ جانے کیوں...... میرے دل کی عجیب سی حالت ہو جاتی ہے۔"

"یہ بولو کہ ڈر کے مارے ہوا کھسکتی ہے......" جونی نے منہ بنایا۔ پھر وہ رسٹ واچ کی ریڈیم سوئیوں پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "مال آنے میں صرف 10 منٹ باقی ہیں۔ 12 بجے مال گودام میں رکھ کر ہم لوگ بھی روانہ ہو جائیں گے۔"

سونو خاموش رہا...... اب وہ ذیلی عمارت کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ دفعتاً عمارت کے اندرونی حصے سے کھٹ پٹ کی آوازیں ابھریں۔

دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یہ......یہ اندر کون ہے......؟" سونو ہکلایا۔

"آؤ......دیکھتے ہیں......" جونی نے سر ہلایا اور محتاط انداز میں آگے قدم بڑھا دیئے۔

"چھوڑو......" سونو نے اسے روکا۔ "مال آجانے دو......اسے اتارنے کے لئے تو اندر جانا ہی ہوگا......تھوڑا انتظار کرو۔"

"ڈرپوک ہو تم......" جونی چڑانے والے انداز میں مسکرایا۔ "تم کو اس فیلڈ میں استاد نے کیا سوچ کر بھرتی کیا ہے......؟"

سونو نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور پھر وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا، یوں جیسے اسے جونی کا ریمارک سخت ناگوار گزرا ہو۔

لال حویلی کا صدر دروازہ نہیں تھا...... کھلی ہوئی جگہ سے وہ دونوں اندر داخل ہوگئے۔

اور پھر ٹارچوں کی روشنی میں انہوں نے جو کچھ دیکھا......وہ کم از کم سونو تو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن آواز گویا اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

"بھاگو...... سبتو...... بھاگو......" یہ آواز خود جونی کی تھی، وہی جونی جو ابھی تک اپنی دیدہ دلیری کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔

وہ دونوں گھومے ہی تھے کہ اچانک ان کی گردنوں پر کوئی وزنی شے آ گری...... یوں جیسے انہیں دبوچ لیا گیا ہو۔

پھر دونوں اوندھے منہ گرے اور بے حس و حرکت ہو گئے۔

☆......☆......☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب مانی کے گھر کا دروازہ کسی نے زور زور سے دھڑ دھڑایا۔

مانی گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

"اس وقت کون آ گیا......" وہ بڑبڑایا۔

اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے پولیس کی لاری سمیت انسپکٹر دلاور دانتوں کی نمائش کرتا ہوا دکھائی دیا۔

اس نے بڑی گرم جوشی سے مانی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "ارے مانی صاحب...... آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ واہ......"

"کیا ہوا بھئی......؟" مانی نے اپنی آنکھیں پھاڑیں۔

"میرے خیال سے آپ کی نیند خراب ہو گئی ہے۔" اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ "لیکن بات یہ ہے کہ آپ کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق ہم لوگوں نے لال حویلی کو اپنے محاصرے میں لے لیا...... اور......"

"اندر آ جاؤ انسپکٹر صاحب......!" مانی نے ٹوکا۔ "گھر میں بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔"

"میں تو آپ کو لینے آیا ہوں......" انسپکٹر دلاور نے کہا۔ "دراصل ہمیں کافی حد تک یقین ہے کہ آج لال حویلی میں کوئی کارروائی ہونے والی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اپنے ذرائع سے بھی اس بارے میں چند شواہد ملے ہیں۔"

"ہوں...... اچھا......" مانی نے سر ہلایا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔"

"بالکل...... بالکل......" انسپکٹر دلاور نے سر ہلایا۔ "اور اسی لئے میں آپ کو ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہوں تا کہ اس وقت آپ بھی موجود ہوں۔"

"چلو پھر......" مانی نے کہا۔ "میں پانچ منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔"

"ہاں...... ذرا جلدی آیئے...... وقت کم ہے۔"

مانی گھر میں چلا آیا اور جلدی جلدی تیار ہو کر انسپکٹر دلاور کے ساتھ روانہ ہو گیا راستے میں انسپکٹر دلاور نے بتایا۔

"میں نے لال حویلی میں نگرانی کے لئے نفری لگا دی ہے...... ارے...... بارود تو بجنے والے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے جیپ کی رفتار بڑھا دی اور پھر جلد ہی وہ دونوں لال حویلی جانے والی سڑک پر نکل آئے۔

دفعتاً فضا فائروں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ لال حویلی کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"یہ کیا ہوا......؟" انسپکٹر دلاور بڑبڑایا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ معرکہ شروع ہو گیا ہے۔"

"ایسا ہی لگ رہا ہے۔" مانی نے سر ہلایا۔ "مجرم آ چکے ہیں۔"

"ہاں......" انسپکٹر دلاور نے سر ہلایا۔

عین اسی وقت سامنے سے ایک کار انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی آئی اور زن کر کے ان کی جیپ کے قریب سے نکلتی چلی گئی۔

انسپکٹر دلاور نے فوراً ہی اپنی جیپ کو سائیڈ کیا تھا ورنہ شاید کار ان کی جیپ سے ٹکرا جاتی۔

"انسپکٹر صاحب...... اس کے پیچھے چلو......" مانی نے تیزی سے کہا۔ "میرے خیال سے مجرم فرار ہو رہے ہیں۔"

انسپکٹر ولاور نے فوراً ہی جیپ موڑ دی اور ایکسیلیٹر پر فل دباؤ ڈال دیا۔ جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔

اور پھر جلد ہی انہوں نے کار کو جالیا...... اب انہوں نے دیکھا کار میں ایک ہی شخص تھا جو ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

اور اس کی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح جیپ سے اس کی کار کا درمیانی فاصلہ بڑھ جائے...... اچانک کار سے ایک فائر ہوا اور گولی ان کے سروں پر سے گزر گئی۔

ساتھ ہی دوسرا فائر ہوا اب کی بار بھی انسپکٹر ولاور بال بال بچا۔

اس وقت مانی نے انسپکٹر ولاور کے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور انسپکٹر ولاور سے بولا۔

''آپ ذرا درمیانی فاصلہ بڑھاؤ۔''

اس نے چونک کر مانی کی طرف دیکھا اور جیپ کی اسپیڈ ذرا کم کردی، درمیانی فاصلہ بڑھتے ہی مانی نے کار کی طرف فائر کردیا۔

اور پھر وہ ہوا کہ کافی زوردار دھماکا...... اسپیڈ میں ہونے کی وجہ سے کار بری طرح لہرائی اور کافی آگے تک جانے کے بعد رک گئی۔

جیپ بھی اب روک لی گئی تھی، پھر کار کا دروازہ کھلا اور برق رفتاری سے کوئی بھاگتا ہوا سڑک کے دوسری طرف درختوں کی آڑ میں چلا گیا۔

یہ دونوں بھی جلدی سے جیپ سے اتر پڑے۔

''وہ...... ادھر گیا ہے......'' مانی نے کہا، ابھی تک وہ لوگ جیپ کی آڑ میں تھے۔

''ہاں...... اور وہ ہمیں باآسانی دیکھ سکتا ہے۔'' انسپکٹر ولاور بولا۔ ''ہمیں بھی اب درختوں کی آڑ لینی چاہیے۔''

اور پھر اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں دونوں نے برق رفتاری سے درختوں کی طرف دوڑ لگادی۔

اب چاروں طرف سناٹا تھا۔ دفعتاً لگاتار دو فائر ہوئے اور گولیاں ان کے قریب سے گزر گئیں۔

عین اسی وقت پولیس وین کے سائرن کا شور سنائی دیا۔ شاید اب لال حویلی میں نگرانی کرنے والے اس طرف آرہے تھے۔

لیکن وہ لوگ اتنی دیر سے کیوں آرہے تھے۔؟

اس وقت یہ سوچنے کا ٹائم نہیں تھا، ریوالور مانی کے ہی ہاتھ میں تھا، اس نے اپنے اندازے سے آنے والی گولیوں کی سمت فائر کردیا۔

فوراً ہی ایک دردناک چیخ گونجی اور...... کوئی دھڑ سے گرا وہ لوگ اسی طرف جھپٹے، پولیس کی وین بھی اب قریب آچکی تھی۔

☆......☆......☆

لال حویلی میں جونی اور سونو کو موقع پر ہی دھرلیا گیا تھا۔ پولیس کے چند کانسٹیبل پہلے ہی اندر موجود تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے ہی ان پر فوری طور پر قابو پالیا تھا۔

اس کے بعد کار میں آنے والا وہ شخص فرار ہوگیا تھا، شاید وہ موقع کی نزاکت کو بھانپ گیا تھا۔

لیکن مانی کی فوری حاضر دماغی سے وہ بھی اب حراست میں تھا اور اس کی کار سے بھاری مقدار میں چرس برآمد ہوئی تھی۔

گولی اس کی ران پر لگی تھی اور ابھی اس کی شناخت نہیں ہوسکی تھی، بہرحال 80 فیصد امکان تھا کہ یہ مجرم خود ہی جاگر استاد تھا۔

دوسرے دن آئی جی صاحب نے خود مانی کو اپنے آفس میں طلب کیا تھا، اور مانی کی اس کیس میں کارکردگی پر اسے شاباش دی تھی۔

''بھئی...... تمہاری جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔'' آئی جی بولے۔ ''تم نے کسی ماہر جاسوس کی طرح اس کیس میں پولیس کے محکمے کی مدد کی ہے۔''

''شکریہ......'' مانی نے مسکرا کر سر ہلایا۔ ''لیکن میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ کل سے پہلے تک کبھی میں نے ریوالور کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔''

"ارے......" آئی جی چونکے۔ "تو پھر کل......!"

"بس جو کچھ ہوا وہ قدرتی طور پر ہوا......" مانی نے سر ہلایا۔ "میں نہیں جانتا کہ کیسے ہوا۔"

"ہمم......" آئی جی نے سر ہلایا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر آپ کو باقاعدہ تربیت دی جائے تو آپ تو ملکی سطح پر اپنی خدمات کو عوام کے لئے فائدے پہنچا سکتے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے کہ آپ کا خیال درست ہو......" مانی نے کہا۔

"میں فوری طور پر آپ کو یہ آفر کرتا ہوں......" آئی جی نے پرجوش انداز میں کہا۔ "تاکہ ملک وقوم کو آپ کی ذات سے استفادہ حاصل ہو۔"

"میں آپ کی پیشکش پر غور کروں گا......" مانی نے کہا۔ "فی الوقت تو میں اپنے ہی مسئلے میں الجھا ہوا ہوں۔"

"کون سا مسئلہ......؟"

"مجھے دو چیزوں کی تلاش ہے......" مانی نے طویل سانس لی۔ "ایک تو اپنے بزرگ دینو بابا کی، اور دوسرے اس جگہ کی جہاں کی زمین لال ہو اور درختوں کے پتے نیلے ہوں......بس مجھے وہاں جانا ہے۔"

"کیا مطلب......؟" آئی جی نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"مطلب تو میں بھی ابھی نہیں سمجھ سکا ہوں...... آپ کو کیا بتاؤں......فی الحال تو میرے پاس یہی ایک اشارہ ہے۔"

"اوکے......" آئی جی نے سر ہلایا۔ "میرا ایک دوست ہے پروفیسر درانی......وہ جہاں دیدہ انسان ہے، اس کی ساری زندگی مہم جوئی کے شوق میں گزری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسی کوئی جگہ موجود ہو...... اگر ایسا ہے تو ضرور اس کے علم میں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے...... یہ مناسب رہے گا......" مانی نے سر ہلایا۔

"تم اس سے ملاقات کرلو......اور اس کے بعد کسی قسم کی مدد درکار ہو تو مجھے ضرور بتانا، اور میں تمہارے دینو بابا کی تلاش کے لئے بھی اپنے ماتحتوں کو الرٹ کردیتا ہوں۔"

مانی نے سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

پروفیسر درانی نے اپنی آنکھیں چندھیائی تھیں، یہ شاید ان کی خاص عادت تھی، جب وہ ذہن پر زور ڈالتے تھے تو اسی کیفیت کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔

ان کی رہائش ایک چھوٹے سے گھر میں تھی۔ جس میں صرف ایک ہی ہال نما کمرہ تھا۔ اور اس کمرے میں چاروں طرف پرانی اور نایاب قسم کی کتابوں کا انبار لگا ہوا تھا۔

پروفیسر درانی اب بڑھاپے کی حدود میں داخل ہوچکے تھے، اور تنہا زندگی گزار رہے تھے، کافی سالوں پہلے ان کے بیوی بچے ایک سفری حادثے کا شکار ہو کر جاں بحق ہوچکے تھے۔

گویا پروفیسر درانی نے اب اپنی بقیہ عمر کتابوں کے نام کررکھی تھی۔ گورنمنٹ جاب کی ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی پنشن اور مختلف اخباروں میں ادارئیے لکھ کر ان کا کافی گزارہ ہو جاتا تھا۔

آئی جی صاحب کی وساطت سے مانی ان کے پاس آپہنچا تھا اور اپنی "جائے طلب" کا "نقشہ" ان کے سامنے رکھے بیٹھا تھا۔

"میاں صاحب زادے...... لال زمین...... نیلے پتے......ہوں......ایسی ایک جگہ تو ہے......!"

مانی چونک کر سیدھا ہو گیا اور جلدی سے بولا۔

"کہاں ہے جناب......؟ کس جگہ ہے......؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں......" وہ ابھی تک سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

مانی نے بے چینی سے پہلو بدلا، وہ بدستور ان کے چہرے کی طرف متوجہ تھا۔ دفعتاً پروفیسر درانی

چونکے۔

"ارے ہاں..... یاد آیا..... اسی جنگل میں ایک بہت بڑی کھوہ ہے..... میں نے اس کھوہ میں بہت دور تک سفر کیا تھا..... یہ کافی سالوں پہلے کی بات ہے..... ہاں تو..... میں کہہ رہا تھا کہ اسی کھوہ میں کافی آگے جا کر سورج کی روشنی کسی جگہ سے اس طرح منعکس ہوتی ہے کہ وہاں کی زمین لال دکھائی دیتی ہے اور وہاں موجود درختوں کے پتے نیلے نظر آنے ہیں..... ہاں..... لیکن یہ سب دھوکا ہے، جو روشنی دیتی ہے.....!"

"دھوکہ.....؟" مانی کے منہ سے نکلا۔

"ہاں دھوکا..... جیسے طلسم اور نظر بندی دھوکا ہے..... آنکھوں کا فریب ہے۔ بالکل اسی طرح وہاں کا یہ منظر بھی نگاہوں کا فریب ہے۔"

"اوہ....." مانی کے منہ سے نکلا۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا وہاں آبادی ہے.....؟ لوگ رہتے ہیں وہاں.....؟"

"آبادی کا تو مجھے نہیں معلوم....." پروفیسر درانی نے سر ہلایا۔ "کیونکہ میں زیادہ آگے تک نہیں جا سکا تھا..... میری طبیعت خراب ہوگئی تھی..... اور میرے خیال سے تو وہ کھوہ آگے جا کر کسی بڑے پہاڑ کے دامن میں کھل رہی ہوگی..... میرا تو یہی اندازہ ہے۔"

"اچھا....." مانی نے سر ہلایا۔ "ایک بات اور بتائیں..... کیا ہمارے اس قصبے کے ارد گرد کوئی جادوگروں کا قبیلہ آباد ہے.....؟ یا کوئی ایسی جگہ جہاں جادو اور ٹونے کے ماہر لوگ موجود ہوں۔"

"ایسا ممکن تو ہے....." انہوں نے سر ہلایا۔ "کیونکہ اس قصبے کا دوسرے شہروں سے درمیانی فاصلہ بہت طویل ہے اور اس راستے میں کافی جگہ آباد ہاں موجود ہیں..... میں ایک ایسی آبادی سے واقف ہوں جو سحر اور کرتب والوں کی آبادی ہے۔ اسی جگہ سے وہ ملک کے مختلف شہروں میں اپنے کرتب دکھانے کے لئے نکلتے ہیں۔ اور پھر وہیں پر جمع ہو جاتے ہیں، تم انہیں خانہ بدوش کہہ سکتے ہو.....!"

"ٹھیک ہے..... آپ اس کھوہ کے راستے کے لئے میری رہنمائی کر دیں۔" مانی نے کہا۔ "مجھے کس طرف جانا پڑے گا۔"

"جنگل کے شمال جنوب کے درمیان میں..... اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس کھوہ کے دو راستے ہیں، اور جو جگہ تم کو مطلوب ہے وہ بائیں راستے کی طرف ہوگی۔"

"ٹھیک ہے....." مانی اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ نے اپنی معلومات کا خزانہ مجھ پر نچھاور کیا ہے۔ میں اس کا بدل تو نہیں دے سکتا لیکن..... یہ رکھ لیں.....!"

یہ کہہ کر مانی نے چند بڑے نوٹ ان کی طرف بڑھا دیے۔ پروفیسر درانی کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ عود کر آئی۔

پھر انہوں نے ہاتھ بڑھا کر وہ نوٹ مانی سے لیتے ہوئے کہا۔

"اگر آئندہ بھی میری ضرورت ہو تو..... میں حاضر ہوں....."

"جی..... ضرور....." مانی نے سر ہلایا اور پھر سلام کر کے باہر نکل گیا۔

اب اس کا رخ اپنے گھر کی طرف تھا..... ان تمام مراحل سے گزرنے میں اب رات ہو چکی تھی۔

مانی نے گھر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ لیکن پھر چند قدم چلنے کے بعد ہی اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔

کمرے کے دروازے پر تین افراد پہلے سے موجود تھے اور ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا، جس کا رخ مانی کی طرف تھا۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ....." ان میں سے ایک گرجا۔ "ہم تمہارا کافی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔ تم کو ہمارے باس نے بلایا ہے۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"تم کس باس کی بات کر رہے ہو....." مانی نے

حیرت سے پوچھا۔ "اور کون ہو تم لوگ......؟"

"ہم یہاں انٹرویو دینے نہیں آئے ......" دوسرا غرایا...... "چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو......گلی کے کونے پر ہماری گاڑی کھڑی ہے...... اس میں بیٹھ جاؤ......"

"میں تم لوگوں کا نوکر نہیں ہوں، جو تمہارے حکم پر چل پڑوں......" مانی نے منہ بنایا۔ "ابھی میرے پاس بالکل فرصت نہیں ہے...... میں پہلے اپنے دیوبابا کو ڈھونڈوں گا، اور پھر کوئی اور کام کروں گا......؟"

یہ سن کر ان تینوں کو غصہ آگیا، پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"یہ پانی والی پستول نہیں ہے...... بلکہ......!"

"اچھا......" مانی نے ہنسی سی اڑائی۔

نہ جانے کیوں خود بہ خود ہی اس کے دل سے ڈر اور خوف ختم ہو گیا تھا۔

"اچھا......؟" وہ حیرت سے بولا۔ "تم ہوش میں تو ہو......؟"

"تم لوگ اب اپنا راستہ ناپو......" مانی نے ہاتھ ہلایا۔ "میں اب سوؤں گا، کیونکہ صبح مجھے اپنی مہم پر نکلنا ہے۔"

"یہ ایسے نہیں مانے گا......" ایک نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

"گولی چلادو......" مانی نے مذاق اڑانے والے انداز میں لقمہ دیا۔

یہ سن کر ان بدمعاشوں نے اپنی اپنی گنیں ایک سائیڈ پر رکھیں اور مانی پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑے۔

ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مانی کی تکا بوٹی کروالیں گے۔ لیکن پھر جو کچھ ہوا وہ ان کی سوچ کے برعکس نکلا۔

مانی نے انہیں اپنے ہاتھوں پر روکا اور آگے کی طرف جھٹک دیا، تینوں گویا اڑتے ہوئے گئے اور دھم سے کمرے کی دیوار سے ٹکرائے۔

ان کے لئے یہ جھٹکا شدید تھا، اور ساتھ ہی انہیں حیرت بھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ لوگ دوبارہ سنبھل کر اٹھے اور مانی کی طرف بڑھے۔

ان کا انداز جارحانہ تھا، لیکن مانی اس انداز کو خاطر میں لانے والا کہاں تھا۔

اس نے اب کی بار انہیں اپنی لاتوں پر رکھ لیا...... اور پھر چند ہی لمحوں میں ان بدمعاشوں کی اچھی خاصی ٹھکائی ہو چکی تھی۔

جلد ہی ان کے کس بل نکل گئے اور جسم کے کئی حصوں سے خون جاری ہو گیا۔ ایسے میں مانی نے ان سے پوچھا۔

"تم لوگوں کو تمہاری گاڑی میں ڈال کر آؤں......؟"

"نہیں......!" وہ بوکھلا کر بولے۔ "ہم...... خود ہی چلے جائیں گے۔"

اب وہ سمجھ چکے تھے کہ ان کے سامنے کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔

"ٹھیک......" مانی نے سر ہلایا اور پھر بولا۔ "چلو......اب نکلو......!"

تینوں نے سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ فوراً ہی مانی نے آواز لگائی۔

"رکو......!"

تینوں ٹھٹھک کر رک گئے، مانی نے مسکرا کر کہا۔

"اپنے کھلونے تو لیتے جاؤ...... میرے گھر میں ان سے کھیلنے کے لئے کوئی بچہ نہیں ہے۔"

یہ سن کر وہ اپنے اسلحہ کی طرف جھپٹے اور اسے اٹھا کر ایسے بھاگے جیسے موت ان کے تعاقب میں ہو۔

مانی نے اطمینان سے دروازہ بند کیا اور پھر اپنے کمرے میں آکر بستر پر ڈھیر ہو گیا...... اسے سخت نیند آرہی تھی۔

☆......☆......☆

ایک تیم شحیم اور بلڈاگ جیسے چہرے والا آدمی نہایت طیش کے عالم میں کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ اور اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

مانی کے ہاتھوں اپنی درگت بنوانے والے تینوں

بدمعاش اس کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہوئے تھے۔

پھر وہ بلند آواز سے دہاڑا۔

"تم لوگوں نے تو میری ناک ہی کٹوا دی...... اب میں بگ باس کو کیا جواب دوں گا...... ؟ بولو...... جواب دو......"

ان میں سے ایک نے مسکین سی صورت بنائی۔ "ہمیں تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ اس قدر...... طاقتور اور تیز طرار ہوگا۔"

"طاقتور......؟" باس نے اسے گھورا۔ "تو کیا مجھے تم لوگوں کو ڈریپ چڑھوا کر بھیجنا چاہئے تھا......؟ یا انرجی پاور کے کیپسول کھلا کر......؟"

"باس......؟" دوسرے نے طویل سانس لی۔ "یہ سچ ہے کہ اس نے ایک منٹ میں ہی ہماری چٹنی بنا کر رکھ دی۔"

"اب دوسری چٹنی کے لئے تیار ہو جاؤ......" باس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جو بگ باس آ کر بنائیں گے...... اب ان کو خود ہی جواب دینا۔"

تینوں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ وہ کرتے بھی کیا...... باس چند لمحوں تک انہیں گھورتا رہا پھر سر ہلا کر بولا۔

"کیا میں تم لوگوں کو ایک موقع اور دوں......؟"

"جی باس......" ایک نے کہا۔ "کیا ہم اسے مار ڈالیں......؟"

باس نے اسے گھورا۔

"مارنا بہت آسان ہوگا...... ؟ ارے بے وقوف اسے زندہ سلامت لے کر آنا ہے۔ بگ باس اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اسی کی بدولت......"

اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی عین اسی وقت "ٹوں ٹوں" کی آواز کمرے میں گونجی۔

"کیا ہوا جیکی...... نانی کہاں ہے......؟"

"مسس...... سر...... وہ" باس یعنی جیکی ہکلایا۔ "وہ ان لوگوں کے قابو میں نہیں آسکا۔"

"کیا مطلب......؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

جواباً جیکی نے اپنے کارندوں کی درگت کا ماجرا بیان کر دیا۔ خلاف توقع بگ باس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔

"خوب...... بہت خوب...... مجھے یہی اندازہ تھا...... خیر...... اب میں خود ہی اس سے مل لیتا ہوں...... اور ہاں...... ٹائیگر کا کیا حال ہے......؟"

"سر...... وہ شدید زخمی ہے اور حوالات میں اس کی ٹریٹمنٹ ہو رہی ہے۔"

"ہوں......" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "اب میں خود ہی ٹائیگر کا حساب برابر کروں گا...... کیونکہ اس نے حوالات میں یہ بیان دیا ہے کہ وہ خود ہی جاگرا استاد ہے...... ٹائیگر کی وفاداری مجھے بہت پسند آئی ہے...... اور اسی بناء پر جلد ہی وہ سلاخوں سے باہر ہوگا۔ اور اب ہمیں جلد ہی اس ملک کے روشنیوں والے شہر کا رخ کرنا ہے...... جہاں ہمیں اپنی محنت اور لگن سے اندھیرے پھیلانے ہیں۔"

"جی...... کیا مطلب......؟" جیکی نے حیرت سے پوچھا۔

"بہت جلد سمجھ جاؤ گے......" کہا گیا۔ "میرا مشن یہ ہے کہ اس ملک میں ہر طرف بربادی پھیلا دی جائے، سکون و امن تباہ کر دیا جائے...... اور لوگوں کو برائی کے راستے پر ڈال دیا جائے تاکہ شابولا خوش ہو۔"

"سر...... یہ شابولا کون صاحب ہیں......؟"

"ادب سے نام لو......" غرا کر کہا گیا۔ "آج میں جو کچھ بھی ہوں! وہ شابولا ہی کی بدولت ہوں، اور تم سب کو میں نے اسی لئے ایک جگہ جمع کر کے اپنی پارٹی بنائی ہے کہ میں شابولا کو خوش کروں تاکہ میں وشت عجائب...... میرا مطلب ہے کہ میں اپنی منزل تک پہنچ جاؤں...... کیا تم لوگ میرے احکامات پر عمل کرو گے......؟"

"جی سر......" جیکی نے فوراً کہا۔ "ہم آپ کے وفادار ہیں...... اور ہمیشہ رہیں گے...... کیونکہ آپ جیسا

رحم دل اور ہر طرح سے خیال رکھنے والا باس ہمیں اور کہیں نہیں مل سکے گا۔"

"گڈ......" آواز آئی۔ "اب تک تم لوگوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ سب تم لوگوں کا امتحان تھا۔ جلد ہی ہم لوگ اپنے اصل مشن کی طرف متوجہ ہوں گے...... اور میں جلد ہی تم لوگوں کے سامنے آنے والا ہوں...... شابولا کے ساتھ......!"

"اوہ...... سچ جناب......!" جیکی خوشی سے جھوم اٹھا۔

اس کے تینوں ساتھیوں کے چہروں پر بھی مسرت لہرانے لگی۔

"ہاں...... جونی اور سونو بھی جلد ہی تم لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔" اس نے اطلاع دی۔ "ابھی کسی کو میری شکتیوں کا اندازہ نہیں ہے...... خیر...... اب تم لوگوں کی آزمائش جلد ہی ختم ہونے والی ہے...... عنقریب بڑی رات آنے والی ہے...... میں اسی رات میں تم لوگوں کے سامنے جلوہ گر جاؤں گا...... اور...... اسی رات کو تم لوگ مجھ سے وفاداری کا ایک خاص اور مقدس عہد کرو گے...... فی الحال اتنا ہی...... گڈ نائٹ......!"

آواز بند ہوگئی...... جیکی اپنے ساتھیوں کی شکل دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

مانی تن تنہا اپنی مہم پر روانہ ہو چکا تھا۔ اسے صرف اس جگہ پہنچنا تھا جس کا ذکر دینو بابا نے اپنے خط میں کیا تھا۔

اگر یہ وہی جگہ تھی...... جو پروفیسر درانی نے بتائی تھی تو پھر دینو بابا نے کھل کر اپنے خط میں اس کی نشان دہی کیوں نہیں کی تھی......؟ ہوسکتا ہے کہ وہاں جا کر مانی کسی مشکل میں گرفتار ہو جاتا......؟ یہی وجہ ہوسکتی تھی کہ جس کی بنا پر دینو بابا نے واضح طور پر اس جگہ کی نشان دہی نہیں کی تھی۔

مانی نے اپنے ساتھ ایک سفری تھیلا کندھے پر لٹکایا ہوا تھا، جس میں ضرورت کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

کھوہ تلاش کرنے میں اسے زیادہ وقت کا سامنا نہیں ہوا تھا...... لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس کھوہ کو پہچاننا کافی مشکل کام تھا۔

اور یہ دریافت بھی اتفاقاً ہی ہوئی تھی۔ اس کا سہرا ایک شرارتی بندر کے سر جاتا تھا، جو مانی کو راستے میں ملا تھا...... اور پھر یہ ننھا سا شرارتی بندر اس کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا ہوا بھئی......؟" مانی نے حیرت سے پوچھا۔ "کون ہو تم......؟ اور تم نے کس خوشی میں میرا راستہ روکا ہے......؟"

مانی نے اس سے مذاقاً پوچھا تھا، لیکن حیرت انگیز طور پر بندر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ بجا ڈالا۔

"اوہ......" مانی نے حیرت سے کہا۔ "تم کو اردو بھی سمجھ آتی ہے......؟"

بندر خوخیا کر رہ گیا...... پھر مانی نے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے اپنے کھانے کے لئے رکھا ہوا برگر نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم بھوکے ہو......؟ لو یہ کھاؤ......؟"

بندر فوراً ہی برگر پر جھپٹا اور اس پر مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ مانی اسے غور سے اور مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"اچھا بھئی...... ہم تو چلے اپنے سفر پر......" مانی نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

بندر نے فوراً ہی برگر منہ میں دبایا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ مانی فوراً ہی مڑا۔

"ارے بھئی تم کہاں میرے ساتھ آ رہے ہو......؟ مجھے تو خود نہیں پتا کہ میں کہاں جاؤں گا۔"

بندر نے رک کر اسے دیکھا اور پھر رستم سے دو قدم آگے ہو کر چلنے لگا۔"

"ارے...... کیا اب میں تمہارے ساتھ چلوں......؟"

بندر نے خوخیا کر سر ہلایا اور رستم نے ہنس

کر کندھے اچکادیے...... اب وہ محض تفریح کی خاطر بندر کے پیچھے چل پڑا۔

لیکن پھر تھوڑی دور آگے جا کر ہی اس کی آنکھوں میں حیرت کے دیئے جل اٹھے، کیونکہ بندر ایک جگہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان پہنچ کر رک گیا تھا۔

رستم نے سامنے دیکھا تو اسے وہی کھوہ دکھائی دی، جس کے بارے میں اسے درانی صاحب نے بتایا تھا۔

اس نے حیرت زدہ انداز میں بندر کی طرف دیکھا اور بندر فوراً ہی جست لگا کر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔

"واہ...... یار......" رستم بڑبڑایا۔" اس نے تو غائبانہ طور پر میری رہبری کردی...... واہ میرے محسن......!"

کھوہ میں کافی اندھیرا تھا۔ مانی نے اپنے تھیلے میں سے ٹارچ نکالی اور کھوہ کے اندر داخل ہوگیا۔

☆......☆......☆

اپنی دانست میں پولیس کا محکمہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ مانی کے ہاتھوں زخمی ہوکر جو مجرم حوالات پہنچ گیا تھا اس نے قبول دیا تھا کہ وہی جاگر استاد ہے۔

"تمہارے کئی جوئے کے اڈے بھی ہیں......" انسپکٹر دلاور نے اس سے کہا۔"جہاں سے چرس اور شراب فروخت ہوتی ہے۔ تم ان اڈوں کی نشان دہی بھی کرو گے...... اور اپنے تمام ساتھیوں کی نشان دہی بھی کرو گے۔"

ملزم جو کہ درحقیقت ٹائیگر تھا۔ اس نے اطمینان سے ایک طویل سانس لی اور بیڈ پر لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"دیکھا جائے گا...... فی الحال تو تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جاگر استاد کو تم گرفتار کر چکے ہو۔"

"ہوں......" انسپکٹر دلاور نے سر ہلایا۔" سارے کس بل نکل جائیں گے...... کل تمہیں اسپتال سے رخصت کردیا جائے گا...... اور پھر پولیس سے تمہارا رابطہ شروع ہوجائے گا...... پھر تم خود ہی سب کچھ اگل دو گے......!"

ٹائیگر نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی اختیار کرلی۔ ادھر انسپکٹر دلاور نے اپنے ماتحتوں کو رجو بابا کو تلاش کرنے کے لئے بھی ہدایات دے رکھی تھیں۔ لیکن حال فی الحال رجو بابا کا کوئی پتہ نہیں مل پایا تھا۔

انسپکٹر دلاور اس وقت کافی پریشان ہوا جب براہ راست آئی جی کی کال آئی تھی...... اور انہوں نے رجو بابا کی بازیابی کے لئے کافی زور دیا تھا۔

اس نے اپنے طور پر اپنے ساتھیوں کی کوششوں کا ماجرا بیان کردیا اور کہا۔

"یس سر...... ہم لوگ پوری کوشش کررہے ہیں...... اور امید ہے کہ جلد ہی اس جانب سے کوئی نہ کوئی اطلاع ضرور ملے گی۔"

"اوکے...... میں آج شام کو کسی اچھی خبر کا انتظار کروں گا......" آئی جی نے کہا۔" اور جاگر استاد کے ریمانڈ کے وقت میں خود وہاں موجود ہوں گا۔"

"ٹھیک ہے سر......!" انسپکٹر دلاور نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

اور پھر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوجانے پر اس نے بھی ریسور رکھ دیا اور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

☆......☆......☆

مانی ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واقعی ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں 2 راستے سامنے موجود تھے۔

مانی کو اس وقت یاد آسکا کہ پروفیسر درانی نے کس طرف جانے کی ہدایت کی تھی۔

چند لمحے تک وہ کھڑا ہوا سوچتا رہا اور پھر سر جھٹک کر بائیں جانب والے کھوہ کی طرف چل پڑا۔

اور پھر تھوڑی دور چل کر اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا...... سامنے ایک دروازہ موجود تھی...... جس کے

اندر کافی بڑا خلا تھا۔

مانی نے اس خلاء میں ٹارچ کی روشنی ڈالی اور اچھل پڑا۔۔۔۔ سامنے ایک کرسی پر، دینو بابا موجود تھے اور کسی سوچ میں گم تھے۔

ٹارچ کی روشنی جیسے ہی ان پر پڑی، انہوں نے بھی مانی کی طرف دیکھا اور ان کے چہرے پر شدید حیرت کے تاثرات پھیل گئے۔

"دینو بابا۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔؟"

"مانی۔۔۔۔!" دینو بابا نے کہا۔ "میرے بچے۔۔۔۔!"

"مانی فوراً ہی اندر آ کر ان سے لپٹ گیا، لیکن وہ مستقل کرسی پر ہی بیٹھے رہے۔"

"دینو بابا۔۔۔۔ میں نے آپ کو کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔۔۔۔ اور آپ یہاں آرام سے بیٹھے ہیں۔۔۔۔ اس ویرانے میں آپ کیا کر رہے ہیں۔؟"

"میں یہاں خود سے نہیں آیا۔۔۔۔ مجھے لایا گیا ہے۔۔۔۔" وہ غمگین انداز میں مسکرائے۔ "تم اگر غور کرو تو مجھے زالوشا نے یہاں قید کر رکھا ہے۔"

"قید۔۔۔۔!" مانی نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "لیکن آپ تو آزاد ہیں۔"

"نہیں میرے بچے۔۔۔۔" دینو بابا نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں یہاں سے نہیں نکل سکتا۔۔۔۔ اس نے شابولا کو مجھ پر مسلط کر رکھا ہے۔"

"یہ شابولا کون ہے۔۔۔۔؟" مانی نے پوچھا۔ "کہاں ہے۔۔۔۔؟"

"وہ یہیں ہے۔۔۔۔ میں اگر یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا تو وہ سامنے آ جائے گا۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور ہو سکتا ہے کہ اب وہ تم پر بھی مسلط ہو جائے۔"

"آپ سب کچھ چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔۔۔۔" وتم نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "میں دیکھ لوں گا جو بھی ہوگا۔"

"نہیں مانی بیٹا۔۔۔۔" دینو بابا نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "تم جاؤ۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔ میرے حال پر چھوڑ دو۔۔۔۔"

"یہ نہیں ہو سکتا بابا۔۔۔۔ آپ چلو میرے ساتھ۔۔۔۔" یہ کہہ کر مانی نے ہاتھ بڑھایا۔

"یہ دیکھو۔۔۔۔ میں چل نہیں سکتا۔۔۔۔" یہ کہہ کر دینو بابا نے اپنے پاؤں آگے کر دیئے۔

مانی اچھل کر پیچھے ہٹا۔ ان کے پاؤں جگہ جگہ سے ادھڑے ہوئے تھے اور ان پر خون جگہ جگہ جما ہوا تھا۔

"یہ۔۔۔۔ یہ کیا ہے بابا۔۔۔۔؟"

"یہی شابولا ہے۔۔۔۔" دینو بابا کی مسکراہٹ بھی زخمی سی تھی۔ "اپنے نافرمانوں کو وہ اسی طرح سزا دیتا ہے۔"

"وہ ہے کہاں۔۔۔۔؟" مانی سیدھا کھڑا ہو گیا۔۔۔۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

دینو بابا کا یہ حال دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"وہ یہیں کہیں ہے۔۔۔۔ اور۔۔۔۔" دینو بابا بولتے بولتے رکے، پھر تھوڑے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔ "مانی بیٹا۔۔۔۔ تم یہاں کیوں آئے ہو۔۔۔۔؟ تم۔۔۔۔ تم چلے جاؤ۔"

"دینو بابا تم بھی چلو میرے ساتھ۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔ میں تمہیں اٹھا کر لے چلتا ہوں۔"

"یہ کہہ کر مانی جھکا اور اس نے دینو بابا کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ عین اسی وقت "زرچ زرچ" کی آوازیں گونج اٹھیں اور مانی کو یوں لگا جیسے اس کی دائیں ٹانگ میں کسی نے انگارے بھر دیئے ہوں۔

"وہ۔۔۔۔ وہ آ گیا مانی۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ آ گیا۔۔۔۔" دینو بابا کے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

ادھر مانی نے اپنی تکلیف کو بڑے ضبط سے برداشت کیا اور دینو بابا کو دوبارہ کرسی پر بیٹھا کر بولا۔

"یہ ٹارچ آپ پکڑو۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں دیکھتا ہوں۔"

دینو بابا نے ٹارچ تھام لی، اب مانی نے دیکھا

اس کے پیروں کے پاس ایک موٹا تازہ کاٹنے والا چوہا کھڑا تھا۔ اور اسی نے چند لمحے پہلے اس کے پاؤں پر اپنے پنجے گاڑے تھے۔

مانی حیرت سے اس چوہے کو دیکھتا رہ گیا۔ ایسے جنگلی چوہے اس نے اکثر دیکھے تھے۔ اس جنگل میں ان چوہوں کی بہتات تھی۔

"یہ...... شابولا ہے......؟" مانی نے حیرت سے وینو بابا کو مخاطب کیا۔

وینو بابا کے چہرے پر خوف کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"ہاں رستم...... یہ...... شابولا ہے...... اور میں...... اس کا نافرمان ہوں......"

یہ سن کر مانی زور سے ہنسا اور اس وقت جب وہ کاٹنے والا چوہا اس پر دوبارہ حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھ رہا تھا...... مانی نے اسے ایک زوردار ٹھوکر ماری۔

یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ چوہا فضا میں اچھل کر دیوار سے ٹکرایا اور پھر زمین پر گر کر بے حس و حرکت ہوگیا۔

وینو بابا کی آنکھیں خوف سے پھٹ پڑیں۔ ان کے چہرے پر دہشت کا راج تھا۔

"یہ...... یہ تم نے کیا کیا مانی......" وینو بابا بہ مشکل بول پائے۔ "غضب ہوگیا...... اب...... عتاب نازل ہوگا۔"

"چلو اب......" مانی نے پھر جھپٹتے ہوئے کہا۔ "آپ...... اٹھو......؟"

یہ کہہ کر مانی نے ایک بار پھر وینو بابا کو گود میں اٹھالیا۔ عین اسی وقت ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور کھوہ کی چھت سے پتھر گرنے لگے۔

یوں جیسے وہاں زلزلہ آ گیا ہو۔

"جلدی کرو مانی......" وینو بابا چیخے۔ یہاں سے اگر نکل سکتے ہو تو نکلو...... ورنہ ہم لوگ ان پتھروں میں دفن ہوجائیں گے۔"

وقتی طور پر تو خود مانی بھی اس افتاد پر بوکھلا سا گیا تھا۔ لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھ گیا۔

اب پتھر کافی تیزی سے گر رہے تھے اور مٹی دھول کی بدولت سانس لینا بھی دوبھر ہونے لگا تھا۔

مانی برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھوہ کے دہانے کی طرف بڑھا اور پھر فوراً ہی باہر نکل آیا۔

وینو بابا اس کے ہاتھوں میں ہی تھے......

باہر چونکہ دن کا منظر تھا اس لئے دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی۔

ان کے باہر نکلتے ہی ایک اور زوردار دھماکہ ہوا اور کھوہ کا دہانہ بکھر کر تباہ ہوگیا...... اس کی دھول اور مٹی کے کنکر مانی کے جسم سے بھی ٹکرائے۔

یوں لگ رہا تھا جیسے کھوہ میں کسی نے ڈائنا مائٹ فٹ کردیا ہو، مانی نے ایک درخت کے سائے میں وینو بابا کو گود سے اتار دیا۔

اور خود اس تباہ ہونے والی کھوہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مگر اب وہاں کیا تھا...... بس حد نظر تک دھول ہی دھول تھی۔

مانی اب وینو بابا کی طرف متوجہ ہوگیا...... روشنی میں ان کے پیروں کی حالت دیکھ کر اس کا دل تھرا اٹھا۔

عین اسی وقت ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں نے تمہیں بائیں طرف جانے کو کہا تھا...... اور تم...... دائیں طرف والے راستے پر چلے گئے۔"

مانی چونک کر مڑا۔ اس کے سامنے پروفیسر درانی کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے چہرے کا عجیب حال تھا۔

زمانے بھر کی اداسی اور دکھ گویا اس کے چہرے پرست آیا تھا۔

"درانی صاحب...... آپ یہاں......؟"

"میں جب بھی درانی نہیں تھا......" اس نے کہا۔ "اور میں اب بھی وہ نہیں ہوں...... میں تو زالوشا ہوں...... بھلا کسی کو کیا معلوم کہ لال زمین اور نیلے چوہوں والا دیس کہاں ہے۔ یہ بات تمہارے وینو بابا کو معلوم ہے یا...... مجھے......!"

"تو پھر...... وہ...... کہاں گئے......؟" مانی حیران

تھا۔ "مجھے تو آئی جی صاحب نے ان کے پاس بھیجا تھا۔"

"اسے میں نے باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔" زالوشا مسکرایا لیکن پھر فوراً ہی اس کی مسکراہٹ بجھ گئی اور وہ مانی سے مخاطب ہوا۔ "لیکن تم نے یہ کیا کیا......؟ تم نے میرے دیوتا کو موت کی نیند سلا دیا...... میں نے رات دن پاپڑ بیل کر اس کی خدمت کی تھی اور اس سے طاقتیں حاصل کی تھیں...... مگر تم نے...... سب کچھ تباہ کر دیا...... سب کچھ......!"

یہ کہتے ہوئے زالوشا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے

ونو بابا بھی چپ چاپ اس کی شکل دیکھ رہے تھے۔ زالوشا پھر بولا۔

"میں اب تم لوگوں کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا...... اب تم اپنے ونو بابا کو اٹھاؤ اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ...... میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم نے اپنے ونو بابا کو آزاد کروا لیا تو میں تمہیں ایک خوب صورت تحفہ دوں گا...... تو جاؤ...... زندگی سے زیادہ خوب صورت کوئی اور چیز نہیں ہوتی...... میں نے تمہاری جان بخشی کر دی...... میرا سب کچھ تباہ ہو گیا...... مجھے اب دوبارہ سے محنت کرنا پڑے گی...... اوہ...... تم نہیں جانتے کہ میں سالوں سے شابولا کی خدمت کر رہا تھا۔ اور میں بہت جلد وشت عجائب کا شہنشاہ بننے والا تھا۔ لیکن تم نے میرے خوابوں کے محل کو ریزہ ریزہ کر دیا۔"

"یہ وشت عجائب کیا ہے......؟" مانی نے پوچھا۔

"میرے سامنے بھی تم نے کئی بار اس کا ذکر کیا ہے......" ونو بابا نے بھی زبان کھولی۔ "کہاں ہے یہ دنیا......؟"

"میرے خیالوں میں......" زالوشا بجھے بجھے انداز میں مسکرایا۔ "جب میں اپنی شکتیوں میں یکتا ہو جاؤں گا...... تو ایک دن ضرور اس وشت عجائب کا شہنشاہ بنوں گا...... اور پھر میں وہاں اپنے دشمنوں کو بلا کر انہیں ضرور دکھاؤں گا...... اپنی طاقت کا نمونہ، پھر تمہاری اور تمہارے ونو بابا یعنی الشش سے بھی...... دو دو ہاتھ......" اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی......

"میں تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں......" مانی نے مایوسانہ انداز میں سر ہلایا۔

"وہ بندر بھی میری طاقت کا ایک نمونہ تھا...... جس نے تم کو کھوہ کا راستہ دکھایا تھا...... لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم دائیں ہاتھ والے راستے پر چل پڑو گے...... اوہ...... میں نے کتنی بڑی غلطی کی...... میں نے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی ماری...... میں نے تمہیں بائیں راستے کے لئے کہا تھا مگر تم قسمت کے دھنی نکلے کہ تم بائیں راستے پر نہ گئے...... ورنہ"

یہ کہہ کر زالوشا مڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"زالوشا...... زالوشا......!" مانی نے اسے پکارا۔ "میری بات سنو...... رکو......!"

لیکن زالوشا رکا نہیں...... اور پھر وہ جلد ہی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"چلو ونو بابا......!" مانی نے ایک طویل سانس لی۔

ونو بابا خود بھی کسی سوچ میں گم تھے۔ انہوں نے چند لمحے مانی کو دیکھا اور پھر سر ہلا دیا۔

رستم نے کسی کھلونے کی طرح انہیں پھر سے گود میں اٹھا لیا۔

ونو بابا کا اپنا ہی بنایا ہوا مرہم تھا، جس سے 2 دن کے اندر ہی حیرت انگیز طور پر ان کے پیروں کے زخم مندمل ہو گئے۔

یہ دیکھ کر مانی نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا...... اور وہ تو ویسے بھی ان کو پا کر بے انتہا خوش تھا، جیسے اسے بے پناہ دولت کے خزانے مل گئے ہوں۔

یہ سچ تھا کہ وہ ونو بابا کے بغیر ادھورا تھا...... نامکمل تھا۔ اس نے ونو بابا سے کہا۔

"آج آپ مجھے اپنے سارے راز بتاؤ ونو بابا...... میں تمہاری صحت یابی کا منتظر تھا...... اور اسی لئے آج تذکرہ کر رہا ہوں......"

"کیا راز بتاؤں......؟"

"آپ کا سب سے بڑا دشمن زالوشا ہے......

آخر وہ ہے کون......؟"

"وہ ایک مقابلہ ہے...... نیکی اور بدی کے مقابلے کی طرح...... میرے پاس تمہاری بات کا بس یہی جواب ہے۔"

"اور وہ اتنے بہروپ کیسے بھر لیتا ہے...... جیسے ابھی اس نے پروفیسر درانی کا روپ بدلا تھا۔ مجھے تو پولیس کے افسر سے ان کا پتا معلوم ہوا تھا...... پھر زالوشا کو اس بات کا کیسے علم ہو گیا......؟"

"روپ بدلنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے...... اور وہ اپنے دشمنوں کو ہر وقت اپنی نظر میں رکھتا ہے...... اس کے پاس جادوئی کمالات کی ایسی مہارت ہے کہ جس کا کوئی جواب نہیں...... اس دن شابولا کی تباہی کے باوجود اس نے تم کو زندہ سلامت چھوڑ دیا...... مجھے اب بھی حیرت ہے......"

"یہ شابولا کون ہے......؟"

"ہمارے قبیلے میں شیطان کی قوتوں کو شابولا کہتے ہیں، جب شیطانی قوت مجسم ہو جاتی ہے تو وہ شابولا بن جاتی ہے......"

میں نے شیطانی طاقتوں کو ماننے سے انکار کیا...... اور پھر ان طاغوتی طاقتوں کو میں نے نیکی اور سچائی کے سانچے میں ڈھال لیا...... تب سے ہی یہ زالوشا جو کہ میرا دوست تھا...... میرا دشمن بن گیا...... وہ اچھائی کے راستے کا منکر ہے۔

مانی بیٹا اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں یہ طلسماتی زندگی سے الگ ہو جاؤں، اور کسی نہ کسی طرح زالوشا کا خاتمہ ہو جائے۔ اور بقیہ میں اپنی زندگی ایک عام انسان کی طرح گزار دوں۔

کاش! کہ کوئی ایسا اللہ والا مل جائے جو کہ ان حالات اور زالوشا سے نجات دلا دے یعنی زالوشا کا خاتمہ کر دے۔"

☆......☆......☆

جنگلی اور اس کے ساتھیوں کو اونچے اونچے خواب دکھانے والا جاگر استاد پردہ سکرین سے گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

ٹائیگر اپنے فیصلے اور بیان پر اٹل تھا، لیکن سونو کی وجہ سے سارا معاملہ ہی الٹ ہو گیا تھا۔

سونو کا جب ٹائیگر سے سامنا ہوا تو سونو نے سب کچھ اگل دیا...... فوراً ہی پولیس کا محکمہ حرکت میں آ گیا اور جنگلی سمیت گروہ کے کئی افراد پکڑے گئے۔

سونو کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا تھا...... اور ایک بار پھر جاگر استاد ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا......؟

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ اب بھی آزاد تھا...... اور یہ بھی حقیقت تھی کہ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے وہ منظر عام پر آیا تھا، اور زیر زمین دنیا پر کسی چمکتے ہوئے ستارے کی طرح چھا گیا تھا۔

لیکن پولیس والوں کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ جاگر استاد ایک جادوگر تھا...... بھانت بھانت کے بھیس بدلنا اور نت نئے ہنگامے کرنا اس کا شغل تھا۔

آج وہ جاگر تھا...... کل وہ کچھ اور تھا...... اور آنے والے کل میں اس کا روپ کیا ہو...... یہ کون جان سکتا ہے......؟

ابھی زالوشا کے تھیلے میں نہ جانے کتنے تماشے موجود ہیں...... ابھی اسے نہ جانے کتنے کھیل کھیلنے ہیں۔

ادھر اپنے گھر میں دینو بابا کے سامنے بیٹھا ہوا مانی بولا۔ "دینو بابا اب آپ اپنے دماغ سے تمام فکر کو نکال دیں۔ بس آپ یہ سمجھ لیں کہ زالوشا کا خاتمہ ہو گیا۔" مانی یہ بول کر دینو بابا کو بغور دیکھنے لگا۔

دینو بابا جیسے اچنبھے میں بولے۔ "مانی بیٹا تم یہ وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو، یہ اتنا آسان نہیں...... ناکوں چنے چبوانے سے بھی کہیں بڑھ کر بلکہ ناممکن ہے۔"

"دینو بابا آپ فکر نہ کریں...... ایک صاحب ہیں...... وہ بہت پہنچے ہوئے اور لوگوں کی مدد کرتے ہیں...... میں نے سنا ہے کہ ان کے در سے کوئی مایوس یا ناکام نہیں لوٹتا۔ ان کا نام "دولوکا" ہے۔

(جاری ہے)

پراسرار دنیا

عطیہ زاہرہ۔ لاہور

قدیم نسخوں اور نوادرات سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں اور بابل کے رہنے والوں نے پانچ ہزار سال پہلے کالے جادو کی بنیاد رکھی ان لوگوں کی روز مرہ زندگی میں جادو کا استعمال معمول تھا یہ ایک ایسا علم ہے کہ انسانی سوچ دنگ رہ جاتی ہے۔

انسانی سوچ کے افق پر جھلمل کرتی پراسراریت کے لبادہ میں لپٹی ہوئی ناقابل یقین روداد

قرآن پاک ساری انسانیت کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہے، کیونکہ قرآن پاک میں زندگی کے ہر پہلو کو واضح کردیا گیا ہے۔ یوں تو ہمارا مذہب اسلام دین فطرت ہے، اسلام نے ہر طرح کے جادو کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اس کے بارے میں قرآن پاک میں بھی وضاحت موجود ہے اور جادو کے حرام ہونے کی چند اہم وجوہات بھی واضح ہیں...... سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ تمام پیغمبروں نے شیطانی علوم کو حرام قرار دیا۔ چونکہ جادو بھی شیطانی عمل ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ شیطانی علوم کی شاخ ہے، اس لئے الہامی کتابوں میں اس سے منع کیا گیا ہے اس بات کا بہت کم لوگوں کو ادراک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو معجزے اور جادو میں فرق بتایا۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو معجزے عطا کئے، ان معجزات

کے اثرات انسانی عقل کو بھی دنگ کرتے رہے، شیطان نے ان معجزوں کے مقابلے میں کالے علوم سے اپنے پیروکاروں کو جادو کے منتر بتا کر لوگوں کو راہ راست سے ہٹانے کی کوشش کی۔

حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ نے کلام الٰہی سے جنوں پر قابو پانا سکھایا۔ اور وہ ان کا معجزہ تھا۔

شیطان نے اپنے پیروکار جادوگروں اور بدروحوں کو قابو کرنے کے لئے کالے علوم کے منتر سکھائے۔

آج تک کوئی جادوگر جنوں پر حضرت سلیمانؑ جیسی حکمرانی نہیں کر سکا۔

حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں فرعون کے دور کے سب سے بڑے جادوگر اور اس کے ساتھیوں نے کئی جادوئی سانپ چھوڑے تو حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے حکم سے اپنا عصا (لاٹھی کی شکل کا ڈنڈا) زمین پر پھینکا تو وہ بہت بڑا اژدھا بن کر تمام جادوئی سانپوں کو نگل گیا۔ جس کے بعد تمام جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا۔ ”آپ کا پروردگار سچا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو دست شفا کا معجزہ دیا۔ وہ جس کوڑھ کے مریض پر اپنا ہاتھ پھیرتے تو وہ تندرست ہو جاتا۔ کوئی جادوگر اپنے کالے جادو سے ایسی کرامت نہ دکھا سکا۔

حضور اکرمؐ کے زمانے میں عربوں کو علم تھا کہ جادو صرف زمین پر چلتا ہے، اور آسمان پر جادو کا اثر نہیں ہوتا۔ کفار نے جب حضور اکرمؐ سے کہا کہ ”وہ چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھائیں تو آپؐ نے اپنی انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے تو کافروں کو پتہ چل گیا کہ حضرت محمدؐ کا یہ معجزہ ہے۔

حضرت عائشہؓ سے ایک روایت کا مفہوم ہے کہ جبید بن اعصم نے حضورؐ کی کنگھی سے بال لے کر ان بالوں پر جادو کر کے ان میں گرہ لگا دی اور انہیں کھجور کے تر شگوفے میں چھپا کر زروان نامی کنویں میں دکھوا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضورؐ کو پتہ چلا تو آپؐ نے کنویں پر تشریف لے جا کر ان بالوں کو باہر نکلوایا، اور جادو کا خاتمہ کیا۔

قرآن مجید بھی اللہ کی طرف سے حضورؐ کو عطا کیا گیا معجزہ ہے، اس کی آخری دو سورتیں ناس اور فلق میں ہر طرح کے کالے جادو کا توڑ موجود ہے۔

علماء کرام کے مطابق اسلام میں جادو کو اس لئے بھی حرام قرار دیا گیا ہے کہ اس سے لوگوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اس میں حرام اور پلید چیزوں کا استعمال کر کے دوسرے انسانوں کو بیماریوں، تکالیف، پریشانیوں حتیٰ کہ موت سے بھی دوچار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جادو کرنے والا جادو کروانے والا دونوں خود بھی جادو کے برے اثرات کا نشانہ بن کر دنیا اور آخرت دونوں میں نشان عبرت بن جاتے ہیں۔

بڑے بڑے جادوگروں نے صدیوں کے تجربات کے بعد اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ جادو کرتے وقت بہت زیادہ محتاط رہنا پڑتا ہے، کیونکہ تھوڑی سی گڑبڑ سے جادو کے اثرات الٹ ہو جاتے ہیں۔ جس سے جادو کرنے والا خود بلاؤں، تکالیف اور قابو میں نہ آنے والی بدروحوں کا شکار بن کر تشنج کا مریض بن جاتا ہے، کئی جادوگر اپنے ہی جادو میں جل کر ہلاک ہو جاتے ہیں، کچھ خودکشی کر لیتے ہیں، اور کچھ پاگل ہو کر ہمیشہ کے لئے نشان عبرت بن جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

قدیم نسخوں اور نوادرات سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں اور بابل کے رہنے والوں نے پانچ ہزار سال قبل کالے جادو کی بنیاد رکھی۔ ان لوگوں کی روزمرہ زندگی میں جادو کا استعمال معمول تھا۔ اس دور کے کالے جادو کو حکومتی سرپرستی حاصل ہوتی تھی۔ حکومت کے مذہبی پیشوا کالے جادو کو دشمنوں کی بربادی کے لئے استعمال کراتے تھے۔

اس کے علاوہ ملک اور بادشاہ کو پیش آنے والی مشکلات کے سدباب کے لئے بھی کالے جادو کے کئی نسخے باہنوں نے مختلف قدیم علاقوں کی کھدائی کے دوران ملے ہیں۔ ان نسخوں میں 27 سو سال قبل مسیح میں لکھا

گیا جادو کا ایک نمونہ بھی ملا ہے جس میں "Ptah" دیوتا کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کے پاس جادو کے ایسے الفاظ تھے، جن سے وہ مختلف فوائد حاصل کرتا تھا۔ یہ الفاظ اس دیوتا کو جادو کے علوم کے دیوتا "Thoth" نے غصے میں دیئے تھے۔ تھوتھ دیوتا کو قدیم مصر کے تمام جادوگر اپنا دیوتا مانتے تھے۔

ایک روایت کے مطابق تھوتھ دیوتا نے اپنے جادوئی الفاظ سے "Hourbs" نامی دیوتا کی آنکھ کے زخم ٹھیک کیئے، تو تھوتھ دیوتا کے الفاظ کو مذہبی پیشواؤں نے محفوظ کرلیا، قدیم مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ دیوتا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ مقدس ہوتے ہیں، وہ ان الفاظ کو محفوظ کرلیتے اور ان کے ذریعے ان کے مذہبی پیشوا جادو کے منتر بناتے۔

قدیم مصر میں جادو کے الفاظ کے لئے شکلوں پر مبنی الفاظ استعمال کئے جاتے تھے۔ اس وقت تین طرح کی زبانیں ملتی ہیں۔ جن میں سے ایک وی پیرانڈ ٹیکسٹ، وی کفن ٹیکسٹ اور تیسری وی بک آف ڈیڈ کہلاتی تھی۔ ان زبانوں کے الفاظ کو قدیم ادوار میں "Hieroglyphs" رسم الخط میں لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد ستائیس سو قبل مسیح سے پندرہ سو قبل مسیح تک مصری Heka جادو استعمال کرنے لگے۔ Heka ایسا جادو ہے جس کے ذریعے مصری جادوگر مختلف طرح کے فوائد حاصل کرنے اور زندگی کی مختلف تکالیف سے نجات حاصل کرتے۔

پندرہ سو قبل مسیح کے بعد بعض مصری مذہبی پیشواؤں نے جادو کے یہ الفاظ استعمال کرنا چھوڑ دیئے، اور ان کی جگہ پیشہ ور جادوگروں نے لے لی۔ ان جادوگروں کو قدیم مصری "Hekan" کہتے تھے۔

ہیکن قدیم زمانے کے بڑے جادوگر ہوتے، ان کے بعد جو عوامی سطح پر چھوٹے جادوگر ہوتے انہیں "Scorpion Charmars" کہا جاتا۔ یہ چھوٹے جادوگر لوگوں کو سانپوں، چھپکلیوں، بچھوؤں اور ڈنگنے والے دوسرے جانوروں سے اپنے جادو سے بچاتے تھے۔ قدیم مصری ڈنگنے والے خطرناک جانوروں سے بہت ڈرتے تھے۔ اور ان سے بچنے کے لئے اسکارپین چارمرز کے طور پر جادو کرنے والے جادوگروں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔

اس دور میں مڈ وائف اور نرسوں کا کام کرنے والی خاتون نے بھی جادو کے کئی منتر اور ٹوٹکے سیکھے ہوئے تھے، جن کی مدد سے وہ بچے کی پیدائش کے وقت ماں کو جادوئی عملیات سے زچگی کی تکالیف سے بچاتی تھیں۔

قدیم مصر کے جادوگروں کے پاس کالے جادو کے کئی خطرناک منتر بھی محفوظ تھے، اور اس دور کے جادوگر دوسرے جادوگروں کو چیلنج بھی کرتے اور بڑا جادوگر چھوٹے جادوگر کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیتا۔ بادشاہوں اور اہم صوبوں کے منصب داروں نے اپنے ذاتی جادوگر بھی رکھے ہوئے تھے۔

قدیم مصریوں میں یہ عقیدہ عام تھا کہ اگر کسی جادوگر کو کسی شخص کا اصل یا دری نام معلوم ہوجائے تو وہ اسے اپنے جادو سے کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں قدیم زمانے میں ہر بچے کے دو نام رکھے جاتے تھے۔ ایک نام وہ عوامی سطح پر استعمال کرتا تھا جبکہ دوسرا نام اس کی ماں صیغہ راز میں رکھتی تھی، اس یادری نام کا جادوگر کسی نہ کسی طریقے سے پتہ چلا کر اس شخص کو جسمانی اور روحانی اذیت پہنچانے کے لئے اپنے جادو کا استعمال کرتا تھا۔

ان جادوگروں کے طریقہ کار کے مطابق اگر کوئی شخص اپنے دشمن کے ناخن، بال، جسم کا کوئی حصہ یا پاؤں کی دھول بھی لے آتا تھا، تو یہ جادوگر اپنے کالے جادو کا ایسا منتر پڑھتے کہ اس شخص کی تباہی کا آغاز ہوجاتا، کسی شخص کی تباہی کا باعث بننے والے کالے جادو کو "Spells" یا "Curses" کہا جاتا تھا۔

دراصل جادوگر اپنے جادو کے دوران اس شخص کے بارے میں ایسی خفیہ بددعائیں تحریر کرتے تھے۔ جن سے اس شخص کے جسم اور روح پر بددعاؤں کا ایسا اثر پڑتا کہ وہ تڑپ تڑپ کر مرجاتا۔

اس دور میں مرنے والے بادشاہ یا اہم شخصیت کے مقبرے پر جادو سے بددعائیں تحریر کردی جاتیں تا کہ اگر کوئی اس مقبرے سے بادشاہ کی لاش نکالنے یا قبر میں موجود ہیرے جواہرات نکالنے کی کوشش کرتا تو وہ اس جادو کے اثر سے ہلاک ہوجاتا!

قدیم مصر میں لوگ کم پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ جبکہ جادوگر بننے کے لئے پڑھا لکھا ہونا ضروری تھا۔ جو شخص کسی جادوگر کا شاگرد بن کر کالے جادو کے منتر سیکھ لیتا تھا۔ وہ جادو کے ان کالے علم کو محفوظ کرلیتا اور اپنی آنے والی نسلوں کو منتقل کرتا رہتا۔ اس طرح قدیم جادوگروں کی نسل در نسل جادوگری پروان چڑھتی رہی۔

ایک اہم بات یہ کہ قدیم مصر میں جادو کے عملیات میں دو طرح کے الفاظ استعمال کئے جاتے، اوّل وہ الفاظ جو منہ سے ادا کئے جاتے اور دوئم ایسے الفاظ ہوتے جو کسی فعل کے بارے میں اشکال سے ظاہر کئے جاتے، اس طرح ایک جادوگر جب کسی پر کالے جادو کا منتر پڑھتا تو وہ پہلے منہ سے الفاظ ادا کرتا اور اس کے بعد اشکال میں بتائے گئے عوامل کی طرح عمل کرکے جادو کو مکمل کرتا۔ اس دوران جادو میں ڈانس اور میوزک کا بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

قدیم مصر کے جادو تین طرح کے تھے۔ سب سے پرانا جادو حفاظتی جادو کہلاتا۔ اس جادو کے ذریعے جادوگر اپنے ملک، شہر، قصبے یا بادشاہ کی حفاظت کے لئے ایک حفاظتی حصار قائم کرتے۔ اس جادو کو فصلوں کو تباہ ہونے سے بچانے اور طوفان یا سیلاب کے سدباب کے لئے بھی کیا جاتا۔

دوسری قسم کا جادو "Healing Magic" کہلاتا۔ اس جادو کے ذریعے جادوگر لوگوں کو یا کسی اہم شخصیت کو روحانی یا جسمانی بیماریوں سے نجات دلانے کے لئے استعمال کرتے، اس جادو کے ذریعے جادوگر بخار، پیٹ درد، سر درد، تشنج، زچگی کا درد اور دوسری کئی بیماریوں کا علاج کرتے۔ تیسری قسم کا جادو خطرناک جادو کہلاتا، جسے بددعائیں یا "Curses" کا جادو کہا جاتا۔ اس جادو کے ذریعے دشمن کو تباہ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا، اس طرح کے جادو مصری King Ramesses III کے دور (1184 قبل مسیح سے 1153 قبل مسیح) میں بہت عروج پر تھے۔ حتیٰ کہ بادشاہ پر بھی اس کے مخالف درباریوں، مذہبی پیشواؤں اور حرم کی خواتین نے کالا جادو کروادیا تھا۔ تاہم بادشاہ کے پاس ان سے بھی بڑے جادوگر موجود تھے۔ جنہوں نے اس جادو کا توڑ نکالا اور بادشاہ کے تمام مخالفین کو پکڑلیا گیا اور بادشاہ نے تمام سازشیں کرنے والوں کو قتل کروادیا۔

☆......☆......☆

کالا جادو کرنے کے لئے جادوگر مرے ہوئے انسانوں کی روحوں، بدروحوں، چڑیلوں، جنوں، موکلوں اور شیاطین کو جادو کے منتروں سے تابع کرتے اور ان کی مدد سے کالے جادو کا شکار بننے والے مرد یا عورت کو نقصان پہنچانے کا عمل شروع کرتے، کالے جادو کو "ڈی بلیک آرٹ، ڈارک آرٹ، ڈارک میجک اور شیطانزم بھی کہا جاتا ہے۔"

کالے جادو کے لئے مختلف ادوار اور مختلف علاقوں کے جادوگر جادو کے منتروں کے علاوہ کئی دوسری چیزوں کا استعمال بھی کرتے رہے ہیں۔

الو کا خون، سور کے بال اور ہڈیاں، مگرمچھ کی چربی، انسانی کھوپڑیاں، قبرستان اور شمشان گھاٹ کی مٹی، چمگادڑ کا خون اور اس طرح کی کئی دوسری خوفناک چیزوں کا استعمال جادو کے اثرات کو بڑھانے کے لئے کیا جاتا ہے۔

دنیا کے بڑے جادوگروں نے جادو کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے منتر بنانے اور کسی لافانی روح میں خود کو حلول کرنے کی بھی جدوجہد کی، تاہم ان تمام جادوگروں کو موت سے جیتنے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

کئی جادوگروں کے منتروں سے کسی عورت، بچے یا مرد کے جسم میں کسی بدروح کو حلول کرواکر اس کے جسم پر قابو پالیتے، اور اس کے ذریعے دوسرے انسانوں کو

اذیت پہنچاتے، کسی پتلے پر شکار کا نام لکھ کر جادو کیا جاتا، اس پر سوئیاں چبھونے، کاغذ یا کسی مٹی کے برتن پر شکار کا نام لکھ کر جادو کے منتر لکھنے، کسی پرانی قبر میں بند کر شکار کے پیچھے بدروحوں کو لگانے، کسی جانور کے خون سے شکار کا مادری نام لکھ کر جادو کرنے اور "Curses" کے الفاظ لکھ کر شکار کو پلا کر جادو کرنے والے ہزاروں جادوگر اب بھی دنیا کے مختلف ممالک میں موجود ہیں۔

☆......☆......☆

یورپ میں کالا جادو مصر سے ہی منتقل ہوا تھا۔ "Magic" کا لفظ لاطینی لفظ "Magicos" سے لیا گیا ہے جبکہ لاطینی میں یہ لفظ یونانی زبان کے الفاظ "Magikos" سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصر سے جادو کے منتر قدیم یونان میں پہنچے، جہاں سے جادو ماڈرن یورپ کے ممالک تک پہنچا ہے۔

جادو بنیادی طور پر تین طریقوں سے پھیلا ہے۔ پہلا مختلف رسم و رواج میں جادو کے ٹوٹکے استعمال کرنے سے ایک قوم سے دوسری قوم تک پہنچا۔ اس کے علاوہ جادو کے "Symbolos" یا استعارے استعمال کئے جانے، وہ دوسری نسلوں تک پہنچتے رہے۔ اس کے علاوہ کالے جادو کی اپنی ایک زبان ہے۔ جس میں مختلف ادوار میں مختلف الفاظ کا اضافہ ہوتا رہا۔ اس طرح جادو میں نئے نئے ٹوٹکے داخل ہوتے رہے۔

یورپ میں پرانے وقتوں میں کالا جادو استعمال کرنے والوں کو "وچ اور وچ ڈاکٹر" کہا جاتا تھا۔ یورپ کے کئی علاقوں میں جادوگروں کو "Black Mass" بھی کہا جاتا ہے۔ یورپ کے کئی ممالک میں قدیم افریقی، چینی، جاپانی اور ہندوستانی جادوگروں اور سفلی عملیات کے عاملوں کی پیروی کرنے والے جادوگروں کے اثرات عوامی سطح پر نظر آتے ہیں۔ ان ممالک کے قدیمی علاقوں کے عوامی رسم و رواج اور توہمات میں بھی کالے علم اور جادو سے اخذ کئے گئے اثرات جا بجا نظر آتے ہیں۔

امریکہ میں کالا جادو افریقی غلاموں کے ذریعے پہنچا۔ افریقی ممالک سے امریکہ پہنچنے والے افریقی باشندوں میں سے کئی ایسے تھے۔ جن کے آباؤ اجداد میں "Voodoo" جادوگر بھی شامل تھے۔ ان افریقی باشندوں نے امریکہ میں "ووڈو جادو" کے عملیات کی پریکٹس جاری رکھی۔ ووڈو جادو کو افریقی جادوگر لوگوں کے فائدے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ تاہم اس کی خطرناک قسم "Juju" ہے۔ جسے افریقی کالا جادو تسلیم کیا جاتا ہے۔

ووڈو (سفید جادو) اور جو جو (کالا جادو) کا استعمال موجودہ دور میں بھی امریکہ کے علاوہ فرانس، اسپین اور کئی لاطینی امریکی ممالک میں کیا جاتا ہے۔ لوسیانا، Benin اور ہیٹی میں تو ووڈو کے ہزاروں پیروکار موجود ہیں۔ افریقی کالے جادو "جو جو" کے سب سے زیادہ پیروکار اور جادوگر نائیجیریا میں "جو جو" جادو کے ذریعے 'بلڈ منی' خونی دولت کمانے کے لئے کئی افریقی باشندوں نے اپنے بیوی بچوں اور والدین تک کی روحوں کی قربانی دے دی۔

جو جو جادوگروں کا عقیدہ ہے کہ جادو کے منتروں کے ذریعے جتنی انسانی روحوں کی قربانی دی جائے گی۔ جادو کرنے والے کو اتنی زیادہ دولت ملے گی۔ نائیجیریا میں اکثر امیر افراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ماضی میں جو جو جادو کے عامل رہے ہیں۔ دنیا بھر میں بنگال کے جادوگر، قدیم ہندوستانی دیدوں کا جادو اور کئی افریقی ممالک کے کالے جادو کو شہرت حاصل رہی ہے۔

☆......☆......☆

ماڈرن دور میں کالے جادو پر کئی ناول اور کہانیاں لکھی گئیں۔ بیسویں صدی میں کالے جادو کے موضوع پر جس ہارر ناول نے شہرت پائی وہ "روز میریز بے بی" تھا، جو 1968ء میں لکھا گیا، 1996ء میں چار دوستوں پر ایک فلم "دی کرافٹ" بنائی گئی۔ جنہوں نے سفید جادو کا آغاز کیا۔ لیکن بعد میں وہ ذاتی فوائد کے

لالچ میں کالے جادو میں ملوث ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد کالے جادو پر لکھے گئے ناولوں کی سیریز، ہیری پوٹر کو دنیا بھر میں شہرت ملی۔ اس میں طلبا کو اپنی حفاظت کے لئے کالے جادو کے منتر سکھائے جاتے ہیں۔ ان منتروں کو قدیم یہودی جادوگروں کی کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔

بچوں کو جادو کے گر سکھانے کے لئے ''فاتل مین ناس'' نام کی ویڈیو گیم کو بھی کالے جادو کی کہانیوں کے باعث لاکھوں لوگوں نے دلچسپی سے دیکھا۔ ان کے علاوہ بھی کالے جادو پر دنیا بھر میں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ اور سینکڑوں فلمیں اور ڈرامے بنائے جا چکے ہیں۔

☆......☆......☆

پاکستان اور ہندوستان میں بھی ''جادو'' کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ سائنس کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے، جادو کے گولے یا کسی برقی تار کے بغیر اپنے الفاظ، اپنے خیالات ایک دوسرے تک پہنچانے کے لئے ہزاروں طریقے ایجاد کئے، لیکن عقل و دانش سے پرے ایک ایسی کائنات کے وجود کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جو مافوق الفطرت ہے، یوں تو دنیا بھر میں جادو کی ایک اہمیت ہے۔ وہ ملک جنہوں نے چاند اور دیگر سیارے تسخیر کر لئے ہیں۔ جادو کے عمل کو کوئی سائنسی "Piont of view" نہیں دے سکے۔

بے شک یورپ، افریقہ اور دیگر دنیا میں ''جادو'' کا اپنا نظریہ ہے، لیکن برصغیر میں ہندو مائتھالوجی میں خصوصی طور پر دیوی اور دیوتا بلکہ دیوتاؤں کے لاکھوں تذکرے ملتے ہیں۔

یہاں پر کسی مذہبی کتاب کا حوالہ نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ مذہبی کتابوں کا احترام ہر طبقہ فکر اور ہر دین دھرم والوں کے لئے جذباتی حیثیت رکھتا ہے۔

اور مذہب اسلام میں حکم ہے کہ کسی بھی مذہب کو برا نہ کہو۔

ان کتابوں میں بھی لادین اور لادھرم شیطان کے تذکرے موجود ہیں، جنہیں وہ ماورائی تو نہیں حاصل ہیں۔ جو خاکی انسان کی دانش سے باہر ہے۔ اور جادو کا سارا عمل شیطان سے ہی منسوب ہے۔

ایک عظیم محقق ''پرلوکتا'' جس نے جادو پر بہترین تحقیق کی ہے اور مذہبی کتابوں گیتا، رامائن، وید اور برہما سے اقتباسات لے کر جادو کی نوعیت کو واضح کیا ہے۔

خصوصاً کالے جادو کا تذکرہ اہم ہے اور اس کالے جادو کو یہاں جادو کی دیوی ''کالی دیوی'' سے منسلک کیا جاتا ہے۔ کالی دیوی کی داستان بھی پرلوکتا نے بڑی تفصیل سے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ 38865 دیوی اور دیوتاؤں کے جادوئی مذہب میں نجانے کیا کچھ درج ہے کہ اگر ہم ان کو پڑھیں تو چکرا کر رہ جائیں۔

اس میں جہاں افریقہ، امریکہ، بھارت اور دیگر ممالک شامل ہیں۔ وہاں پاکستان میں بھی جادو پر کافی کچھ لکھا گیا۔ اگر دیکھا جائے تو دنیا بھر میں جادو کی داستانیں بے شمار افراد نے لکھیں، ہر شخص نے بساط بھر اپنی معلومات کے مطابق جادوئی کہانیاں تحریر کیں۔ لیکن یورپ میں جادوئی کہانیاں بڑی محدود ہیں۔ ان کے ہاں زیادہ سے زیادہ "exarsisit" ڈریکولا، ویمپائر اور اس طرح کے کردار ہیں۔

اس طرح چند کردار شری کرشن سے لے کر دھرت تک ہیں۔

لیکن پاکستان میں ہمارے ہاں بے شمار داستانیں ہیں۔ ہمارے ادیبوں نے اس پر لکھا ہے۔

خیر جو بھی کہا جائے لیکن ایک بات ہے کہ یہ پراسرار دنیا انسان کے شعور سے پرے ہے۔ ہم اس پر بہت کچھ لکھتے رہیں گے۔ لیکن اس کا اسرار ہمیشہ ہمارے دل و دماغ پر قائم رہے گا۔ اور اس طرح یہ پراسرار دنیا بھی قائم رہے گی۔

سچا عاشق

طاہر اسلم خان۔ سرگودھا

قصبے سے تھوڑی دور اچانک رات کے اندھیرے میں لوگوں نے دیکھا کہ ایک قلعہ تعمیر ہورہا ہے، مگر اچنبھے میں لوگ تھے کہ قلعہ کو تعمیر کرنے والے مزدور نظر نہیں آرہے تھے اور دھڑا دھڑ کام جاری تھا کہ اچانک.....

چاہت خلوص اور عشق ومحبت کی ایک حقیقی برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والا شاخسانہ

دریا کے پار کی آبادی میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس میں وہ لڑکا دوسرے بچوں کے ساتھ قرآن پاک پڑھنے آیا کرتا تھا مگر کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ لڑکا جن ہے، تمام بچوں میں شاردی نام کی ایک لڑکی بھی قرآن پاک پڑھنے آیا کرتی تھی۔

ایک دن پیش امام صاحب نے اس بچے سے پوچھ ہی لیا۔ ”بیٹا تم کون ہو اور کہاں سے بلاناغہ مسجد میں آتے ہو۔“

”پیش امام صاحب سامنے پہاڑ کے دوسری طرف ایک گاؤں ہے، میں وہیں سے آتا ہوں آپ قرآن پاک بہت ہی خوش الحانی سے پڑھتے ہیں اس لئے میں آپ کے پاس آتا ہوں روزانہ۔“

اس سے آگے پیش امام صاحب کچھ نہ پوچھ سکے یا پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

وہ بچہ تقریباً دو سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا دو سال میں ایک دن بھی ناغہ نہیں کیا۔ اودھر شاروی بھی برابر مسجد میں آ کر قرآن کی تعلیم حاصل کرتی رہی اسی دوران وہ جن زادہ شاروی پر عاشق ہو گیا، عاشق کیوں نہ ہوتا۔

شاروی خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ دونوں ہی نوجوانی کی دہلیز پر تھے۔ یہاں تک اس لڑکے نے قرآن پاک مکمل پڑھ لیا اور شاروی نے بھی قرآن پاک مکمل کر لیا اور پھر اس نے مسجد میں قرآن پڑھنے کے لئے آنا چھوڑ دیا لیکن وہ جن زادہ قرآن حفظ کرنے کے لئے باقاعدہ مسجد میں آتا رہا۔

ایک دن پیش امام صاحب بچوں کو سبق دے رہے تھے کہ وہ لڑکا مسجد کے اندرونی کمرے میں گیا پھر واپس باہر نہیں آیا۔

پیش امام صاحب اس کو دیکھنے کے لئے کمرے کے اندر گئے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا، اسی طرح کئی بار ہوا تو پیش امام صاحب کو کچھ شک ہونے لگا۔

شک والی بات تھی کہ اندر جاتا لیکن باہر کدھر سے جاتا ہے جبکہ باہر نکلنے کا ایک ہی دروازہ تھا، اسی طرح وہ لڑکا دوپہر کے وقت آیا اور سیدھا کمرے کے اندر داخل ہو گیا پہلے کی نسبت اب اس کا جسم بھاری اور چہرہ مختلف لگ رہا تھا۔ پیش امام صاحب اس کے پاس گئے لیکن وہ پہلے ہی غائب ہو چکا تھا پھر وہ شام مغرب کے وقت آیا وضو کیا اور نماز کی تیاری شروع کر دی۔

پیش امام صاحب اس پر برابر نظر رکھ رہے تھے، اب نمازی نماز سے فارغ ہوئے تو پیش امام صاحب کی پہلی نظر لڑکے کو تلاش کر رہی تھی مگر ناکام رہے، اٹھ کر باہر گئے مگر لڑکا نظر نہ آیا۔

پیش امام صاحب کا شک یقین میں بدل گیا کہ ہو نہ ہو یہ ضرور کوئی اور مخلوق ہے، اس کے بعد کسی نے اسے نماز پڑھتے نہیں دیکھا، پھر وہ لڑکا پیش امام صاحب کو کوئی ایک ماہ تک نظر نہیں آیا۔

ادھر شاروی اپنے گھر میں جوانی کی منزلیں طے کرتی ہوئی تقریباً عمر کے سترہویں سال کو پہنچ گئی تھی، ایک روز شاروی اپنی بکریاں لے کر قریبی پہاڑ پر گئی، تو اسے وہاں رہی لڑکا ملا جو مسجد میں قرآن پڑھا کرتا تھا اسے دیکھ کر شاروی گھبرا گئی، وہ نوجوان اس کی طرف آ رہا تھا اب وہاں سے شاروی اپنی بکریاں لے کر دوسری طرف چلی گئی، وہاں بھی وہ آ گیا شاروی نے پھر اپنی بکریاں گاؤں کی طرف موڑ لیں تو یکدم بارش شروع ہو گئی اور تیز آندھی چلنا شروع ہو گئی تو شاروی کی بکریاں شاروی سے جدا ہو گئیں پھر وہ لڑکا شاروی کے قریب آ کر بولا۔ ”شاروی کیوں پریشان ہو۔؟“

شاروی بولی۔ ”میری بکریاں تیز آندھی میں معلوم نہیں کدھر چلی گئیں ہیں، اوپر سے شام بھی ہونے والی ہے۔“

یہ سن کر لڑکا بولا۔ ”شاروی میرے ساتھ آؤ ہم دونوں مل کر تمہاری بکریاں تلاش کرتے ہیں۔“ تو شاروی نہ چاہتے ہوئے بھی اس لڑکے کے ساتھ چل پڑی۔

اچانک شاروی کیا دیکھتی ہے کہ وہ ایک خوبصورت جگہ پر ہے اور اس کی بکریاں بھی وہاں موجود ہیں نہ کوئی آندھی ہے اور نہ کوئی بارش ہے، شاروی کہنے لگی: ”شام ہونے والی ہے میں بکریاں لے کر گھر جاتی ہوں۔“ جب وہ وہاں سے نکلنے لگی تو پھر تیز ہوا چلنے لگی جس کی وجہ سے اس نے اپنی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے پھر ہوا تھم گئی اور جب شاروی نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے دروازے کے قریب تھی۔

شاروی نے گھر میں بکریاں باندھ کر کھانا وغیرہ کھایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی تو کمرہ میں عجیب دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

اس طرح جیسے ٹیوب لائٹ جل رہی ہو یہ دیکھ کر شاروی نے گھبرا کر اپنی والدہ کو آواز دی۔ ”امی جان میرے کمرے میں روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔“

ماں کہنے لگی۔ ”روشنی! تم کیا کہہ رہی ہو۔“ جب اس کی ماں شاروی کے کمرے میں آئی تو وہ

روشنی غائب تھی۔

اس کی امی بولی۔ ”شاروی تمہیں کیا ہو گیا ہے کدھر ہے روشنی بلکہ یہاں تو چراغ جل رہا ہے جو روزانہ جلتا ہے۔“ پھر شاروی کچھ کچھ گھبرانے لگی کہ کچھ بات ضرور ہے۔

پھر کافی دن گزر گئے شاروی بکریاں لے کر جاتی اور وہ لڑکا بلاناغہ شاروی سے ملتا رہا۔ ایک دن شاروی بکریاں لے کر گھر کی طرف آ رہی تھی کہ بارش زوروں کی ہونے لگی۔ تمام بکریاں بارش سے بھیگ گئی تھیں مگر شاروی کے کپڑے بالکل بھی نہیں بھیگے۔ اب شاروی گھر میں داخل ہوگئی تو یہ دیکھ کر حیران و پریشان رہ گئی کہ اس کے کپڑے خشک ہیں۔ ”آخر اس کی کیا وجہ ہے؟“

کسی سے شاروی نے اس بات کا اظہار نہیں کیا۔ جب کمرے میں گئی تو معمول کے مطابق دودھیا روشنی عیاں تھی اور آج تو شاروی کے کمرے میں بہت عمدہ قسم کی خوشبو رچی بسی تھی جب اس نے ایک کونے میں نظر دوڑائی تو لکڑی کے ٹیبل پر بہترین مزے دار گرم گرم کھانا پڑا ہوا تھا یہ دیکھ کر فوراً ماں کے کمرے میں گئی اور ماں سے کہا۔ ”امی جان میرے کمرے میں گرم گرم کھانا کس نے رکھا ہے؟“

ماں بولی۔ ”میں ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے کمرے سے آئی ہوں وہاں تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔“

جب شاروی کی ماں اور باپ کمرے میں گئے دیکھنے کے لئے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ لہٰذا شاروی کی ماں سے باپ بولا۔ ”اب شاروی کی شادی کر دینی چاہئے۔“

شاروی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی وہ ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی ماں بولی۔ ”ارے ابھی بھی جلدی کیا ہے ابھی ہماری بچی کی عمر ہی کیا ہے میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی کہ اتنی جلدی اپنی بیٹی کو ذمہ داریوں کے پہاڑ کو اس کے سر پر لاد دیں۔“

خیر شاروی کے باپ نے ٹھنڈے دل سے شاروی کی ماں کو سمجھایا کہ ”آج کل شاروی کا ذہن ہواؤں میں اڑنے لگا ہے اور پھر.....“ اس نے بات

ادھوری چھوڑ دی۔ درمیان میں شاردی کی ماں بولی ''یہ بات درست ہے۔ اب شاردی کے ہاتھ پیلے کر دینے چاہئے۔''

شاردی کا رشتہ شاردی کے کزن سے طے ہوگیا۔

شاردی کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

شادی کے چار روز پہلے شاردی کی سخت طبیعت خراب ہوگئی اس کو قریبی ڈاکٹر سے چیک کرایا گیا ڈاکٹر نے دوا دی۔ مگر شاردی کو کچھ فرق نہیں پڑا۔

اب بارات آنے میں صرف ایک دن باقی تھا اور شاردی کے ماں باپ بہت فکرمند تھے کہ ''شاردی کی طبیعت اس قابل نہیں بلکہ شاردی پہلے سے زیادہ بیمار ہوگئی ہے شاردی ایسے لگ رہی تھی جیسے کئی مہینوں کی بیمار ہو۔''

صبح بارات آنی تھی اور شاردی اپنی ماں کی گود میں سر رکھے نیند کی غنودگی میں تھی کہ شاردی کو اچانک ایسا لگا کہ جیسے اسے کوئی آواز دے رہا ہے۔

لہٰذا شاردی اپنی ماں سے مخاطب ہوئی۔ ''امی سن رہی ہو یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔''

شاردی کی ماں بولی۔ ''بیٹی سو جاؤ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔''

''صحت کی خرابی کی وجہ اور کمزوری کی وجہ سے تمہیں وہم ہو رہا ہے۔'' شام کے وقت شاردی اپنی ماں سے بولی۔ ''امی ایک گلاس پانی پلاؤ۔'' اور یہ سنتے ہی اس کی ماں پانی لینے چلی گئی تو فوراً ایک خوبصورت لڑکا ہاتھ میں گلاس لئے شاردی سے مخاطب ہوا۔ ''یہ لو پانی پی لو۔''

کمرے میں اچانک اس نوجوان کو دیکھ کر شاردی گھبرا گئی اور کھڑی ہوگئی۔ ''تو...... تو...... تم کون ہو؟''

''گھبراؤ نہیں پہلے پانی پی لو پھر بتاتا ہوں۔''

گھر میں اور بھی کافی مہمان تھے سب یہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ شاردی کس سے باتیں کر رہی ہے جبکہ بظاہر کسی کو کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

اتنے میں شاردی کی ماں پانی لے کر آگئی اور بولی ''شاردی...... شاردی بیٹا ہوش کر تجھے کیا ہوگیا ہے۔''

''ماں...... ماں یہ کون ہے اسے کہو یہاں سے چلا جائے مجھے اس سے ڈر لگ رہا ہے۔'' شاردی بولی۔

''بیٹا تو کس سے بات کر رہی ہے میری طرف دیکھ اور یہ پانی پی لے۔''

''ماں مجھے بھوک لگی ہے۔'' شاردی نے ابھی زبان سے بھوک کا لفظ ادا ہی کیا تھا کہ وہ نوجوان گرم گرم کھانا لے کر شاردی کے سامنے حاضر ہوگیا۔ اور بولا۔ ''شاردی لو کھانا کھالو۔'' آواز سنائی دی۔

''شاردی بہت گھبرائی کہ آخر یہ کون ہے۔'' اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا کہ یہ کون ہے شاردی اس سے کافی گھبرائی گھبرائی باتیں کرتی رہی اور پاس بیٹھے شاردی کی ماں باپ اور دیگر مہمان بہت پریشان ہو رہے تھے کہ شاردی کس سے اور کیسی کیسی باتیں کر رہی ہے۔

یکدم شاردی بولی۔ ''تم لوگ سب یہاں سے چلے جاؤ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

تمام افراد شاردی کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے تو وہ نوجوان انسانی شکل میں شاردی کے سامنے کھڑا تھا اسے دیکھ کر شاردی ڈر گئی اور اٹھ کر بھاگنے لگی کہ پھر نہ جانے شاردی کو کیا ہوا کہ فوراً اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ ''تم...... تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔''

گھبراؤ نہیں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''کک کیا...... محبت مجھ سے، میری تو کل بارات آنے والی ہے۔''

''تو کیا بارات کو واپس کرا دوں۔''

وہ نوجوان بولا۔ ''آخر تم کون ہو؟''

''شاردی تم نے مجھے پہچانا نہیں، میں وہی اجنبی نوجوان ہوں جو تمہارے ساتھ مسجد میں قرآن پاک پڑھنے آیا کرتا تھا تم مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی تھیں اور اسی وقت سے میں تم سے محبت کرتا ہوں تمہارے

کمرے میں خوشبو بھی میں نے پھیلائی تھی اور تمہارے کمرے میں گرم گرم کھانا بھی میں نے رکھا تھا۔"

نوجوان کی باتیں سن کر شاروی گم صم سوچوں میں ڈوب گئی، اور اب کیا ہو سکتا ہے شاروی کو خاموش دیکھ کر وہ بولا۔

"شاروی کیا سوچ رہی ہو؟"

"میں سوچ رہی ہوں کہ اب میری شادی بھلا تم سے کیسے ہو سکتی ہے۔" اب اس وقت شاروی بالکل تندرست توانا اور پرسکون تھی جیسے اسے کوئی بیماری نہ ہو۔ اور یہ سب کچھ اس جن لڑکے کا کیا کرایا تھا۔

اتنے میں فجر کی اذان کا وقت ہو گیا وہ شاروی سے اگلی ملاقات کا کہہ کر غائب ہو گیا۔

شاروی بہت حیران تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے شاروی نے اپنی ماں کو آواز دی، ماں نے آتے ہی شاروی سے پوچھا۔ "شاروی تم کس سے باتیں کر رہی تھی۔"

شاروی نے اپنی ماں سے سب کچھ صاف صاف بیان کر دیا کہ "ماں معلوم نہیں وہ کون نوجوان ہے، مجھے تو وہ کوئی اور ہی مخلوق لگتا ہے، کہہ رہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

شاروی کی ماں یہ سن کر بہت فکر مند اور پریشان ہو گئی اور اب آہستہ آہستہ صبح کا اجالا ہر سو پھیل چکا تھا اور گھر کے دیگر افراد نیند سے بیدار ہو گئے تھے۔ اور گھر میں گہما گہمی نظر آ رہی تھی اور آہستہ آہستہ وقت گزر رہا تھا۔

اور پھر وہ وقت آ پہنچا ایک گھنٹہ بعد بارات آ گئی۔ قاضی صاحب کو بلایا گیا۔ قاضی صاحب اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے تو چند لوگ اس پالکی کی طرف بڑھے جس میں دولہا موجود تھا، مگر یہ کیا پالکی خالی پڑی تھی یعنی پالکی میں دولہا موجود نہیں تھا۔ سارے باراتی اور گاؤں والے حیران و پریشان تھے کہ دولہا کہاں چلا گیا چپہ چپہ چھان مارا گیا مگر دولہا غائب تھا۔

جب یہ خبر شاروی کو ملی تو شاروی گھبرانے لگی اور سمجھ گئی کہ یہ سب کچھ اسی جن لڑکے کا کیا دھرا ہے۔ ادھر تمام کھانا جو باراتیوں کے لئے پکایا گیا تھا وہ سب کا سب دیگ سے غائب ہو چکا تھا۔

حیرانی بڑھ گئی تھی لوگ سہمے ہوئے تھے اور پھر اسی تگ و دو میں شام ہو گئی دولہا نہ ملا تو بارات والے مایوس اور پریشان ہو کر واپس اپنے گاؤں چلے گئے جب سارے باراتی اور گھر والے روتے پیٹتے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ دولہا میاں اپنے گھر میں سوئے ہوئے تھے اور یہ دیکھ کر سب کے سب گھبرا گئے اور پھر جب اس سے پوچھا کہ "تم کہاں تھے اور یہاں کیسے پہنچ گئے تم نے ہماری ناک کٹوا دی، ہماری بہت بے عزتی کروائی اور اگر یہ شادی تمہیں منظور نہ تھی تو پہلے بتا دیتے۔"

دولہا اب ہوش میں آ چکا تھا اس نے بتایا کہ "مجھے تو خود معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں، مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ کسی نے مجھے بہت آرام سے اٹھا کر یہاں لا کر چھوڑ دیا۔ اور پھر غائبانہ آواز سنی تھی کہ "اس لڑکی سے اگر تم نے شادی کی تو تمہیں جان سے مار دیا جائے گا وہ صرف میری ہے۔" پھر اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں۔"

ادھر شاروی کے گھر والے بہت پریشان تھے کہ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

جب بارات واپس چلی گئی تو وہ جن لڑکا انسانی شکل میں شاروی کے کمرے میں آیا اور مبارکباد دی۔ "اب تم بے فکر ہو جاؤ میں تم سے شادی کے لئے تیار ہوں۔" اب شاروی کا ڈر و خوف اس نوجوان سے نکل چکا تھا اس نے سوچا کہ اب اس کے ساتھ نرمی برتی جائے تو ٹھیک رہے گا، شاروی نے اس سے محبت سے پوچھا کہ "تم کون ہو؟ تمہارا گھر کہاں ہے تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟" دراصل شاروی سمجھ گئی کہ اس کا تعلق قوم جنات سے ہے اس لئے اس سے طریقے اور اخلاق سے بات کرو ورنہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

شاروی نے عقل مندی سے اس سے سب کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی اور جب بھی وہ شاروی سے ملتا

شاردی ایک بات ضرور نوٹ کرتی کہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک دمکتی تھی، اس طرح شاردی نے اس سے کافی سوالات پوچھے۔

ایک دن شاردی کا باپ کمرے میں آیا تو وہ لڑکا فوراً غائب ہوگیا۔ شاردی اس سے باتیں کررہی تھی کہ شاردی کا باپ پوچھ بیٹھا۔ "بیٹی تم کس سے باتیں کررہی ہو؟"

"ابا میں اس لڑکے سے باتیں کررہی ہوں کیا آپ کو نظر نہیں آرہا۔

"پتر کدھر اے۔"

شاردی بولی۔ "ابا جی یہ کھڑا ہے۔" تو اس کا باپ بولا۔ "بیٹی مجھے تو کوئی بھی نظر نہیں آرہا۔"

یہ سن کر اس کا باپ بولا۔ "تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں خیر چلو تمہیں تمہاری ماں بلارہی ہے۔"

اتنے میں شاردی کی ماں بھی ادھر ہی آگئی تو باپ بولا۔ "شاردی کی ماں لگتا ہے شاردی پاگل ہوگئی ہے۔" یہ سن کر ماں آنسو بہانے لگی اور ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کرنے لگی۔ "یا اللہ میری بچی کو ٹھیک کردے۔"

اتنے میں وہ جن لڑکا پھر آنے کا کہہ کر اس جگہ سے غائب ہوگیا۔

شاردی نے اپنی ماں باپ اور خالہ ماموں اور دیگر لوگوں سے تفصیل سے بات کی کہ "ایک لڑکا ہے پر معلوم نہیں کہ کون ہے مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے میرا یقین ہے کہ وہ کوئی جن ہے جو مجھ پر عاشق ہوگیا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ وہ مجھے یا میرے گھر والوں کو نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔"

یہ سن کر شاردی کا ماموں بولا۔ "اب وہ اگر آئے تو اس سے کہنا کہ "میرے ماموں سے پہلے مل لو۔"

خیر رات کا اندھیرا پھیلتے ہی لڑکا دوبارہ آگیا تو شاردی اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے تمہیں میرے ماموں سے ملنا ہوگا۔"

یہ سن کر وہ بولا۔ "ٹھیک ہے۔"

تو شاردی نے فوراً اپنے ماموں کو آواز دی تو اس کے ماموں آگئے تو وہ لڑکا کمرے میں انسانی شکل میں موجود تھا۔ "تم شاردی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" ماموں نے پوچھا۔

"جی میں شاردی سے محبت کرتا ہوں بلکہ عشق کرتا ہوں شاردی کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے اگر تم شاردی سے واقعی محبت کرتے ہو اور شاردی کے خواہش مند ہو تو اس کا ثبوت دینا ہوگا اس کے لئے ہماری ایک شرط ہے اگر تم کو ہماری شرط منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ تم دوبارہ شاردی سے شادی کی ضد نہیں کرو گے اور نہ ہی تم اسے تنگ کرو گے۔"

یہ سن کر وہ بولا۔ "مجھے ایک نہیں آپ کی ہر شرط منظور ہے آپ اپنی شرط بتائیں۔"

جن زادہ کی ہمت و حوصلے کو دیکھتے ہوئے ماموں بولے۔ "تم ایک رات میں میری بھانجی کے لئے ایک خوبصورت قلعہ تعمیر کروگے، اگر تم اذان فجر سے پہلے پہلے قلعہ تعمیر نہ کرسکے تو دوبارہ شاردی سے شادی کی ضد نہیں کروگے اور شرط ہار جاؤ گے۔"

جن لڑکے نے کہا۔ "مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے اگر میں یہ شرط ہار گیا تو میرا وعدہ ہے کہ میں شاردی سے بالکل رابطہ نہیں رکھوں گا بلکہ اس کی دنیا سے بہت دور چلا جاؤں گا۔"

شاردی کے ماموں سے یہ الفاظ کہہ کر وہ غائب ہوگیا۔ شاردی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اپنے ماموں سے مخاطب ہوئی۔ "اگر یہ شرط جیت گیا تو پھر آپ کو اپنی شرط ماننی پڑے گی پھر کیا ہوگا۔؟"

شاردی کا ماموں بہت سمجھدار و عقل مند تھا اس نے کہا۔ "تم بے فکر رہو میں جانوں اور میرا کام اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکالے گا۔"

ادھر شام کے بعد رات کا اندھیرا ہر سو مسلط ہوگیا، رات کے 8 بج چکے تھے اور قلعے کی تعمیر کا کام شروع ہوچکا تھا۔ دیکھنے والوں کی زبانی معلوم ہوا کہ قلعہ کی تعمیر بدستور ہورہی تھی۔ بڑے بڑے پتھر

اور ساری چیزیں اس جلدی میں تھیں جو تعمیر کرنے والے نظر نہیں آ رہے تھے، راہ گیر بھی حیران و پریشان تھے کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے قلعہ کی تعمیر جاری تھی کہ اچانک شاردی کے ماموں کو خیال آیا، جب اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا تو رات کے چار بج چکے تھے مگر قلعہ کی تعمیر زور و شور سے شروع تھی۔

شاردی کا ماموں فوراً مسجد میں گیا اس کو پتہ تھا کہ اب میں تھوڑی دیر بعد شرط ہار جاؤں گا اور یہ سوچ سوچ کر شاردی کا ماموں بہت پریشان تھا خیر اس نے فوراً وضو کیا اور لاؤڈ اسپیکر میں اذان فجر دے دی۔

اذان کا سننا تھا کہ تمام جن جس حال میں اور جہاں جہاں کام کر رہے تھے وہیں پر کام چھوڑا اور سب کے سب وہاں سے غائب ہو کر چلے گئے۔

ادھر جب پیش امام صاحب نے گھڑی میں ٹائم دیکھا تو کہا ''کس نامعقول نے اذان دے دی وقت سے پہلے۔''

اب پیش امام صاحب کو سب کچھ معلوم ہو گیا تھا انہوں نے وضو کیا اور وقت مقررہ پر اذان دی۔ پیش امام صاحب بھی عقل مند انسان تھے۔

خیر صبح کا اجالا جب ہر سو پھیل گیا تو وہ خوبصورت جن لڑکا انسانی شکل میں نمودار ہوا اسے دیکھ کر شاردی ڈر گئی۔

''ڈرو نہیں میں تمہارا آخری دیدار کرنے آیا ہوں، مبارک ہو تم کو، تم شرط جیت گئی ہو اور میں ہار گیا ہوں وعدے کے مطابق میں تمہاری زندگی اور تمہاری دنیا سے بہت دور جا رہا ہوں اگر میرے لائق کوئی خدمت کبھی بھی اور کسی بھی وقت پڑے تو مجھے فوراً قلعہ والی جگہ پر جا کر آواز دینا میرا نام لے کر میرا نام حسان ہے میں خدمت کے لئے حاضر ہو جاؤں گا اور جب تک تمہاری اولاد اس دنیا میں رہے گی کوئی بھی جن تم لوگوں کو تنگ نہیں کرے گا اور میں بغیر تمہاری اجازت کے بھی اس علاقے کی طرف رخ نہیں کروں گا تمہارا شہر اور قلعہ تمہیں مبارک ہو۔'' اور یہ کہہ کر جن غائب ہو گیا اس کی آنکھوں میں نمایاں طور پر آنسو نظر آ رہے تھے

شاردی نے اسی وقت خدا کا شکر ادا کیا اور سجدے میں گر گئی اور جب یہ تمام باتیں گھر والوں کو معلوم ہوئیں تو گھر کے سارے افراد بہت خوش ہوئے، چند دن بعد شاردی ڈرتی ڈرتی قلعہ کی طرف گئی تو قلعہ دیکھ کر حیران و پریشان رہ گئی کہ بہت ہی خوبصورت قلعہ اپنی جگہ موجود تھا۔

شاردی سوچنے لگی کہ ''کاش اگر یہ قلعہ کسی انسان نے میری محبت میں بنایا ہوتا تو کتنا مزہ آتا۔''

پورے گاؤں بلکہ آس پاس کے علاقے کے بے شمار لوگ قلعہ دیکھنے کے لئے آئے تو دیکھا کہ قلعہ واقعی مکمل ہو چکا تھا اگر کمی رہ گئی تھی تو صرف اور صرف قلعہ کی چھت جو کہ مکمل ہونے سے رہ گئی تھی، دوسری بات قلعہ اتنی مہارت سے تعمیر کیا گیا تھا کہ جو ایک دفعہ قلعہ کو دیکھ لیتا اسے حیرانگی لازمی ہوتی کیونکہ بنانے والوں نے بنایا ہی عجیب و غریب تھا اس کی چار دیواریں تھیں اور ان دیواروں میں چار بڑے بڑے پتھر استعمال ہوئے تھے نقش و نگار بہت خوبصورت بنائے گئے تھے نہ معلوم اتنے اچھے اور خوبصورت پتھر کہاں سے تلاش کر کے لائے گئے تھے۔

یہ خوبصورت اور لاجواب قلعہ آج بھی اسی طرح موجود ہے نہ اس میں کوئی اضافہ ہوا اور نہ کوئی کمی واقع ہوئی جہاں جہاں اور جیسے جیسے استعمال کے پتھر رکھے تھے آج بھی ویسے کے ویسے ہی پڑے ہوئے ہیں یہ قلعہ ایک جن نے ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو کر تعمیر کیا تھا۔

اگر یہ حقیقت پڑھنے والوں کو کوئی شک ہو تو وہ یہ قلعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

یہ قلعہ آزاد کشمیر کے دارالخلافہ مظفر آباد سے 180 کلومیٹر کے فاصلے پر وادی نیلم میں واقع ہے۔

بھیانک موت

ایس امتیاز احمد - کراچی

میدان میں پڑے ہوئے صندوق کو اس جگہ موجود لوگوں نے دیکھا جو کہ بالکل خالی تھا مگر پھر پلک جھپکتے ہی صندوق میں جواں سال حسین دوشیزہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی۔

دل میں ہیجان برپا کرتی اپنی نوعیت کی عجیب و غریب ذہن سے محو نہ ہونے والی کہانی

مانیکل نے ریت کی چکاچوند سے آنکھوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کے سامنے انگلیوں کی باڑ کھڑی کردی اور ان کی دراڑوں سے دور کھڑے درختوں کو دیکھنے لگا۔ جو دوری کے باوجود طمانیت کا احساس دلا رہے تھے۔ اسے وہاں پڑے ہوئے کوئی چار گھنٹے ہو چلے تھے لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے نہ جانے کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔ ان چار گھنٹوں نے اسے صدیوں پیچھے جا پھینکا تھا جہاں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سرخی مائل ریت کے ٹیلوں میں مدفون نظر آتی تھی۔ ہوش آنے پر اسے پہلا احساس پیٹ اور سینے کی جلن کا ہوا تھا اور اگر وہ پسینے میں زبرتر نہ ہوتا تو گرم ریت اس کے سینے اور پیٹ کو جھلسا کر رکھ چکی ہوتی۔

اسے یہ تو علم تھا کہ وہ کہاں سے چلا تھا لیکن یہ علم نہ تھا کہ کہاں ہے۔ علم اور بے علمی کے مابین ایک گہرا بیکراں سمندر تھا جسے پار کرکے وہ اس جگہ جھلستی ہوئی ریت پر تھکن سے چور اور بھوک سے نڈھال پڑا تھا۔

اسے سفر کے صرف پہلے دو دن یاد تھے۔ تیسرا اس لئے یاد نہ تھا کہ اس روز سورج طلوع ہونے سے پہلے جہاز کو طوفان نے آ گھیرا تھا۔ دوسرے مسافروں کی طرح وہ بھی نیند کی آغوش میں تھا کہ اچانک غل غپاڑے سے آنکھ کھل گئی۔ جہاز ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ جلدی سے جوتے میں پاؤں ڈال کر بھاگم بھاگ عرشے پر گیا تو وہاں بھگدڑ مچی تھی۔ عورتوں، بچوں کے چیخنے چلانے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی پھر اس نے جہاز کے عملے کو لائف بوٹ سمندر میں اتارتے دیکھا اور لوگ لائف بوٹ کو اپنی بقا کا ضامن سمجھتے ہوئے اپنے وجود کو ان کے حوالے کرنے لگے۔

جہاز کا عملہ سخت مشکل میں گرفتار تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر مسافروں سے ڈسپلن قائم رکھنے کی درخواست کی جارہی تھی لیکن ان کے کان تو صرف لائف بوٹ کے انجن کی صدا سن رہے تھے جو انہیں پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور جو کہہ رہی تھی۔ "آؤ جلدی! اپنا سارا زور لگادو! دوسروں کو دھکے دے کر پیچھے دھکیل دو اور خود آگے بڑھو۔ مت دیکھو کہ تم میں بوڑھے اور کمزور بھی ہیں، عورتیں اور بچے بھی ہیں، آگے بڑھو! موت سے بچنا ہے تو آکر مجھ سے لپٹ جاؤ۔"

مانیکل بھی اپنے دو ساتھیوں کو کیبن میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ جب نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا تھا تو نیگرو جوزف عرف جو اور اطالوی انتونیو عرف پیٹر وہسکی کے نشے میں گردوپیش سے غافل پڑے تھے۔ جس نے مانیکل کو

انہیں جگانے نہ دیا ورنہ وہ انہیں وہاں چھوڑ کر نہ آتا۔ لیکن عرشے کے منظر نے اسے ایسا کٹھور اور خود غرض بنا دیا کہ لائف بوٹ کی کشش نے دوستوں کا تصور تک اس کے ذہن سے نکال دیا۔ اس سے وہ اپنے ساتھی جوکو فراموش کر چکا تھا اور ہمراز پنچو کو بھول چکا تھا۔ اسے صرف اپنی بقا اور ہا تھا اور سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کا غیض وغضب۔ وہ ان بپھری ہوئی لہروں کے رحم وکرم پر کٹنے گھنٹے جو صدیوں محیط تھے، اس کا اسے احساس نہ تھا۔ اسے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ لہروں کا بہاؤ اسے کس طرف لے جارہا تھا۔ تاڑ کے درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اپنی سوچ میں یوں ڈوبا ہوا تھا کہ اسے اس سیاہ فام کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا جو جانے کہاں سے نکل کر اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔

اس کا سایہ اپنے سامنے دیکھ کر مائیکل نے پیچھے سر گھمایا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ اس کے ڈراؤنے چہرے سے خوفزدہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس جگہ کسی خوش شکل اور خوش پوش انسان سے ملنے کی توقع نہیں تھی۔ زرد وہ یوں گیا تھا کہ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا تھا۔

اسے یہ جاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی تھی کہ وہ تہذیب وتمدن سے بہت دور گمنام جزیرے میں نکل آیا ہے۔ وہ دل مضبوط کر کے نیم برہنہ سیاہ فام کی طرف دیکھ کر مسکرایا جیسے دوستی اور خیر سگالی کا پیغام دے رہا ہو۔ لیکن جواب میں سیاہ فام نے جھک کر اس کا ریت پر پھیلا ہوا بازو سختی سے پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

مائیکل کے گھٹنوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اپنے آپ کو اس سے چھڑا کر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو سکتا، سو وہ اسی طرح پڑا رہا۔ شاید سیاہ فام اس کی کیفیت کو جان گیا تھا۔ چنانچہ وہ اسے مرے ہوئے کتے کی طرح گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ اس کی انگلیوں کے شکنجے میں مائیکل کی کلائی جیسے پس رہی تھی اور گھٹنے ریت کی رگڑ سے چھلتے جارہے تھے۔ لیکن رحم کا اس جزیرے پر کوئی گزر نہ لگتا تھا اور سیاہ فام اسی ماحول کی پیداوار تھا۔

جب وہ تاڑ کے درختوں سے کچھ دور رہ گئے تو سامنے سے اسی وضع کے دو آدمی آتے دکھائی دیئے۔ قریب آکر دونوں نے مائیکل کو لانے والے سے کچھ سوال جواب کیے۔ اور پھر وہ بھی مائیکل کو گھسیٹنے کے کار خیر میں شریک ہوگئے۔ وہ تاڑ کے جھنڈ سے نکل کر میدان میں آئے، جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرکنڈوں اور ناریل کے پتوں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ جھونپڑیاں خاص انتظام سے بنائی گئی تھیں اور یہ ذہانت کی علامت تھیں، مائیکل کو ایک گونہ اطمینان ہوا کہ وہ شعور سے قطعی عاری انسانوں کے درمیان میں نہیں۔ اسے لے جا کر ایک جھونپڑی میں مردہ جانور کی طرح ڈال دیا گیا۔

ان کے جانے کے بعد اس نے چاروں طرف دیکھا۔ زمین پر گھاس کے سوا ایک تنکا تک نہ تھا۔ چھت بھی نہیں تھی۔ اس بات سے اسے خیال گزرا کہ یہ مویشی باندھنے کی جگہ ہوگی۔ بہرحال اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو یہاں بڑا سکون مل رہا تھا اور اسی سکون نے تھپکیاں دے کر اسے سلا دیا۔

اور پھر اس کے سر پر ایک زوردار ٹھوکر لگی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ سر کو تھامتے ہوئے اس کی نظر دو بھدی بھدی بے ڈول ٹانگوں پر پڑی اور اوپر سرکتی ہوئی ہو بہو ایک ویسے ہی چہرے پر جا رکی جس کے نمونے وہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ کچھ دیر تک وہ شخص اسے قصائی کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے سرہانے اکڑوں بیٹھ گیا۔ "کلوٹے خنزیر!" مائیکل نے اسے اپنی طرف تکٹکی باندھے دیکھتا پا کر کراہت سے انگریزی میں کہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور پلکیں جھپکائے بغیر مائیکل کو دیکھتا رہا۔

"جا دفع ہو!" مائیکل نے کہا تو وہ اچانک اٹھ کر چلا گیا جیسے اس نے مائیکل کی زبان سمجھ لی ہو۔ اس کے جانے کے بعد مائیکل نے اپنا ایک گال نرم گھاس پر رکھ دیا اور خوف آمیز مایوسی کے اندھے کنوئیں میں لٹک گیا۔ سیاہ فام جنگلیوں کے بارے میں اس نے بھی سنا اور

پڑھا تھا، قلمیں بھی رکھی تھیں کہ وہ سفید چمڑی کے ازلی دشمن ہیں۔ انہیں اپنے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھادیتے یا کھا جاتے ہیں۔

وہ وسوسوں کے یہی تانے بانے بن رہا تھا کہ ایک اور کالا بھجنگ دونوں ہاتھوں پر کیلے کے بڑے بڑے پتے اٹھائے ہوئے آیا اور انہیں مائیکل کے سامنے رکھ دیا۔ ان پتوں پر کچا ناریل تازگولے، کیلے، کھجوریں اور چٹنی جیسی کوئی چیز تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور ان نعمتوں پر پل پڑا۔ چٹنی جیسی چیز اسے بے حد مزے دار لگی اور اس نے پتہ بھی چاٹ ڈالا سیاہ فام خالی پتے اٹھا کر چلا گیا اور مائیکل کے جسم میں کچھ توانائی آئی تو وہ اٹھ کر چاردیواری میں ٹہلنے لگا۔

تارے ایک ایک کرکے جاگنے لگے تھے اور ہر سو بڑھتی ہوئی تاریکی میں ان کی جھلملاہٹ دل کی کچھ تقویت کا باعث بن رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر رات گزارنی پڑی تو اس بے چھت جھونپڑی میں اس کا کیا حال ہوگا وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ دو آدمی آئے اور اس کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ پھر انہوں نے اس کا ایک ایک بازو تھام لیا۔

مائیکل نے انہیں خود کو گھسیٹنے کا موقع نہ دیا اور خود ہی قدم آگے بڑھادیئے۔ چاردیواری سے نکل کر وہ اسے ایک سمت میں لے چلے۔ ساری جھونپڑیوں میں اندھیرا تھا۔ البتہ باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی جسم کی جھلک نظر آجاتی یا کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دے جاتی۔ وہ دونوں مائیکل کو لئے ایک جھونپڑی کے پاس پہنچے اور اسے اندر دھکیل دیا جس کے چاروں کونوں پر تین فٹ لمبی روغنی مشعلیں گڑی ہوئی تھیں۔ ساری آبادی میں صرف یہی ایک جھونپڑی روشن تھی اور بڑی بھی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے خود کو دس سرخ رنگی آنکھوں کا نشانہ پایا۔ پانچ آدمی قطار میں چٹائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ درمیان میں بیٹھے ہوئے شخص پر نظر پڑتے ہی وہ جان گیا کہ جزیرے کا حکمران یا قبیلے کا سردار یہی ہوگا۔ اس نے گردن سے کمر تک ضرب کے نشان کی طرح ایک سرخ پٹکا باندھ رکھا تھا۔ ماتھے پر سرخ کپڑے کی پٹی بندھی تھی۔ اور مشعلوں کی روشنی میں اس کا بڑا سا گنجا سر چمک رہا تھا۔ اس کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے دو آدمی چھریرے بدن اور مضبوط کاٹھی کے تھے اور چہرے مہرے سے زیادہ خونخوار نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں دو دو فٹ کے بھالا نما ہتھیار تھے۔ چاروں کے سروں پر بال کے نام پر چھوٹی چھوٹی گھنگھریالی سیاہ گھاس ہی تھی اور سب نے کیلے اور ناریل کے پتوں سے اپنے جسم کی ستر پوشی کر رکھی تھی!

سردار جھونپڑی میں چھائی بھیانک خاموشی میں بڑی دیر تک اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے اسے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ مائیکل اکڑوں بیٹھ گیا تو سردار اپنے دائیں جانب بیٹھے ہوئے موٹے آدمیوں سے کھسر پھسر کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک ہتھیار بند آدمی سے کچھ کہا۔ وہ اٹھ کر مائیکل کے پاس آیا اور اسے اٹھانے لگا تو مائیکل خود ہی کھڑا ہوگیا۔

اگلے لمحے وہ اس آدمی کے ساتھ جھونپڑی سے باہر تھا۔ ان چند لمحوں بعد اسے ایک چھت والی جھونپڑی میں پہنچادیا گیا، جو باقی جھونپڑی سے الگ تھلگ ایک سرے پر تھی۔

اس جھونپڑی میں ایک طرف کھجور کے پتوں کی چٹائی تھی اور ایک کونے میں مٹکے جیسا مٹی کا ایک بڑا سا برتن تھا اور اس کے قریب ناریل کا ایک پیالہ نما خول پڑا تھا۔ چھت میں جگہ جگہ سوراخ تھے جن سے کہیں کہیں تارے جھانک رہے تھے۔ مائیکل جھونپڑی میں آتے ہی چٹائی پر لیٹ گیا۔ اس نے کھانے کے بعد پانی نہیں پیا تھا لیکن اسے پیاس بالکل نہیں محسوس ہورہی تھی۔ اور خلاف توقع اس پر غنودگی بھی طاری ہورہی تھی۔

ابھی اس کی آنکھ نہیں لگی تھی کہ جھونپڑی میں آہٹ سی ہوئی اور اس نے دروازہ نما آڑ کی طرف سر گھما کر دیکھا تو سردار جھونپڑی میں داخل ہورہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور متجسس نظروں سے سردار کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آکر

چٹائی پر مائیکل کے پاس ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں مائیکل کو اس کا چہرہ اچھی طرح نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ صرف اس کا ہیولہ دیکھ سکتا تھا اور اس کی آنکھوں کی تپش اور چمک کو محسوس کرسکتا تھا۔ جھونپڑی میں سردار کی بھاری بھاری سانسوں کے سوا ہلکی سرسراہٹ تک نہ تھی۔ مائیکل کا سینہ بھی اس غیر یقینی صورت حال سے دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

''اجنبی!'' معاً سردار کی گھمبیر سرگوشی ابھری تو مائیکل اچھل پڑا۔ سردار نے یہ لفظ یورپی لہجے کی انگریزی میں ادا کیا تھا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو!'' سرگوشی سے پھر اس کے کان کے پردے تھرتھرانے لگے۔ ''اور مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم صرف ایک شکار ہو جو شکاریوں کے نرغے میں خود کھنچے چلے آئے ہو اور شکاریوں کے سینے میں رحم نہیں ہوتا ہے۔ یہ رات تمہاری زندگی کی آخری رات بھی ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ میرے مشیروں نے مجھے مشورہ دیا تم سفید فام انسانوں کے خون کے پیاسے لوگوں میں آگئے ہو اور صبح کا چڑھتا ہوا سورج کنوں کو تمہاری ہڈیاں بھنبھوڑتے دیکھ سکتا ہے۔ سن رہے ہو؟''

اندھیرے میں مائیکل نے جلدی سے گردن ہلادی جیسے سردار اسے دیکھ رہا ہو۔

''لیکن...... لیکن میں ایک مختلف طریقے سے سوچنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہوں۔'' سردار کہہ رہا تھا کیونکہ میں ایک جزیرے پر حکومت کرتا ہوں۔ یہ سب میری رعایا ہیں۔ میں ان سے افضل ہوں اور اسی لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری جان بخش دی جائے بشرطیکہ......'' وہ کہتے کہتے رکا اور جھونپڑے میں ایک بھیانک سکوت طاری ہوگیا۔ باہر ہوا ساکت تھی جیسے سردار کی سرگوشی نے اسے بھی دم بخود کردیا ہو۔ ''بشرطیکہ تم ایک فرد کو ٹھکانے لگادو۔ اس کے بعد میں تمہیں یہاں سے زندہ سلامت نکل جانے دوں گا۔ کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہ کرسکے گا۔ تمہیں حفاظت سے کشتی میں سوار کرادوں گا۔ کیا کہتے ہو؟''

''اں!'' مائیکل چونکا۔ سردار نے اس کی پسلی میں ٹہوکا دیا تھا جیسے اس کی آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے کی عادی تھیں۔ ''کیسے؟ کیسے؟'' مائیکل بہ مشکل کہہ سکا۔

''سب کچھ بتادیا جائے گا!'' سردار نے کہا۔ ''لیکن تمہیں یہ کام مکمل رازداری سے کرنا ہوگا!''

''منظور ہے مجھے!'' مائیکل کو اپنی زندگی کے سامنے دوسری زندگی ہیچ نظر آئی۔

''بہت اچھے!'' سردار نے اسے پیٹھ پر تھپکی دے کر شاباش دی۔ ''کبھی...... کسی کو قتل کیا ہے؟''

''آں...... ہاں......'' مائیکل نے جلدی سے کہا۔

''پھر تو تمہارے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے!'' سردار بولا۔ ''بس تیار رہو۔ البتہ تمہارے پاس اس فرد کو ٹھکانے کے لئے کوئی ہتھیار نہیں ہوگا۔ اس لئے تمہیں گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالنا ہوگا اور پھر اس کی لاش کو سمندر میں پھینک دینا ہوگا۔ سمجھے......؟''

مائیکل نے بہ مشکل تھوک نگلا۔

''یہ نہ سمجھو کہ میں خود اسے دنیا سے رخصت نہیں کرسکتا یا اپنے کسی آدمی سے نہیں کراسکتا۔ میں اسے چیونٹی سے مسل سکتا ہوں یا اس کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کراسکتا ہوں لیکن ایک وجہ کے سبب میں ایسا کرنا نہیں چاہتا اور تمہیں یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

قتل کرنے کا تصور مائیکل کے لئے چنداں کٹھن نہیں تھا لیکن گلا گھونٹنے کے خیال سے اس کا پتہ پانی ہورہا تھا۔ وہ یہاں کے قوی الجثہ لوگوں کو دیکھ چکا تھا۔ کسی کا گلا اتنا نرم نظر نہ آیا تھا کہ اس کی انگلیوں سے دب سکے۔ وہ گلا دباتا ہی رہ جائے گا اور اس کے اپنے جبڑے ٹوٹ چکے ہوں گے یا گلا نیاں موڑ دی جاچکی ہوں گی۔

''کیا کسی ہتھیار سے یہ کام نہیں ہوسکتا؟'' اسے اپنی سرگوشی بڑی لرزاں لگی۔

''نہیں!'' سردار نے دانت بھینچ کر کہا جیسے اسے مائیکل کی بات بڑی احمقانہ لگی ہو۔ ''اس کا گلا گھونٹنا تمہارے لئے مشکل نہ ہوگا۔ وہ ایک لڑکی ہے!''

”لڑکی!“ مائیکل کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”میں تمہیں اس سے گھلنے ملنے کا پورا موقع فراہم کروں گا!“ سردار نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا! ”لیکن تم اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرو گے۔ میری نظریں ہر وقت تمہارا پیچھا کرتی رہیں گی۔ تمہاری ہر حرکت میری نظروں میں ہوگی! سنا تم نے!!“

”ہاں!“ مائیکل نے مری ہوئی آواز میں بولا۔

”وہ لڑکی کنواری ہے اور اسے دنیا سے کنواری ہی جانا ہے۔“ سردار نے کہا۔ ”اب میں جا رہا ہوں۔ صبح ملاقات ہوگی اور ہاں...... تم کسی کے سامنے مجھ سے بات نہیں کرو گے۔ یہ سمجھو کہ مجھے انگریزی نہیں آتی دراصل یہاں انگریزی کسی کو بھی نہیں آتی۔ تم اپنی ہر ضرورت ان سے پوری کراؤ گے۔ اس لڑکی سے بھی اشاروں میں ہی بات کرو انگریزی اسے بھی نہیں آتی!“ سردار اٹھ کر چلا گیا اور مائیکل کو ذہنی عذاب میں مبتلا چھوڑ گیا۔

وہ رات اس پر بڑی کٹھن گزری۔ نیند آنکھوں سے یوں غائب ہوگئی جیسے اس نے اس کی پلکوں کو کبھی چھو کر بھی نہ دیکھا ہو۔ شراب کا وہ رسیا تھا اور سگریٹ کا عادی اب تک تو فکر و تردد نے اسے ان دونوں کی یاد نہیں دلائی تھی لیکن رات جوں جوں طویل ہوتی جا رہی تھی۔ شراب اور سگریٹ کی طلب اسے بے کل بنائے دیئے جا رہی تھی۔ کوئی بے چینی سی تھی۔ ہر چند کہ اسے یقین تھا یہ دونوں چیزیں اس کے لئے خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں۔

صبح جب پو پھٹی اور وہ بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب جو اس نے دیکھا تو جھونپڑی میں ایک دروازہ بھی تھا جو پشت پر کھلتا تھا۔ اس نے سرکنڈوں اور کھجور کے پتوں کے اس دروازے کو کھولا اور باہر جھانکا تو بائیں رخ پر ایک گیند نما گول جھونپڑی نظر آئی جو چاروں طرف سے بند تھی اور یہی اس بستی کی آخری جھونپڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر کھجوروں کے جھنڈ تھے جن کے قدموں میں ایک چشمہ یا ننھی منی جھیل سی تھی۔ وہ اپنی جھونپڑی سے نکلا اور اس کے قدم خود بخود پانی کی سمت بڑھنے لگے۔

سورج کی کرنیں درختوں کی چوٹیوں پر سنہرا پانی پھیرتی جا رہی تھیں اور پرندوں کی مدھر آوازوں سے پتے جھوم رہے تھے۔ مہک آمیز ہوا کے جھونکے جھیل کے پانی کو ہلکورے دے رہے تھے۔

مائیکل ماحول سے سحر زدہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے جھیل کے کنارے بیٹھ کر دونوں پاؤں پانی میں ڈال دیئے اور منہ پر چھینٹے مارے تو اس پر سرور طاری ہونے لگا۔ بیساختہ اس کے ہونٹوں پر ایک گیت مچلنے لگا۔ یہ گیت اس نے برمنگھم کے ایک کیبرے میں نیگرو مغنیہ سے سنا تھا۔ اس میں حسن و شباب کی چیخ پکار نہیں تھی وطن سے دوری اپنوں سے بچھڑنے اور آسائشوں سے محرومی کا تاثر تھا۔ اس سے مائیکل کو اپنی آواز کسی پرندے کی پکار لگ رہی تھی۔ جس میں وہ ڈوب کر ابھرتا اور ابھر کر ڈوب رہا تھا۔ دفعتاً ایک چھوٹا سا پتھر پیچھے سے آیا اور جھیل کے پانی کے وجد کی کیفیت کو توڑ گیا۔ اس کا وجدان بھی بکھر گیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

ایک لڑکی درخت کے جھکے ہوئے تنے سے پشت ٹیکے کھڑی تھی۔ نہ جانے وہ وہاں کب سے کھڑی تھی۔ اس نے ستر پوشی کے لئے کیلے کے پتوں کی جھالر اور کھجور کے پتوں کی کترن سے مدد لی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور نقوش کچھ زیادہ تیکھے نہیں تھے۔ ناک ستواں تھی اور آنکھیں بڑی بڑی لیکن دہانہ چوڑا اور ماتھا چھوٹا تھا۔ البتہ جسم ضرور سڈول تھا۔ اس کے بال شانوں پر لہرا رہے تھے جن کا رنگ نہ جانے بھورا تھا یا براؤن، مائیکل یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے کیلے کے پتے کی چوڑی سی پٹی سر پر باندھ رکھی تھی۔

مائیکل اٹھا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو غیر ارادی طور پر مسکرا دیا۔ وہ بھی مسکرائی۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز نہیں بدلا اور مائیکل اس کی بے باکی پر کچھ حیران سا بھی ہوا۔ پھر اس کی حیرانی اس پر داز میں بدل گئی کہ وہ......

بہر حال دنیا کے کسی دور افتادہ گوشے میں تہذیب نا آشنا تھی اور...... شاید...... اس جیسے کسی مرد کی متلاشی

تھی۔ دونوں دیر تک کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے
رہے۔ پھر وہ اچانک سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ مڑی اور
چل دی۔ مائیکل اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ سر گھما کر اس
کی طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتی رہی۔ اس
کے قدم اس گول جھونپڑی کی سمت میں اٹھ رہے تھے
اور اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا تھا جھونپڑی کے
قریب پہنچ کر بھی اس نے مائیکل کی طرف دیکھا نہیں اور
اندر داخل ہو گئی۔

اب بند جھونپڑی مائیکل کا منہ چڑانے لگی۔ اور وہ
بے نیل و مرام اپنی جھونپڑی کی طرف بڑھا۔

جھونپڑی میں قدم رکھا تو اس کی نظر دو نیم برہنہ
عورتوں پر پڑی۔ دونوں ایک دوسرے سے جڑ کر ایک
کونے میں کھڑی تھیں۔ انہیں خوش شکل کہا جا سکتا تھا نہ
بدشکل سیاہ آبنوسی رنگت، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو نیم وا
ہونے کے باعث اور بھی چھوٹی لگتی تھیں۔ ناک سامنے
سے چپٹی، نچلے ہونٹ موٹے جن میں اوپر کے ہونٹ
چھپ گئے تھے۔ بال سیاہ چمکدار لمبے لمبے، البتہ جسم
بہت سڈول تھے اور ان میں اتنی کشش تھی جو مائیکل کو
یورپ اور ایشیا کی عورتوں میں خال خال نظر آئی تھی۔

اس کے جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی دونوں ایک
دوسرے سے قریب ہو کر کھڑی ہو گئیں اور اسے حیرت
آمیز تشویش کی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ مائیکل کی نظر
ان سے ہٹ کر زمین پر پڑی تو وہاں کیلے کے پتوں پر
اس کا ناشتہ رکھا تھا۔ وہی کیلے، ناریل، ٹماٹر کولے اور دو
گول گول ایسے پھل تھے جو اس نے پہلے نہیں دیکھے
تھے۔ وہ بلا تامل زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور ان
چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ کھاتے کھاتے وہ
نگاہیں اٹھا کر ان عورتوں کو دیکھتا اور مسکرا دیتا۔ وہ جواباً
مسکرانے کے بجائے سپاٹ چہرہ لئے ایک دوسرے
سے اور چپک جاتیں۔

چند منٹوں میں مائیکل نے سب کچھ ختم کر ڈالا اور
اطمینان سے بیٹھ گیا جیسے ان عورتوں سے کہہ رہا ہو کہ
اس کام سے تو میں نمٹ گیا۔ اب بتاؤ کیا کروں؟ اس
کی نظریں یہ سوال کرتے ہوئے ان کے جسموں کے
کھلے حصوں پر دوڑنے لگیں جنہیں ناریل کے ریشوں
اور کیلے کی چھال کا لباس چھپا نہ سکا تھا۔ اس کی ایک
بھوک ختم ہو گئی تھی اور دوسری بھوک بیدار ہو کر
انگڑائیاں لے رہی تھی۔ عورتیں اس کی نظروں کے
پیغام سے لاتعلق جھکیں، خالی پتے اٹھائے اور ایک
دوسرے سے لگی لگی باہر نکل گئیں۔

ان کے جانے کے بعد مائیکل اکتایا اکتایا سا اٹھا
اور گول جھونپڑی کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھنے
لگا۔ اسے وہاں کھڑے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ پیچھے
سے آہٹ ہوئی اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو سردار اپنے
ایک موٹے مشیر کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے
"گڈ مارننگ" پھسلتے پھسلتے رہ گیا۔

بروقت یاد آیا کہ سردار نے اسے مخاطب کرنے
سے منع کیا تھا...... سردار اور مشیر اپنی بولی میں آہستہ
آہستہ باتیں کرنے لگے۔ اگر وہ بلند آواز سے بولتے
تب بھی مائیکل کے پلے کچھ نہ پڑتا۔ پھر سردار نے مشیر
سے کچھ کہا۔ اور وہ مائیکل کے قریب آیا۔ اس کے جسم پر
شرٹ اور پتلون اب تک موجود تھی۔

سردار کے مشیر نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور
ایک ہی جھٹکے سے بشرٹ کو تار تار کر ڈالا۔ پھر گوشت
سے بھرے بھرے سفید سینے اور پیٹ پر بھرپور نظر ڈال کر
اسے گھمایا اور پشت کو دیکھنے لگا جیسے اس کا ڈاکٹری
معائنہ کر رہا ہو۔ اس نے مائیکل کے جسم کو چھوا نہیں اور
فاصلے سے اسے دیکھتا رہا۔ اس معائنے سے فارغ ہو کر
وہ سردار کے پاس گیا اور دونوں باتیں کرنے لگے۔
مائیکل بھی گھوم کر ان کے روبرو ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا
جیسے وہ دونوں ماہرین جسم کسی بات پر بحث کر رہے
تھے۔ پھر اسے مشیر کا پلہ بھاری اور حکمران کا ہلکا محسوس
ہوا کیونکہ موٹے نے آگے بڑھ کر اس کی پتلون کی پیٹی
پر ہاتھ رکھا اور اسے پھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

مائیکل اس کا عندیہ سمجھ گیا کہ وہ اسے پتلون سے
بھی محروم کرنا چاہتا ہے۔ اس نے گھبرا کر سردار کے

چہرے پر نظر ڈالی تو سردار نے اسے آنکھ ماری۔ مجبوراً اس نے پتلون کی پیٹی اور زپ خود ہی کھول دی اور وہ اس کے پیروں پر ڈھیر ہوگئی۔ پھر اس نے دونوں پاؤں جھٹک کر خود کو پتلون سے آزاد کرلیا۔ اب وہ ان دونوں کے سامنے مادر زاد برہنہ کھڑا تھا۔ منیر نے آگے بڑھ کر پتلون دو انگلیوں سے اٹھائی جیسے کسی نجس چیز کو اٹھا رہا ہو اور اس کے بعد دونوں جھونپڑی سے نکل گئے۔ مائیکل منہ ہی منہ میں انہیں گالیاں دیتا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد ایک آدمی آیا۔ وہ مائیکل کے لئے لباس فاخرہ لایا تھا جیسے شاہی دربار سے خلعت عطا کی گئی ہو۔ ان لباس نما چیتھڑوں سے ستر پوشی کرکے مائیکل کو اپنے میں اور اس آدمی میں سوائے رنگ اور روپ کے اور کوئی فرق دکھائی نہ دیا۔ وہ بے ساختہ ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے دہرا ہوگیا مگر کیا مجال کہ دوسرے آدمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نام کی کوئی چیز آئی بھی ہو۔ مائیکل نے اس سے بے تکلف ہونے کے لئے اس کے سینے پر ہلکا سا دھپ لگایا تو وہ مٹی کا بت چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہونٹ کھلے نہ آنکھوں سے کوئی ردعمل ظاہر ہوا۔ مائیکل اس کی بے حسی پر جھنجلا گیا اور اسے دو چار دلپذیر گالیاں دے ڈالیں جنہیں سن کر جیسے اپنی خدمت کا انعام لے کر وہ خاموشی سے چلا گیا۔

مائیکل پچھلے دروازے سے نکل کر گردوپیش پر نظریں دوڑانے لگا۔ اس کی نظریں گول جھونپڑی والی لڑکی کو تلاش کررہی تھیں۔ وہ کون تھی؟ اس نے اسے اپنی طرف متوجہ کیوں کیا تھا؟ دوسری عورتوں سے قدرے مختلف کیوں تھی؟ یہ سوال اس کے ذہن میں رینگ رہے تھے اور اس کے تجسس میں اضافہ کررہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گول جھونپڑی کے قریب پہنچا اور اس سے کان لگا دیئے۔ اندر سے کسی قسم کی آواز نہیں آرہی تھی۔ چلنے پھرنے کی نہ بولنے چالنے کی۔ اس کی مایوسی بڑھنے لگی اور قدم جھیل کی طرف اٹھنے لگے۔ دور دور تک کسی انسان کا وجود نظر نہ آتا تھا جیسے اس کی قطعی نگرانی نہیں کی جارہی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی تھی اور وہ شاید اس لئے کہ اس کے فرار ہونے کا کسی کو کوئی خدشہ نہ تھا۔ لیکن اس کے لئے فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ البتہ سردار کی مہیب پیش کش نے یہ راہ فراہم بھی کردی تھی اور اس کے رضامند نہ ہونے کی راہ مسدود کردی تھی۔

اس کی چھٹی حس دورہ کرا کے یقین دلانے کی کوشش کررہی تھی کہ ہونہ ہو سردار اسی گول جھونپڑی والی لڑکی کو اس کے ہاتھوں قتل کرانا چاہتا ہے۔ اس احساس کی وجہ شاید یہ بھی کہ اس لڑکی میں اسے ایک انفرادیت نظر آئی تھی۔ لیکن یہ انفرادیت کس بنا پر تھی۔ اور سردار اسے کیوں قتل کرانا چاہتا تھا؟ یہ باتیں اس کی پریشانی کا باعث بن رہی تھیں۔ ہر چند کہ جہاں تک اس کی ذات کا معاملہ تھا، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نظر نہ آتی تھی۔ اسے اس لڑکی سے کوئی واسطہ نہ تھا اور اس کی ہلاکت میں ہی نجات تھی لہٰذا اسے سردار کی بات ماننا ہی تھی۔

وہ اس لڑکی یا کسی بھی لڑکی کا گلا گھونٹ کررہے گا اور اس کام میں ذرا بھی دیر نہیں کرے گا کیونکہ اس جگہ ایک ایک لمحہ اس کے لئے عذاب ناک تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو آج ہی چند سیکنڈ میں وہ اس فرض سے سبکدوش ہوجاتا تاکہ آزادی کے لمحات بلاتاخیر اسے گلے لگالیں۔ اسی ادھیڑبن میں وہ جا کر جھیل کے کنارے بیٹھ گیا اور بار بار سر گھما کر دیکھنے لگا کہ شاید وہ لڑکی ادھر آنکلے۔ لیکن اس کی نظریں خالی زمین اور گول جھونپڑی سے ٹکرا کر مایوس لوٹ آتیں۔ پھر اسے گانے کا خیال آیا کہ مبادا اس کی آواز لڑکی کو کھینچ لائے۔ اس نے وہی افسردہ اور محرومی کا احساس دلاتا ہوا گیت شروع کیا اور اس بار وہ بلند آواز سے گیت ختم ہوگیا اور کوئی نہ آیا۔

وہ جھنجلا کر اٹھا اور ہمت کرکے دوسری جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ کوئی ڈیڑھ سو جھونپڑیاں ہوں گی۔ گویا ایک بھرپور آبادی تھی لیکن حیرت کی بات تھی کہ اس وقت کوئی مرد نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف جھونپڑیوں کے اندر اور باہر عورتیں تھیں یا ننگ دھڑنگ، کالے بھجنگ، ہر عمر اور ہر سائز کے بچے تھے جو گردیوں

میں بچے مختلف کھیل کھیل رہے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ان چیخوں میں ڈر بھی تھا اور حیرت بھی تھی۔ وہ سب کے سب کھیل چھوڑ چھاڑ کر ایک گروہ کی شکل میں اسے دیکھنے لگے۔ عورتوں نے بھی کام چھوڑ دیا اور جھونپڑیوں سے باہر نکل آئیں۔ وہ بھی نگاہوں میں ہی اسے اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی نیا جانور بستی میں نکل آیا ہو۔ جو بے ضرر تو ہو لیکن انوکھا بھی ہو۔

مائیکل ان کے حیرت زدہ چہرے دیکھ کر سوچنے لگا کہ انہوں نے کبھی کوئی سفید فام باشندہ نہیں دیکھا ہوگا۔ سائنس کی ترقی اور خلا کی تسخیر کے اس دور میں وہ کس مقام پر نکل آیا تھا جہاں انسان اپنے ایک ہم جنس کو یوں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے جیسے اس کے بارے میں کبھی سنا ہو اور نہ اسے دیکھا ہو۔ یہ کون سا جزیرہ تھا جہاں اب تک کسی مہذب انسان کے قدم نہیں آئے تھے؟ یہ کیسی دنیا تھی جو تمدن کی دنیا سے یوں کٹی ہوئی تھی؟

بچوں کا خوف اور عورتوں کی حیرت اس کے لئے بھی حیران کن تھی۔ بچوں کا خوف دور کرنے کے لئے وہ مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا تو ان میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ چیختے چلاتے ہوئے جھونپڑیوں کی طرف بھاگے یا اپنی ماؤں سے لپٹ گئے۔ مائیکل کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور اس نے ایک پر امید مسکراہٹ عورتوں کی طرف اچھالی لیکن ان کے چہروں کے تاثرات بھی نہ بدلے تاہم کسی نے اپنی جگہ سے کوئی جنبش نہیں کی۔ اس سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ انہیں اس سے بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہورہا تھا۔ البتہ مائیکل کو یہ خدشہ ضرور تھا کہ اگر اس نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس کی خیر نہیں۔

ان عورتوں کی شکل بدصورت حلیہ اور وضع قطع میں غضب کی مماثلت تھی جیسے سب ایک ہی سانچے سے مختلف سائز میں ڈھل کر نکلی ہوں۔ ایک ہی خاندان کے فرد ہوں، جسمانی کشش بیشتر عورتوں میں قدرے مشترک تھی اور مائیکل دل ہی دل میں ان کے مردوں پر رشک کررہا تھا۔ ان کے سامنے اسے یورپ کی گوری چٹی خوبرو عورتیں ہیچ نظر آرہی تھیں۔ تسکین اور آسودگی کے تصور سے وہ کاغذ کے پھولوں اور شاخوں پر لہلہاتے ہوئے تروتازہ پھولوں میں خود کو محسوس کررہا تھا۔ لیکن یہ پھول اس کی دسترس سے باہر تھے۔ چنانچہ وہ مڑا اور اپنی جھونپڑی کی طرف بوجھل قدموں سے چل پڑا۔

دھوپ میں تمازت تھی اور اسے جسم میں جابجا سوئیاں سی چبھتی لگ رہی تھیں۔ اس کا علاج اسے جھیل میں اترنے میں نظر آیا۔ سو وہ جاکر ٹھنڈے پانی میں بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔ اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں جیسے کوئی گیانی تپسیا کررہا ہو۔

کچھ دیر بعد اسے چڑیوں کی چہچہاہٹ اور طوطوں کی ٹائیں ٹائیں سنائی دیں تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ جھیل کے کنارے بہت سارے بچے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے اور آپس میں باتیں کرتے جارہے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا کہ کہیں وہ بھاگ نہ کھڑے ہوں۔ پھر اسے دیکھ کر کہ بچوں کا خوف کچھ دور ہوگیا ہے وہ آہستہ آہستہ سے اٹھا اور کنارے کی طرف بڑھا۔ اسے آتا دیکھ کر بچے بھاگے نہیں البتہ پیچھے ہٹ کر کھڑے ہونے لگے۔ وہ جھیل سے نکل کر مسکراتا ہوا ان کی طرف دیکھنے لگا۔

بے ساختہ کئی بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس سے اس کی ہمت بڑھی اور اس نے آگے بڑھ کر قریب ترین بچے کے گالوں کو تھپتھپایا۔ وہ بچہ ٹس سے مس نہ ہوا تو اس نے دوسرے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اس پر بھی بچوں کا کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ بچے نے ایک فلک شگاف چیخ ماری اور اس کے ہاتھوں میں تھرتھر کانپنے لگا۔

اچانک دیکھتے ہی دیکھتے بہت سی عورتیں جیسے درختوں کے جھنڈوں میں ابل پڑیں۔ وہ بھاگتی آرہی تھیں۔ مائیکل گھبرا گیا لیکن وہ حاضر دماغی سے کام لے کر بچے کو چمکارنے لگا۔ بچہ گلا پھاڑ پھاڑ کر روئے جارہا تھا۔ اتنے میں ایک عورت آگے بڑھی تو مائیکل نے کراہیت محسوس کرنے کے باوجود بچے کے گندے گالوں کے چٹ

جست بوسے لے ڈالے اور سے عورت کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔ پھر اس نے ایک اور بچے کو اٹھا لیا اور اسے جھلانے لگا۔ وہ بچہ رویا پیٹا نہیں اور جھولنے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ مائیکل نے اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور عورتوں پر گہری نظر ڈالتا ہوا اپنی جھونپڑی کی سمت چل پڑا۔ بچوں کا ہجوم اس کے پیچھے ہولیا۔

مائیکل پلٹ پلٹ کر فتح مندی سے عورتوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے میدان مار لیا تھا۔ ان کے بچوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اب اس کی بوریت ختم ہونے کے واضح امکان تھا وہ ان جنگلیوں میں اپنے لئے اپنائیت کا احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہو چلا تھا۔

جب وہ اپنی جھونپڑی میں داخل ہو رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ ان عورتوں میں وہ لڑکی کیوں نہیں تھی۔ وہ ساری بستی میں نظر کیوں نہیں آئی تھی؟ ''وہ کون ہے؟ اس میں کیا خصوصیت ہے؟ کیا اس میں اب کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ سردار اس کی زندگی کو ختم کرانا چاہتا ہے؟''

سردار نے کہا تھا کہ وہ اسے ہلاک کی جانے والی لڑکی سے گھلنے ملنے کا موقع دے گا اور جب وہ اپنی بات پر عمل کرے گا تو یہ غیر یقینی کیفیت ختم ہو جائے گی۔ معلوم ہو جائے گا کہ جس لڑکی کو ختم کرنا ہے وہ یہی گول جھونپڑی والی ہے یا کوئی اور جھونپڑی میں کھانا اس کا منتظر تھا۔ اس بار کھانے میں تبدیلی تھی، پتوں پر چھوٹے چھوٹے بھنے ہوئے پرندے تھے۔ اور پھلوں میں صرف کیلے تھے۔ جھونپڑی میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس نے ڈٹ کر کھایا اور لیٹ گیا۔ اس کی آنکھ لگ گئی اور پھر اچانک کھل گئی۔ سردار نہ جانے کب سے کھڑا تھا۔ مائیکل اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

''تم یہاں بوریت محسوس کر رہے ہو گے؟'' سردار نے اس کے پاس بیٹھ کر بہت آہستہ سے کہا۔

''اس میں کیا شک ہے؟'' مائیکل نے جھنجھلا کر اسی آہستگی سے جواب دیا۔

''عورت کے بارے میں تمہارا کیا تجربہ ہے؟'' سردار نے خفگی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا!'' مائیکل نے حیرانی سے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے تم عیش و عشرت کرتے رہے ہو یا دکھی پھیکی زندگی گزار رہے ہو؟''

''میں ابھی جوان ہوں اور جوانوں کے سے جذبات رکھتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے تمہارے جذبات کی تسکین کا سامان ہو جائے گا، لیکن اپنا وعدہ یاد رکھنا کہ میں نے جس لڑکی کے بارے میں کہا ہے اس کی طرف کھلی آنکھوں سے نہ دیکھنا۔''

''مجھے کیا غرض پڑی ہے! اور تم بھی اپنا وعدہ نہ بھولنا کہ میرے بھاگنے کا پہلے سے سارا انتظام کر رکھو گے؟''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ تمہیں فرار کر دینے میں میرا اپنا مفاد ہے۔ تو آج رات تمہیں تفریح کا سامان مل جائے گا!'' سردار اٹھ کر جانے لگا تو مائیکل نے کہا۔ ''مجھے اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے کتنا انتظار کرنا ہوگا؟''

''زیادہ دنوں تک نہیں!'' سردار نے رک کر کہا۔ ''تمہیں اس لڑکی سے خود متعارف ہونا پڑے گا اور اس کے بعد تم اس کام میں جتنی جلدی کرو گے اتنا ہی تمہارا فائدہ ہے۔ وہ لڑکی تمہاری پیچھے والی جھونپڑی میں رہتی ہے!''

''گول جھونپڑی میں!'' مائیکل نے بے ساختہ کہا اور سردار اس کے شبے کی تصدیق کر کے چلا گیا۔

''مجھے اس سے خود ہی متعارف ہونا پڑے گا۔'' مائیکل نے اپنے آپ سے کہا۔ ''وہ تو میں ہو چکا ہوں۔ لیکن اس سے مراسم کیسے بڑھائے جائیں کیا میں جا کر اس کی جھونپڑی پر دستک دوں؟ اس سے کیا کہوں گا کہ اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ کہوں گا کیسے؟ کس زبان میں؟ میں آنکھوں اور قدموں کے ذریعے تو اس تک پہنچنے کی پہلے ہی کوشش کر چکا ہوں اور اس میں اس نے میری حوصلہ افزائی نہیں کی؟ کیا اسے سردار کے ارادوں کا علم ہے یا وہ دوسری عورتوں کی طرح مجھ سے خائف ہے؟''

سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے اس کے ذہن نے اپنے دروازے بند کر لئے اور وہ دوبارہ سو گیا۔

وہ سو کر اٹھا تو جھٹپٹے کا وقت تھا۔ جھونپڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور گول جھونپڑی کی ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا کہ "وہ لڑکی..... اس کے ہاتھوں زندگی کی دولت سے محروم ہو کر سمندر کی مچھلیوں کا کھانا بن جانے والی لڑکی اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ وہ اپنی کن عزیزوں سے بچھڑ جائے گی؟ اور کون اس کے غم میں روئے گا؟ کوئی روئے گا بھی یا نہیں؟ اس کا کوئی ہے بھی یا وہ دنیا میں تنہا ہے؟" وہ سوچتا رہا اور گول جھونپڑی دم بہ دم دھندلاتے ہوئے اندھیرے کے لبادے میں لپٹتی گئی۔

پرندے اپنی اپنی بولیوں سمیت آشیانوں میں جا چھپے تھے اور سوائے کسی جھینگر یا جھیل سے اٹھنے والی مینڈک کی آواز کے..... ہولناک سناٹا چھاتا جا رہا تھا۔ وہ جھونپڑی میں آ کر سامنے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا تو وہاں بھی منظر کچھ مختلف نہیں تھا۔ دور سے جھونپڑیاں بڑے بڑے دھبے سی نظر آ رہی تھیں۔ کسی بچے کے رونے کی ایک آدھ آواز ابھرتی اور رات کی پہنائیوں میں ڈوب جاتی۔ وہ دیر تک دروازے پر کھڑا آسمان پر تاروں کو ایک ایک کر کے بزم سجاتا دیکھتا رہا اور درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ کو سنتا رہا۔ اس کا بڑی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت جا کر گول جھونپڑی والی کا گلا گھونٹ دے اور پھر صبح کا طلوع ہوتا ہوا سورج اس کی کشتی کو سمندر کے سینے پر ہمکتا دیکھتا۔ کچھ بڑی بے دلی سے وہ دروازے پر سے لوٹا اور بڑی بے کلی سے چٹائی پر ڈھیر ہو گیا۔ اگر اسے رونے کا تجربہ ہوتا تو بے اختیار رو دیتا۔

ابھی چند لمحے نہ گزرے تھے کہ دروازہ آہستہ سے کھلا اور اس نے کسی کو اندر آتے دیکھا۔ کچھ زیادہ اندھیرا ابھی نہیں تھا۔ لیکن عورتوں اور مردوں کے ملتے جلتے حلیے کے باعث وہ پہلی نظر میں پہچان نہ سکا کہ آنے والا مرد تھا یا عورت تھی لیکن دوسرے ہی لمحے ایک عورت اس کے قریب کھڑی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور دوسرا تھا کر نگاہوں سے اس نے جسم کی پیمائش کرنے لگا۔ اسے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ سردار نے حسب وعدہ اس کی دلچسپی کا سامان فراہم کر رہا تھا۔ یہاں اس کی زندگی اتنی اذیت رساں اور تنہائی اتنی تلخ نہ ہوتی تو وہ بھوکے کتے کی طرح اس پر نہ جھپٹتا۔

عورت جس کی شکل اس نے دیکھی نہیں تھی اپنے پرکشش جسم کو لئے خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے چلی گئی۔ اور وہ طمانیت سے پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ آسودگی اس کے پپوٹوں کو تھپکنے لگی اور وہ جاگنے اور سونے کے درمیانی وقفے میں تھا کہ پچھلا دروازہ کھلنے کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اس نے گردن کو گھما کر دیکھا تو کوئی آہستہ سے جھونپڑی میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ تاہم وہ پوری طرح تیار تھا کہ اگر اس پر حملہ کیا گیا تو وہ پھرتی سے خود کو بچا لے گا۔ آنے والا اس کے سرہانے آ کر رکا تو پھولوں کی ہلکی مہک اس کے نتھنوں میں سما گئی۔ یہ جانتے ہی کہ اس تنہائی میں دوسرا وجود کس کا ہے، وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور اس کی دونوں پنڈلیاں پکڑ لیں۔

گول جھونپڑی والی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اس پر آ رہی۔ دونوں اوپر تلے چٹائی پر گر گئے۔ لڑکی کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور مائیکل کے دل کی دھڑکن تیز تر ہو رہی تھی۔ لڑکی نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور مائیکل نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ مضبوط کیا ہی تھا کہ اس کی بائیں پسلی کے نیچے کوئی نوک دار چیز چبھی اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

لڑکی اس کے بازوؤں کے حصار سے نکل کر پرے ہٹ بیٹھی۔ مائیکل نے آنکھوں کا پورا زور لگا کر دیکھا تو اس لڑکی کے ہاتھ میں خنجر نظر آیا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ایک خیال بجلی کی چمک کی طرح اس کے ذہن میں کوندا گیا کہ وہ خنجر اس کے ہاتھ سے جھپٹ لے اور اسے قابو کر کے اس کا گلا گھونٹ دے۔

پھر ایک دوسرا خیال بم کی طرح اس کے ذہن میں دھماکا کر گیا کہ اگر اندھیرے کے باعث وہ لڑکی کے ہاتھ سے خنجر نہ چھین سکا اور دھینگا مشتی میں لڑکی چیخ پڑی تو اس کا سر تن سے جدا کرنے والا پہلا شخص وہ سردار ہوگا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کرے؟ لڑکی اس کے

پاس رات کی تنہائی میں کیوں آئی تھی اور خنجر لے کر کیوں آئی تھی؟ ظاہر تھا وہ اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی اور یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتی تھی۔

اب وہ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لئے کیا کرسکتا تھا؟ دن کا وقت ہوتا تو اشاروں میں اپنے دل کی بات کہہ بھی سکتا تھا لیکن اب اندھیرے میں کیا کرے؟ وہ اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ اسے اپنے ہاتھ پر لڑکی کا گداز اور گرم ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے اس ہاتھ کو جلدی سے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے سہلانے اور ہولے ہولے دبانے لگا۔ اسی طرح وہ اپنے جذبات کا اظہار کرسکتا تھا اور اس میں اس کی کامیابی کا ثبوت یہ تھا کہ لڑکی اس کے قریب کھسک آئی اس کے جسم سے اس عورت کی طرح بو نہیں اٹھ رہی تھی جو مائیکل کے پاس آکر گئی تھی...... اس کے برعکس اس لڑکی کے جسم سے ایک انجانی سی مہک اٹھ رہی تھی جیسے مختلف پھولوں کی ملی جلی خوشبو ہو۔

پھر لڑکی نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کردیئے۔

مائیکل کا دل بے اختیار اس کا بوسہ لینے کو چاہا لیکن لڑکی نے اپنا سر اس انداز سے جھکا رکھا تھا کہ مائیکل کے ہونٹ صرف اس کے سر کو چھو سکتے تھے۔ وہ چاہتا تو اپنے آزاد ہاتھوں سے اس کا چہرہ اوپر اٹھا سکتا تھا لیکن خنجر کی نوک اس کی گردن کو چھو رہی تھی اور اسے خبردار کررہی تھی کہ وہ لڑکی کے خلاف مرضی کوئی حرکت نہ کرے۔

دونوں دیر تک اسی حالت میں بیٹھے رہے اور مائیکل اپنی گردن پر اس کی گداز بانہوں کا لمس محسوس کرتا ہوا اپنے دل کی ہلچل کو دبا رہا تھا۔

اچانک لڑکی نے اپنے بازو اس کی گردن سے ہٹالئے اور اس کے ذہن کو ماؤف چھوڑ کر جھونپڑی سے چلی گئی۔ اس نے جاتے ہوئے مائیکل کے گال کا چٹ سے بوسہ لیا تھا۔

وہ ساری رات مائیکل نے کروٹیں بدلتے گزاری اور صبح کی سنہری کرنوں نے اسے سوتے پایا۔ کوئی اسے جگانے بھی نہ آیا۔ وہ اٹھا تو اس کا ناشتہ رکھا تھا لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر پچھلے دروازے سے نکل گیا اور گول جھونپڑی کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس نے ایک سمت سے اسے تھپتھپایا۔ پھر زور زور سے ہاتھ مارے لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا اور وہ مایوس ہوکر جھیل پر چلا گیا۔ دیر تک نہاتا اور رات کے واقعے کو ذہن میں تازہ کرتا رہا اور جب سوچ کا دھارا کسی جگہ ختم ہوتا نظر نہ آیا تو جھیل سے نکل کر بھیگے ہوئے جسم سے جھونپڑی میں آیا جہاں سردار اس کا منتظر تھا۔

"رات وہ تمہارے پاس آئی تھی؟" سردار نے چھوٹتے ہی بولا...... یہ سن کر مائیکل چکرا سا گیا۔

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تم دونوں کیا کرتے رہے؟" سردار کے لہجے میں حکم تھا۔

"کچھ نہیں!" مائیکل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ اس کے سوا اور چارہ نہ تھا۔ "میں اس سے کس زبان میں بات کرتا۔ وہ میرے پاس خاموش بیٹھی رہی اور اندھیرے میں اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے پاس خنجر بھی تھا۔"

سردار ہنس دیا۔ پھر یکایک سنجیدہ ہوگیا۔

مائیکل اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ "وہ اپنی حفاظت کرنا جانتی ہے۔" سردار نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ "لیکن اس کے پاس...... خنجر کہاں سے آیا؟"

یقیناً اس نے میرا خنجر چرایا ہے۔ ہاں ضرور چرایا ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جلدی سے بولا۔ "کیا تم کسی طرح اس سے خنجر نہیں لے سکتے۔"

مائیکل نے نفی میں سر ہلایا اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ بے حوصلہ اور کمزور دل لڑکیوں سے مختلف ہے۔ رات کی تاریکی میں کسی نوجوان کے پاس تنہائی میں جانا اور پھر اپنے تحفظ کا مکمل انتظام بھی رکھنا کسی معمولی لڑکی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ غیر معمولی لڑکی نظر آتی ہے یا پھر...... کیا یہاں کی ساری لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ ایسا ہی کرتی ہیں؟"

اب سردار کے نفی میں سر ہلانے کی باری تھی۔ ''تم رات کے وقت اس کی جھونپڑی میں جا کر سوتے میں اس کا گلا گھونٹ دو!'' سردار اچانک بولا تو مائیکل اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ''مجھے خدشہ ہے کہ تم اس سے متاثر نہ ہو جاؤ۔'' سردار کہہ رہا تھا۔ ''اور نتیجہ یہ نکلے کہ وہ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دے!''

مائیکل پوچھنا چاہتا تھا کہ سردار اپنی رعایا میں سے ایک لڑکی سے اتنا خائف کیوں ہے؟ کیا اس لڑکی کو جزیرے کے بااثر لوگوں کی پشت پناہی حاصل ہے؟ یہ خیال آتے ہی اس کی نظروں کے سامنے سردار کے مشیروں کے ہیبت زدہ کرنے والے خونخوار چہرے گھوم گئے اور اسے اپنے خیال میں وزن نظر آیا۔

''بہتر ہے!'' اس نے کہا۔ ''میں یہی کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر اس نے چیخ و پکار کی تو میری حفاظت کا کیا انتظام ہے؟''

''تم اسے چیخنے کا موقع ہی کیوں دو!'' سردار نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ اسے خبر ہو اس کا گلا گھونٹ دو!''

''اگر وہ جاگ رہی ہو یا جاگ جائے تب......!''

''اس سے چکنی چپڑی باتیں کرو اور موقع پا کر......''

''گلا دبا دوں!'' مائیکل نے بات پوری کی۔ ''اور تمہیں اسی وقت اطلاع دے دوں؟''

''یہ ممکن نہیں ہے!'' سردار نے کہا۔ ''تم مجھ تک آسانی سے پہنچ نہیں سکو گے!''

''اور میرے فرار ہونے کا بندوبست؟ کیا میں ان پتوں میں لپٹا ہوا جاؤں گا؟ دور سے ہی پہچان لیا جاؤں گا یا کوئی جہاز یا کشتی والا مجھے دیکھتے ہی گولی مار دے گا!''

''تمہیں کپڑے مل جائیں گے مطمئن رہو۔'' سردار نے مسکرا کر کہا۔ ''اور جب یہاں سے جاؤ گے تو مالا مال بھی ہو گے۔ ایک طویل عرصے تک مزے کرو گے بشرطیکہ عیاشی میں خود نہ لٹا دو۔ دوپہر کو میں تمہیں بلوا بھیجوں گا اور تمہیں کام کی چند چیزیں دکھاؤں گا۔''

سردار کے جاتے ہی ایک نوجوان عورت اس کا ناشتہ لے آئی۔ یہ کوئی نئی عورت تھی۔ اس نے پتے زمین پر رکھے تھے کہ مائیکل نے بلا جھجک اس کی کلائی پکڑ لی۔ عورت نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نہ حیرت تھی اور نہ خوف تھا۔ ایک سمجھنے والی بات کی جھلک تھی جو خود سپردگی کی علامت تھی۔

ناشتہ کر کے وہ فارغ ہوا ہی تھا کہ اسے جھونپڑی کے دروازے پر بہت سے چھوٹے چہرے نظر آئے۔ وہ ہنستا ہوا اٹھا اور باہر نکلا تو بچوں کی فوج اسے گارڈ آف آنر پیش کرنے کی منتظر تھی۔ وہ ان سب کو لے کر جنگل کی طرف نکل گیا اور گھاس، پتوں کی گیند سی بنا کر بچوں کو کھلانے لگا۔ بچے بڑے جوش و خروش سے کھیل میں حصہ لے رہے تھے اور خوب شور مچا رہے تھے۔ ان کا شور و غل سن کر عورتیں بھی آ گئیں اور ہنس ہنس کر بچوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگیں۔ مائیکل کی کم از کم جزیرے کی عورتوں اور بچوں سے دوستی ہو ہی گئی تھی۔ البتہ کوئی مرد دوست بن کر اس کے قریب تک نہ بھٹکا تھا بلکہ اس نے اب تک گنے چنے مردوں کے سوا کسی کو دیکھا تک نہ تھا۔ اور سوچتا تھا کہ سارے مرد ہر وقت کہاں غائب رہتے ہیں خاص کر دن کے وقت تو ایک بھی دکھائی نہیں دیتا۔

عورتوں کو یوں خوش اور بے تکلف ہوتے دیکھ کر اس کے دل میں گدگدی ہونے لگی اور وہ گیند ان کی طرف بھی اچھالنے لگا اور پھر گیند اٹھانے کے بہانے ان سے لپٹ لپٹ جاتا رہا۔ وہ گیند پھینکتا تو کئی نوجوان عورتیں اور لڑکیاں اس کی طرف لپکتیں اور مائیکل جا کر ان سے لپٹ جاتا۔ وہ ہر طرح کی دست درازی کر رہا تھا لیکن کوئی بھی عورت اس کی حرکتوں کا برا مان نہیں رہی تھی۔ شاید وہ اس کی بدنیتی سے آگاہ نہیں تھیں یا پھر لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ پھر ایک سمت سے دو آدمی نمودار ہوئے اور انہیں دیکھتے ہی عورتیں بھاگ کھڑی ہوئیں۔ البتہ بچے وہیں کھڑے رہے۔

دونوں میں سے ایک نے مائیکل کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور وہ چل پڑا۔

سردار کے انگریزی بولنے سے اسے شک تھا کہ دوسرے لوگ بھی انگریزی بولتے یا سمجھتے ہوں گے۔

چنانچہ اس نے ایک آدمی سے پوچھا کہ کیا اسے سردار نے بلایا ہے؟ وہ شخص منہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مائیکل نے دوسرے سے بھی یہی سوال کیا اور وہ بھی خاموش رہا۔ مائیکل نے انہیں آزمانے کے لئے موٹی سی گالی دی اور ان کے چہروں کے تاثرات معلوم کرنا چاہے تو وہ بالکل سپاٹ تھے۔ گالی کا ان پر کوئی ردعمل نہ ہوا تھا۔

دونوں آدمی اسے سردار کی جھونپڑی کے باہر چھوڑ گئے۔ وہ اندر گیا تو سردار اکیلا تھا۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں سرکنڈوں کا چھوٹا سا دروازہ تھا جس پر مائیکل کی نظر سردار سے گزشتہ ملاقات کے دوران نہیں پڑی تھی۔ سردار نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور وہ دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

مائیکل دروازے میں داخل ہوا تو وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں تھا۔ اس بڑی جھونپڑی کی پارٹیشن کے ذریعے دو جھونپڑیاں بنائی گئی تھیں۔ اس میں ایک طرف بڑا سا لکڑی کا صندوق رکھا تھا۔ سردار نے زور لگا کر اسے سرکایا تو ایک گڑھا نظر آیا جس پر صندوق کے پیندے کے سائز کی دبیز چٹائی بچھی ہوئی تھی۔

سردار نے چٹائی اٹھائی تو نیچے پتھر کی ایک سل تھی۔ اس نے اسے بھی اٹھا کر ایک طرف رکھا اور گڑھے میں ہاتھ ڈال کر ایک پوٹلی نکالی۔ اسے کھولا تو اس میں کپڑوں کا ایک جوڑا اور ایک چمڑے کی جیکٹ تھی۔ سردار نے یہ چیزیں مائیکل کو دکھائیں اور پوٹلی باندھ دی۔ پھر اس نے گڑھے میں ہاتھ ڈال کر ایک دوربین نکالی اور مائیکل کو دکھا کر وہیں رکھ دی۔ اس کے بعد ایک ریوالور نکال کر دکھایا اور آخر میں فولاد کی ایک صندوقچی نکالی اور اسے کھولا تو اس میں سونے کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے اور چھوٹے بڑے ہیرے تھے۔ ان کی چمک مائیکل کی آنکھوں کو خیرہ کر گئی۔ سردار نے جلدی سے صندوقچی بند کر کے گڑھے میں رکھی اور بڑی پھرتی سے اس پر پتھر کی سل اور چٹائی رکھ کر لکڑی کا صندوق اس پر اس طرح جما دیا کہ چٹائی نظر نہ آتی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے مائیکل کے کان میں کہا۔ ”یہ سب تمہارے لئے ہیں!“

مائیکل نے صرف اس کے چہرے کو دیکھنے پر اکتفا کیا جس پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی لیکن یہ مسکراہٹ خوش دلی کی نہیں بلکہ مکاری کی تھی اور مائیکل اسے دل سے قبول نہ کر سکا۔ دونوں بیرونی جھونپڑیوں میں آ گئے اور سردار نے اسے ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ راستے میں پھر وہی بچوں کا شور مچاتا ہوا ہجوم تھا اور ہنستی ہوئی دوسری طرف سے جاتی ہوئی عورتیں تھیں جو شاید گیند کا کھیل پھر کھیلنے کی چاہت کر رہی تھیں۔

وہ اپنی جھونپڑی میں جا کر دیر تک سردار کی پراسرار شخصیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ سردار نے ان چیزوں کو اپنے لوگوں سے چھپا کر گڑھے میں چھپا رکھا ہے لیکن اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی بالکل اسی طرح جیسے لڑکی کو ہلاک کرنے کی وجہ مائیکل کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

بہرحال سردار نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ وہ اسے فرار کرا دے گا اور مال بھی اتنا دے گا جس سے اس کی زندگی بڑے ٹھاٹھ سے گزرے گی۔ یہی خوش کن تصور لئے وہ شام تک سوتا رہا کہ رات کو جستی سے اپنا کام کر سکے۔

وہ سو کر اٹھا تو اس کا کھانا رکھا تھا۔ لیکن اس کا کھانے کو دل نہ چاہا۔ پھر شام ڈھلی، مغرب کا وقفہ ختم ہوا اور رات آ گئی۔ تارے جھونپڑی کی چھت کے سوراخوں سے جھانکنے لگے۔ اور وہ رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر جب رات گہری ہو گئی تو وہ اٹھ کر پچھلے دروازے سے باہر نکلا۔

چند لمحے وہ دم سادھے کھڑا رہا۔ اسے شبہ تھا کہ سردار اس کی ٹوہ میں ہو گا اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر اسے لاحاصل سمجھ کر وہ گول جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جھونپڑی کا دروازہ تلاش نہیں کر سکے گا۔ اس لئے وہ اس پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتا ہوا قدم قدم آگے بڑھتا رہا۔ اور وہ

بہت اضطراب بڑی الجھن محسوس کررہا تھا۔

اچانک جھونپڑی ایک جگہ سے کھل گئی۔ ایک ہاتھ باہر نکلا اور اسے اندر کھینچ لیا۔ اگلے لمحے وہ نرم نرم، گداز بانہوں میں تھا۔ اس سے پہلے کہ لڑکی کو اس کے ارادے کی خبر ہوتی اس نے اس کے لچکدار جسم کو اپنے بھینچنے سے چمٹالیا اور اس کے چہرے کے بڑھتے پر بوسوں کی بوچھاڑ کردی۔ لڑکی کسمساتی ہوئی خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ مائیکل کو اطمینان یہ تھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں خنجر نہیں تھا۔

"چھوڑو..... میری بات سنو!"

جیسے بارودی سرنگ پھٹ گئی ہو یا بم کا دھماکہ ہوا ہو یا دو جیٹ طیارے آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ مائیکل پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ لڑکی اس کا ہاتھ پکڑ کر چٹائی پر بیٹھانے لگی تو وہ مٹی کے تودے کی طرح ڈھیر ہوگیا۔

"جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اسے غور سے سنو......"

اچانک اسے ہوش آگیا جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اس کے خوابیدہ حواس کو تازیانہ لگا کر جگا دیا ہو اور اس نے جھٹ لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے یقین تھا کہ سردار جھونپڑی سے باہر کان لگائے کھڑا ہوگا۔ پھر اس نے اپنا منہ لڑکی کے کان سے لگا کر آہستہ سے کہا۔

"صبح منہ اندھیرے جھیل پر......"

لڑکی نے اپنے منہ پر سے اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تو پھر اس نے اس کے کان میں کہا......

"سردار!" یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھا اور ایک لمبا ڈگ بھر کر جھونپڑی سے نکل گیا۔ اس نے لڑکی کا ردعمل جاننے کا بھی انتظار نہ کیا۔

وہ رات پھر اس نے کروٹیں بدل کر کاٹ دی اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ جھونپڑی سے نکل کر جھیل پر چلا گیا۔ اسے لڑکی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی وہ آگئی اور اس کا چہرہ دیکھ کر مائیکل سمجھ گیا اس نے بھی رات جاگ کر گزاری ہے۔ وہ جھیل کی طرف پشت اور درختوں کی طرف منہ کرکے بیٹھ گیا تاکہ اگر سردار یا کوئی دوسرا آجائے تو اسے دیکھ سکے۔ اس نے لڑکی کو اشارے سے جھیل پر منہ دھونے کے لئے کہا۔ وہ منہ دھوتی جاتی تھی اور باتیں کرتی جاتی تھی۔

"تمہیں میرے بات کرنے سے حیرت ہورہی ہے نا!" وہ دھیمی آواز سے کہہ رہی تھی۔ "اس المناک داستان کے لئے تمہارے پاس وقت ہے نہ میرے پاس۔ لیکن وہ وقت ضرور آئے گا جب میں تمہیں سب کچھ بتا سکوں گی۔ اس وقت مجھے یہ کہنا ہے کہ میں ایک مظلوم اور بے بس لڑکی ہوں جو انسانی درندوں میں گھری ہوئی ہے اور ان کا سربراہ وہ شخص ہے جسے تم نے سردار کہا ہے۔ وہ تمہیں بھی یہاں سے زندہ سلامت جانے نہیں دے گا۔

اگر تم میری مدد کرو اور اپنی جان بھی بچانا ہو تو اس کا قصہ پاک کردو۔ پھر ہم دونوں یہاں سے فرار ہوجائیں گے۔ خواہ تم مجھے کہیں لے جاکر چھوڑ دینا یا اپنے پاس ہی رکھ لینا۔ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں اپنے ساتھ اتنا مال و دولت لے چلوں گی کہ تمہاری زندگی بن جائے گی۔ ساری عمر عیش کروگے۔ میں اس میں سے کچھ نہ لوں گی۔"

"لیکن...... لیکن......" مائیکل نے تھوک نگلتے ہوئے اور نظریں چاروں طرف دوڑاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "میں اسے کس طرح ٹھکانے لگاسکوں گا، یہاں اتنے سارے آدمی ہیں ہر دم اسے گھیرے رہتے ہیں چھوٹی سی جگہ ہے۔ یہ لوگ میری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔"

"وہ تمہاری جھونپڑی میں آتا رہتا ہے!" لڑکی پاؤں دھوتی ہوئی بولی۔ "میں تمہیں خنجر دوں گی۔ اس سے اسے جہنم رسید کردینا اور بھاگ کر میری جھونپڑی میں آجانا۔ گھنٹوں کسی کو اس بات کی خبر ہوگی کیونکہ وہ تنہائی کے کئی کئی گھنٹے کہیں نہ کہیں گزارتا ہے۔ میں نے بھاگنے کا سارا بندوبست کر رکھا ہے اور میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ اس کے قتل کی خبر پھیلنے سے پہلے ہم ان لوگوں کی پہنچ سے دور جاچکے ہوں گے۔ یہ ہمارا پیچھا بھی نہ کرپائیں گے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بس، اب کوئی اور سوال نہ پوچھو۔ یاد رکھو، اگر میری بات پر عمل نہ کیا تو دو ایک روز میں آگ پوجا کا تہوار ہوگا اور وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا!"

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے گیلے بال جھٹکتی ہوئی بولی۔ ”تمہیں یہ کام اس منحوس دن سے پہلے کرنا ہے، آج رات وہ خنجر تمہیں مل جائے گا!“ وہ جھومتے جھومتے قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی اور مائیکل کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے چھوڑ گئی۔

”قتل..... قتل..... قتل..... سردار لڑکی کو قتل کرانا چاہتا ہے اور لڑکی سردار کے قتل کے درپے ہے۔ دونوں اسے آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے جو دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہیں؟ اور دونوں نے ایک دوسرے کے قتل سے اس کی زندگی کو مشروط کر رکھا ہے۔ اس کی زندگی اس بہیمانہ فعل سے منسلک ہو کر کیوں رہ گئی ہے؟ کیا وہ جوزا کے قتل کے بعد مستقل طور پر اس جرم کا غلام بن کر رہ گیا ہے؟“

”جوزا..... جوزا قتل.....“

جوزا سے اس کی ملاقات برمنگھم کے ایک اوسط درجے کے کیفے میں انتونیو عرف پچو نے کرائی تھی۔ جوزا کے چہرے سے معصومیت اور آنکھوں سے صاف دلی جھلک رہی تھی۔ اس کے اسکرٹ کا گلا بھی مائیکل کے نزدیک ضرورت سے زیادہ تنگ تھا اور اس نے نیچی ایڑی کا سینڈل پہن رکھا تھا جس سے اس کی چال لچک سے محروم تھی۔ مائیکل کو وہ طبیعت سے ایک سپاٹ لڑکی نظر آئی۔ اس کی عمر اٹھارہ اور بیس کے درمیان رہی ہوگی۔ رنگ گلابی، بال بھورے، آنکھیں نیلی اور بڑی بڑی اور ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ حیفہ میں پیدا ہوئی، پیرس میں تعلیم پائی، جرمنی میں کچھ عرصہ رہی اور اب برمنگھم میں ملازمت کر رہی تھی۔

”جوزا کو آثار قدیمہ اور نوادرات سے بہت لگاؤ ہے!“ پچو نے اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ”اور یہی بات ہم دونوں کی دوستی کا باعث بھی ہے۔“ پھر اس نے جوزا سے کھانے کے متعلق پوچھا تو مائیکل کو اس کی آواز بڑی کھردری سی لگی۔

”میں صرف سوپ پیوں گی!“ اس نے کہا تھا۔

”تم یہودی ہو؟“ مائیکل نے بے ساختہ پوچھا۔

”نہیں!“ جوزا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرا باپ جرمن ڈاکٹر تھا۔ ماں فرانسیسی اسکول ٹیچر تھی۔ البتہ دونوں کچھ عرصے حیفہ میں رہے تھے اور وہیں میں پیدا ہوئی تھی۔“

وہ دیر تک غیر ضروری باتیں کرتے رہے اور اس دوران میں مائیکل کو جوزا کے وجود میں خالص عورت کسی لمحے نظر نہ آئی۔ اس کی باتیں خشک اور معلوماتی تھیں۔ مائیکل اس سے مل کر سخت مایوس ہوا۔

اس کے برعکس پچو سے پہلی ملاقات بہت دلچسپ رہی تھی۔ وہ ایک تیسرے درجے کے بار میں بیٹھا ایک شوقیہ دست شناس کو اپنا ہاتھ دکھا رہا تھا۔ ہاتھ دیکھنے والا دور کی ہانک رہا تھا اور مائیکل اس کی احمقانہ باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اسے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو ایک لمبوترے آم جیسے چہرے، لمبی ناک، گول گول آنکھوں والا پستہ قد شخص تھا جو بڑے انہماک سے دست شناس کی باتیں سن رہا تھا۔ جب یہ کھیل ختم ہوا اور مائیکل اٹھا تو وہ اجنبی اسے دیکھ کر مسکرایا۔ مائیکل کو بھی اخلاقاً مسکرانا پڑا۔ اور اجنبی نے بڑے تپاک سے اسے کھانے کی دعوت دی۔

”غیر ملکی ہو؟“ دونوں ایک کونے میں جا بیٹھے اور مائیکل اس کے تلفظ اور لہجے سے جان گیا کہ وہ وسطی یورپ کا رہنے والا ہے۔ مائیکل نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ”میں انتونیو ہوں لیکن مجھے پچو کہتے ہیں۔ مگر آثار قدیمہ میں ریکارڈ کیپر ہوں۔ تم قسمت کے بہت زیادہ قائل معلوم ہوتے ہو؟ ہندوستانی ہو؟“

”پیدا تو وہیں ہوا تھا لیکن عمر کا زیادہ حصہ یہیں گزرا ہے۔ تم مجھے چوتھائی انگریز کہہ سکتے ہو۔ میرا نام..... مائیکل ہے اور میں بس کنڈ کٹر ہوں!“ مائیکل ایک سانس میں کہہ گیا۔ ”تم شاید پہلی مرتبہ اس بار میں آئے ہو۔ میں نے پہلے تو تمہیں نہیں دیکھا؟“

”درست کہتے ہو دوست!“ پچو نے مسکرا کر کہا۔ ”میں یہاں اتفاقیہ آ نکلا ہوں۔ ایک شخص نے یہاں

ملنے کو کہا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔"

"دوسرا تو مل گیا!" مائیکل نے بے تکلفی سے ہنستے ہوئے کہا تو پنٹو بھی ہنسنے لگا۔

"بہت دلچسپ آدمی ہو دوست!" اس نے کہا۔

"اچھا کیا پیو گے!"

"گائے کا دودھ!" مائیکل نے کہا۔ اسے یہ شخص خود دلچسپ لگ رہا تھا۔ پنٹو نے ایک چھلا تیز قہقہہ لگایا۔ پھر اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ٹیکرو ویٹرس سے مائیکل کے لئے وسکی اور اپنے لئے بیئر لانے کو کہا۔

"ہاں تم نے بتایا نہیں کہ قسمت کے کچھ زیادہ ہی قائل ہو گیا؟" ویٹرس کے جانے کے بعد اس نے کہا۔

"بھئی دیانتداری کی بات تو یہ ہے کہ قائل ضرور ہوں، لیکن اس دست شناس سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔" مائیکل نے سگریٹ کیس کھولتے ہوئے کہا۔ ویٹرس نے دو گلاس لاکر میز پر رکھے تو مائیکل نے اس کے بھرے بھرے، آہنی بازو پر چٹکی لی۔ وہ ایک ادا سے وسکی لے کر دوہری ہوگئی اور کولہے مٹکاتی چلی گئی۔

"اس پہلی ملاقات کا جام......" پنٹو نے بیئر کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری خوش دلی کے نام!" مائیکل نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرا کر کہا۔

دونوں پیتے اور گپیں ہانکتے رہے۔ ایک دور ختم ہوا تو پنٹو نے مزید آرڈر دیا اور مائیکل اس کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا۔

"کل پکاڈلی میں کہیں ملو گے؟" مائیکل نے اس کا احسان اتارنے کے لئے پوچھا۔

"جہاں چاہو گے ملوں گا۔ کہو تو اسپتال یا جیل میں ملوں۔" پنٹو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر کسی جوئے خانے کا کہتے تو بات بھی تھی!" مائیکل نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "مجھ شریف آدمی کے لئے زیادہ شرافت کی جگہ چاہئے۔"

چنانچہ وہ اگلے روز ایک بڑے اور پرتکلف بار میں ملے اور مائیکل نے اس کی شاندار تواضع کرنا چاہی لیکن پنٹو نے اصرار کرکے اپنے لئے آئس کریم منگوائی۔ اس ملاقات کے بعد ان کے درمیان تکلف اور وضع پرستی کی رہی سہی دیوار بھی گر گئی اور وہ یوں گھلے ملے جیسے برسوں کے یار ہوں۔

"یہ تمہاری جوزا کیسی لڑکی ہے؟" مائیکل نے جوزا سے ملاقات کے بعد اس شام پنٹو سے پوچھا۔

"اب تو وہ تمہاری بھی ہے!" پنٹو نے اپنی لمبی ناک کو مروڑتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "رہا سوال کیسی لڑکی ہے تو اچھی لڑکی ہے۔ دکھی ہے اور سیدھی سادی ہے۔"

"ہوں!" مائیکل نے ہنکارا بھرا "بڑی دلچسپ لڑکی ہے۔"

"ہاں تم جیسے رنگین مزاج کے شاید کام کی نہ ہو۔" پنٹو نے چوٹ کی اور مائیکل اسے پی گیا۔ "البتہ حساس ہے۔ دکھ سکھ کی ساتھی ہے۔ ایک اچھی دوست ہے!" پنٹو نے بات ختم کرکے بیئر کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

"مجھے کسی دکھ سکھ کے ساتھی کی ضرورت ہے نہ اچھے دوست کی۔" مائیکل نے منہ بنا کر کہا۔ "میری زندگی ساری پابندیوں اور تکلفات سے آزاد گزرتی ہے۔ میں اچھائی کا معیار دیکھنا چاہتا ہوں نہ برائی کی پرکھ کرتا۔ آؤ کہیں چلیں۔"

"چلو!" پنٹو فوراً تیار ہوگیا۔ بل ادا کرکے وہ بار سے نکلے اور پیدل ہی فٹ پاتھ پر چل پڑے۔

مائیکل نے اپنے بارے میں کھری بات کہی تھی۔ وہ ہر پابندی سے آزاد تھا۔ اس کے نزدیک اچھائی اور برائی کا کوئی معیار نہ تھا۔ گزشتہ دو سال سے وہ بس کنڈیکٹری کررہا تھا۔ اس سے پہلے کھاتا تھا، سوتا تھا اور دندناتا پھرتا رہا۔ اس وقت اس کا مربی اور سرپرست زندہ تھا۔ وہ ایک انگریز ریٹائرڈ فوجی افسر تھا۔ مائیکل نے اس کی عمر کے آخری حصے میں دل و جان سے خدمت کی۔ پھر ایک دن وہ ریٹائرڈ بوڑھا اس اپنائیت اور خدمت سے منہ موڑ کر رشتہ حیات سے بھی ریٹائر ہوگیا اور مائیکل کو مجبوراً نوکری کرنی پڑی کیونکہ اس کے روحانی باپ نے اس کے لئے دولت یا جائیداد قسم کی کوئی چیز نہیں چھوڑی تھی۔

مائیکل کو اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ کبھی ہندوستان کی فوج میں کوئی افسر تھا اور اپنے بارے میں یہ کہ وہ اس انگریز کا لے پالک تھا جو جانے کیتھولک تھا یا پروٹسٹنٹ آزاد خیال عیسائی تھا، یا ملحد؟ مائیکل نے اسے کبھی گرجا جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی اپنا کوئی تہوار مناتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گھر میں یسوع مسیح یا کنواری مریم کی کوئی شبیہہ نہیں تھی۔ اس کا محبوب مشغلہ شراب نوشی اور ریس کھیلنا تھا۔ اچھا کھانے کا شوق تھا لیکن پہننے سے شغف نہ تھا۔ اس نے مائیکل کو کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کا لڑکا ہے؟ اس کے ماں باپ کون تھے؟ وہ اسے کیسے اور کہاں ملا؟

مائیکل نے بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کرسچن ہے، ہندو یا مسلمان کبھی کبھی اسے اپنے اچھوت ہونے کا شبہ گزرتا تھا لیکن اس نے اپنے روحانی باپ سے اس کی تصدیق نہیں چاہی۔ اسے پرائیویٹ اسکول میں داخل کرایا گیا تھا اور وہاں اس کا نام مائیکل لکھوایا گیا تھا۔ یہاں ویڈ کر اس کے اساتذہ پڑھاتے تھے۔

انگریز فوجی افسر اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو گیا تو پنشن لے کر انگلینڈ چلا آیا اور برمنگھم میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں وہ اکثر شراب نوشی سے ٹی بی میں مبتلا ہو گیا۔ اور اس کی تیمارداری پڑھائی جاری رکھنے سے زیادہ ضروری تھی۔ مائیکل ہائر سیکنڈری کر چکا تھا۔ پنشن کی رقم دو آدمیوں کی کفالت کے لئے کافی تھی لیکن اب بوڑھا اسے دنیا میں تنہا چھوڑ گیا تو اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔

مائیکل ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور اچھے قد و قامت کا تھا۔ تھوڑی سی بھاگ دوڑ کر کے اسے بس کنڈکٹری مل گئی اور اس نے ایک پسماندہ علاقے میں سستی رہائش اختیار کر لی۔

جب تک اس کا مربی زندہ رہا اس نے اپنے گرد و پیش سے کوئی علاقہ نہ دیکھا تھا لیکن اس سے بچھڑ کر اور ملازمت سے ناطہ جوڑ لیا۔ شراب اس کی ایک ضرورت بن گئی اور عورت بھی شجر ممنوعہ نہ رہی۔ ریس کھیلنا اس کے بس سے باہر تھا لیکن جوئے کے لئے زیادہ رقم درکار نہیں ہوتی تھی سستے کلبوں کی شراب اور طوائفیں اس کے فرصت کے اوقات کی دلچسپیاں تھیں اسے رنگ روپ اور قابل رشک صحت دینے میں قدرت نے بہت فراخدلی سے کام لیا تھا اور جسم کا کاروبار کرنے والیاں اسے اپنے نفع بخش کاروبار میں رعایت بھی دیتی تھیں ان ہی مرحلوں پر اس کی ملاقات اس خوش طبع اور نیم مسخرے سا تو نیو عرف پنچو سے ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

اس دوپہر مائیکل اپنے اپارٹمنٹ میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کی جیب خالی تھی اور ہفتہ وار تنخواہ ملنے میں ابھی پورے بیس گھنٹے باقی تھے۔ اس کے پاس سگریٹ تک کے لئے پیسے نہیں تھے۔ ناشتہ تو اس نے ڈبل روٹی مکھن اور کافی سے کر ہی لیا تھا لیکن اب مزید ایک ناشتہ اور دو کھانے درکار تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے ایک نیگرو دوست برٹن سے ادھار لے اور جا کر پنچو کو کہیں پکڑے کہ باہر دستک ہوئی۔ وہ دعا مانگتے ہوئے اٹھا کہ دروازے پر پنچو ہو اور سلیپنگ سوٹ کے بٹن لگاتا جا کر دروازہ کھولا تو سامنے جوزا تھی۔

''تم......؟'' اسے حیرت ہوئی کہ جوزا نے اس کا اپارٹمنٹ کیسے تلاش کر لیا۔

''جستجو سے کیا نہیں ملتا ہے!'' وہ بے تکلفی سے کمرے میں داخل ہوئی اور تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ پھر دھپ سے بستر پر بیٹھ کر بولی۔ ''پنچو سے پتہ معلوم کر لیا تھا!''

''اوہ!'' مائیکل نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اس شیطان نے میرا گوشہ عافیت تمہیں بتا ہی دیا۔''

''میں تمہیں لینے آئی ہوں!'' جوزا نے بغیر تمہید کے کہا۔ ''تمہیں اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔''

''تمہارے گھر؟ کوئی تقریب ہے کیا؟'' مائیکل نے نیم مسکراہٹ سے پوچھا۔

''ارے نہیں!'' جوزا اٹھ کر اس کے پاس آئی اور اس کے سلیپنگ سوٹ کے بٹن سے کھیلتے ہوئے کہنے

گی۔" تم سے باتیں کرنی ہیں!"

مائیکل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر کی طرف معنی خیز اشارہ کرکے کہا۔ "باتیں تو یہاں بھی ہوسکتی ہیں!"

جوزا ہنس کر اس سے الگ ہٹ گئی۔ اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی چیزوں کو ترتیب سے رکھتی ہوئی بولی۔

"کھانے کے ساتھ باتیں ہوں گی، میں نے اپنے ہاتھ سے ڈشیں تیار کی ہیں اور بہت عمدہ وسکی بھی لے آئی ہوں۔ چلو جلدی کرو۔"

مائیکل نے دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کیا اور باتھ روم میں جاکر لباس تبدیل کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ جوزا کے ساتھ اس کے چھوٹے سے بڑے سلیقے سے سجے ہوئے دو کمروں کے فلیٹ میں تھا۔

"بڑی باذوق لڑکی ہو!" اس نے نشست گاہ کی دیواروں اور ساز و سامان پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ!" جوزا بولی اور ملحقہ کچن میں کھانا لگانے چلی گئی۔

"اتنا تکلف کیوں کیا؟" مائیکل نے تلی ہوئی مچھلی کے قتلوں، روسٹ گوشت کے پارچوں، ابلے ہوئے انڈوں، آلو کے چپس، پڈنگ اور ڈھیر سے تر و تازہ سلاد پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم پہلی بار آئے ہو اس لئے۔" جوزا نے صاف گوئی سے کہا۔ "آتے رہو گے اسی طرح خاطر مدارات کروں گی!"

"اب کرو باتیں!" مائیکل نے اطمینان سے ڈشوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس کچھ چیزیں ہیں جو میں فروخت کرنا چاہتی ہوں۔" جوزا نیپکین اپنے گلے میں ٹھونستے ہوئے بولی۔ "یہ چیزیں مجھے ورثہ میں ملی ہیں اور میں اپنے ماں باپ کی نشانیوں کو ہرگز اپنے سے جدا نہ کرتی لیکن...... مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے سن رہے ہو۔"

مائیکل کی توجہ کا مرکز مچھلی کے قتلوں کو بنتا دیکھ کر اس نے ٹوکا۔

"کہے جاؤ، سن رہا ہوں۔" مائیکل نے بھرے ہوئے منہ سے کہا۔ "ان قتلوں کے ساتھ انصاف بھی تو کرنا ہے۔ بہت لذیذ پکاتی ہو۔"

"شکریہ!" جوزا نے مسکرا کر کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ ان قیمتی اور نادر چیزوں کو تم لے جاکر فروخت کردو۔"

"کیوں؟" مائیکل کی اٹھی ہوئی بھنووں نے پوچھا۔

"مجھے کسی اور پر بھروسہ نہیں ہے!" جوزا نے اس کی سوالیہ ابروؤں کو بتایا۔ "اور یہ کام تمہیں روم یا پیرس جاکر کرنا ہوگا۔"

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"یہ انگریز بڑے کنجوس ہوتے ہیں، ضرورت سے زیادہ فالتو چیزیں نہیں خریدتے اور پھر یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے خریدار جدی پشتی رئیس ہوسکتے ہیں یا دولت لٹانے والے سیاح اور وہ روم میں ملیں گے یا پیرس میں، میرے پاس جو چیزیں ہیں وہ امیروں کے چونچلوں کی طرح ہیں۔"

"مثلاً۔" مائیکل نے سلاد پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تم خود دیکھ کر اندازہ لگا لو گے۔" جوزا نے نیپکن سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اور میں تمہاری اس مدد کے لئے تمہیں بھی تمہارا حصہ دوں گی!"

مائیکل نے ہاتھ روک کر کہا۔ "کمیشن دو گی؟ مجھے سیلز مین بنا کر بھیجو گی۔"

اس کی تنی ہوئی بھنویں دیکھ کر جوزا جلدی سے بولی۔

"ارے نہیں تم تو برا مان گئے جانی میرا مطلب یہ تھا کہ تم چھٹی لے کر جاؤ گے۔ آنے جانے اور وہاں ٹھہرنے کا خرچ بھی ہوگا۔ اس کی ادائیگی تو مجھے کرنا ہی ہے۔"

"اس کی تم پرواہ مت کرو۔" مائیکل نے اسے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں تو میرا اس میں کیا جاتا ہے۔ اس بہانے روم اور پیرس کی سیر بھی ہوجائے گی۔"

"میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھلاؤں گی لیکن سفر

خرچ تو تمہیں بہر حال لینا ہے۔ تم ایسے کہاں کے رئیس ہو۔" جوزا اپنی مسرت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

کھانا کھا کر وہ نشست گاہ میں آگئے اور جوزا نے وہسکی کی بوتل اور گلاس لا کر رکھا اور برف لانے چلی گئی۔ مائیکل نفیس وہسکی کی چسکیاں مزے لے لے کر پی رہا تھا کہ وہ ساتھ کے کمرے سے ایک سوٹ کیس اٹھا لائی اور اسے صوفے کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ اس نے چابی سے اسے کھولا اور اندر سے ایک چھوٹا سا سفری سوٹ کیس نکالا۔ پھر اسے چابی سے کھولا تو اس کے اندر سے لکڑی کی ایک مستطیل صندوقچی برآمد ہوئی۔

مائیکل دلچسپی سے اس کے ہاتھوں کی حرکت کو دیکھتا رہا۔ اس نے صندوقچی کو بھی چابی لگا کر کھولا اور اس کا ڈھکن اٹھا کر صندوقچی مائیکل کی طرف بڑھا دی۔ مائیکل نے اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر دیکھا تو اس میں وینس کا ایک بالشت بھر لمبا چمکتا ہوا مجسمہ اور جگمگاتے ہوئے ہیروں کے دو ہار تھے۔ "میں نے صرف یہ دو چیزیں یہاں رکھی ہیں۔" جوزا کہہ رہی تھی۔ "باقی چیزیں میری نانی کے پاس ہیں۔ وہ یہاں سے کوئی اسی میل دور رہتی ہیں یہاں چوری ہونے کا خطرہ ہے۔"

"ان کی مالیت کیا ہوگی؟" مائیکل نے مجسمے کو الٹتے ہوئے کہا۔

"اس لحاظ سے یہ چیزیں انمول ہیں کہ میرے باپ کی یادگار ہیں۔" جوزا نے افسردگی سے کہا۔ "اور مالی اعتبار سے ان کی قیمت ہزاروں پونڈ میں ہے۔ یہ تو گاہک کی پسند اور فروخت کرنے والے کی ہنرمندی پر منحصر ہے کہ وہ گاہک کا انتخاب کیسے کرتا ہے اور ان چیزوں کی قدر و قیمت سے اسے کیسے قائل کرتا ہے۔"

"پھر بھی تم کچھ اشارہ تو دوگی۔ میں نے یہ کام پہلے کبھی نہیں کیا ہے اس لئے اناڑی ہوں۔ کہیں گھاٹے کا سودا نہ کر بیٹھوں۔" مائیکل نے مجسمہ صندوقچی میں رکھ کر ہار اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔" جوزا نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "یوں کرو......" وہ سوچنے لگی پھر بولی۔ "اس مجسمے کو تین چار ہزار پونڈ تک نکالنے کی کوشش کرو۔ خالص سونے کا ہے اور بڑی نایاب چیز ہے۔ سیاح اسے ضرور پسند کریں گے اور یہ ہار بھی بڑے قیمتی ہیروں کے ہیں۔ انہیں تو رئیس لوگ اور ان کی بیگمات ہی خرید سکتی ہیں۔ ایک ہار پانچ ہزار سے سات ہزار پونڈ تک نکال دو۔"

مائیکل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے رک رک کر کہا۔ "اس کے لئے تو بہت کوشش کرنا ہوگی۔ بہت سے لوگوں کو انہیں دکھانا ہوگا۔"

"یہ تو ہوگا!" جوزا نے کہا۔ "اور یہ تو دیکھو کہ اتنی قیمتی چیزیں کیسے، میں تم پر بھروسہ کر کے بغیر ثبوت کے دے رہی ہوں۔"

مائیکل نے تشکر سے لبریز دل سے اس کی بات کو تسلیم کیا اور جوش سے بولا۔ "میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ تم نے مجھے جو مقام بخشا ہے اس کا پاس کروں گا۔"

جوزا اس کے پاس صوفے پر بیٹھی اور اس سے لگتے ہوئے کہنے لگی۔ "ہاں تم سے واقعی دوستی چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ تم یہ گھٹیا لیس کنڈ یکٹری چھوڑ دو اور ہم ایک چھوٹا سا وار یسٹوران کھول لیں۔"

"پھر وہاں ہیڈ ویٹر ہوگا!" مائیکل نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

"نہیں دربان ہوگا۔ گاہکوں کے لئے دروازہ کھولے گا!" جوزا ہنس کر بولی۔ پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔ "بہت مخلص آدمی ہے، اس کی وجہ سے تو تم سے تعلق پیدا ہوا ہے۔"

مائیکل نے اس کے آدھے کھلے ہونٹوں پر ایک مزید بوسہ کی مہر ثبت کی۔

"میں تمہیں پانچ سو پونڈ نقد دے رہی ہوں۔ وہاں تمہیں بہترین لباس میں ٹھاٹھ سے رہنا ہوگا۔ اسی طرح تم لوگوں کو متاثر کر سکو گے؟" جوزا نے اپنا چہرہ اس کے تنفس کی گرمی سے دور ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تو

کب جا رہے ہو؟''

''کل صبح چھٹی لوں گا اور شام کو ہی چلا جاؤں گا۔ پاسپورٹ تو میرے پاس ہے ہی۔'' مائیکل نے دوستی کے رشتے کو پختہ کرنے کے لئے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

''آج رات یہیں رہ جاؤ۔'' جوزا شوخی سے بولی۔ ''بڑی مزیدار چیز سے تمہاری دعوت کروں گی!''

''سچ!'' اس کی پرمعنی مسکراہٹ کو دیکھتے ہوئے مائیکل نے کہا۔

جوزا نے ایک ادا سے اثبات میں سر ہلایا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی مائیکل اس کی اس ادا پر مر گیا۔

☆......☆......☆

جوزا کے مشورے سے اس نے روم کو اپنی پہلی منزل پر منتخب کیا۔ وہاں امریکی، برطانوی، یورپی اور ایشیائی سیاح کی ریل پیل تھی۔ مائیکل نے ایک پررونق شاہراہ کے باوقار ہوٹل میں قیام کیا جہاں ٹھہرنے والوں کی اکثریت امریکیوں کی تھی۔ اور تیسرے دن ہی اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی۔ ایک سنکی امریکن سے مجسمے کا سودا ہوگیا۔ البتہ دام جوزا کی بتائی ہوئی رقم سے کم لگے۔ گاہک نے اٹھائیس سو پونڈ کی پیشکش کی اور مائیکل نے یہ سوچ کر کہ وہ ہاروں میں کسر پوری کرلے گا۔ یہ پیشکش قبول کرلی لیکن اسے روم میں ہاروں کا گاہک نہ مل سکا۔ تین دن وہ ہوٹل میں ٹھہرا اور اس دوران میں تیس چالیس عورتوں مردوں سے بات چیت ہوئی لیکن کوئی اتنا بیش قیمت ہار خریدنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ناچار اس نے پیرس جاکر قسمت آزمائی کرنے کی ٹھانی۔ مجسمے کے خریدار نے اسے امریکی ڈالر میں رقم دی تھی۔ ڈالر اس نے پونڈ میں تبدیل کرائے اور پیرس کے لئے روانہ ہوگیا۔

پیرس میں وہ سب سے پہلے دو جوہریوں کی دکان پر گیا اور دونوں نے اس سے ہار خریدے جانے کی رسید طلب کی۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرکے وہاں سے کھسک گیا۔ تیسری دکان پر قسمت آزمانے پہنچا تو اس کا مالک درمیانہ عمر کا ایک معقول آدمی نظر آیا۔ اس نے دونوں ہاروں کو دیکھا اور مائیکل کو بڑی تعظیم سے بٹھایا۔ مشروب کی بھی پیشکش کی لیکن مائیکل نے شکریہ ادا کرنے پر اکتفا کیا۔ پھر دکاندار نے کہا کہ ''وہ اپنے پارٹنر سے مشورہ کرکے بات آگے بڑھا سکے گا۔''

وہ دونوں ہار اس کے پاس چھوڑ جائے اور ان کی رسید لے لے۔ اگلے روز آکر معلوم کرلے۔ دکان بہت بڑی تھی۔ لاکھوں فرانک کی مالیت کے زیورات شوکیس میں رکھے تھے۔ پھر دکاندار کا طرز عمل اور لب و لہجہ بہت متاثر کن تھا۔ مائیکل نے کوئی تردد محسوس نہ کیا بخوشی ہار اسے دے کر رسید لی اپنے ہوٹل کا پتہ لکھوایا اور مطمئن ہوکر چل دیا۔

رات گیارہ بجے کے قریب وہ ہوٹل میں اپنے بستر پر لیٹا سگریٹ کے کش لگاتا ہوا جوزا کے ساتھ مستقبل کے خوش آئند تصورات میں کھویا ہوا تھا کہ کمرے پر دستک ہوئی۔ یہ سمجھ کر کہ بیرا کچھ کہنے آیا ہوگا، اس نے دروازہ کھولا تو لمبے کوٹوں میں ملبوس فلیٹ ہیٹ لگائے دو آدمی تھے۔ ایک نے اس کی طرف ایک چٹ بڑھائی جس پر اس کا نام اور ہوٹل کا پتہ لکھا ہوا تھا اور مائیکل اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ہم دونوں پولیس انسپکٹرز ہیں اور تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں!'' چٹ دکھانے والے نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر دونوں کمرے میں داخل ہوگئے۔ مائیکل حیران نظروں سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

''مسیو کی......'' انسپکٹر نے کہا۔

''مائیکل!'' مائیکل نے اپنا نام پورا کردیا اور کرسیوں کی طرف اشارہ کرکے انہیں بیٹھنے کو کہا۔

''تمہارے پاس وہ ہار کیسے آئے جو تم جوہری کی دکان پر چھوڑ آئے ہو!'' انسپکٹر نے بلاتمہید پوچھا۔

''ہار......! کیسے آئے؟ کیا مطلب؟'' مائیکل نے بلاخوف کہا۔ اور ان کے سامنے بستر پر بیٹھ گیا۔

''مطلب یہ ہے کہ تم نے وہ ہار کسی سے خریدے ہیں یا تمہارے اپنے ہیں؟'' انسپکٹر کے ساتھی نے

سوال کیا۔

مائیکل اس سوال سے چکرا گیا۔ ایک انجانا خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور اس نے دلیری سے کہنے کی کوشش کی۔ ''ہاں...... یہ میرے اپنے ہیں!!''

دونوں انسپکٹروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک نے اس سے کہا۔ ''تمہیں ہمارے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا!''

''کیوں؟'' مائیکل نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ ''کیوں چلنا ہوگا؟ یہ ہار......!''

''کوئی ثبوت؟'' اب مائیکل نے اس کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔ ''اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ یہ چوری کے ہیں؟''

''ثبوت بھی فراہم کردیا جائے گا موسیو!'' انسپکٹر نے رسان سے کہا۔ ''ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ ہار تمہارے پاس کیسے اور کس ذریعے سے آئے ہیں یا......!''

''میں نے چرائے ہیں یہی بات ہے نا!'' مائیکل نے غصے سے کہا۔ ''تو سن لو کہ اس کا مالک موجود ہے خواہ وہ میں ہوں یا کوئی اور فی الحال یہ میری ملکیت ہیں اور ہوسکتا ہے...... ہوسکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو یا جوہری نے غلط سمجھ لیا ہو۔''

''یہی بات جاننے کے لئے تو تمہیں ہیڈ کوارٹر لے جایا جارہا ہے۔'' انسپکٹر نے تحمل مزاجی سے کہا۔ ''تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ اب جلدی سے تیار ہوجاؤ۔''

مائیکل سخت مخمصے میں تھا کہ کیا کرے۔ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ ہار اس کے ہیں اور اب وہ ان کی ملکیت کو کیسے ثابت کرے گا کیوں نہ اصل بات بتادی جائے کہ ان کی مالکہ انگلینڈ میں ہے اور یہ ہار چوری کے نہیں ہیں۔

بہر حال اسے پولیس ہیڈ کوارٹر جانا تھا اور وہ گیا۔ پولیس افسر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور دونوں انسپکٹروں سے فرانسیسی میں باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک انسپکٹر نے اٹھ کر دفتر کے ایک کونے میں کھڑا ہوا لوہے کا بڑا سا کیبنٹ کھولا اور اس میں کچھ تلاش کرتا رہا۔ اس اثناء میں مائیکل چھت کو گھورتا رہا۔ گاہے گاہے پولیس افسر اور دوسرے انسپکٹر کے چہروں پر نظر ڈالتا اور ہر مرتبہ ان کی نظریں اپنے چہرے پر گڑی دیکھتا تو گھبرا کر نظریں چرالیتا۔ اسے سخت بے چینی ہورہی تھی۔ اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ پانچ سات منٹ بعد کیبنٹ کھولنے والا انسپکٹر دونوں ہاتھوں میں کوئی چالیس کے قریب تصویریں اٹھائے آیا اور انہیں پولیس افسر کی میز پر ڈھیر کردیا۔

''ان تصویروں میں اگر تمہارا کوئی شناسا چہرہ ہو تو بتاؤ۔'' پولیس افسر نے مائیکل سے کہا۔ اور اس نے متذبذب سا ہو کر اپنی کرسی آگے کھسکالی۔ عورتیں اور مرد، دونوں کی تصویریں تھیں۔ وہ ایک ایک کرکے اٹھاتا، دیکھتا اور رکھ دیتا۔ تقریباً بیس تصویریں دیکھنے کے بعد اس کے ہاتھ رک گئے اور اس نے ہاتھ میں لی ہوئی تصویر میز پر نہیں رکھی غور سے اسے دیکھتا رہا۔

''اسے پہچانتے ہو؟'' پولیس افسر نے اس کا انہماک دیکھ کر پوچھا اس نے اثبات میں سر ہلایا وہ ڈوڈی کی تصویر کو کیسے نہ پہچانتا۔

''اب اسے دیکھو!'' پولیس نے بقیہ تصویروں کو پنسل کی پشت سے کرید کر ایک عورت کی تصویر کو اس کے سامنے کردیا اور وہ چونک پڑا۔ ''اسے بھی پہچانتے ہو؟'' پولیس افسر کی نرم لیکن تحکمانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''یہ...... یہ...... جوزافین ہے!'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا جرم ثابت ہوگیا ہے میرے دوست!'' پولیس افسر نے پشت کرسی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں ان دونوں کے پتے ٹھکانے بتانے ہوں گے۔''

''ہاں...... میری سمجھ میں...... یہ سب کیا ہے؟'' الفاظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔

"پکڑے جانے والے سب ہی یہ کہتے ہیں۔"
پولیس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ "کوئی نئی بات کرو، نئی کہانی سناؤ۔"

"میں سچ کہتا ہوں...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" اس کی زبان کی گرہ کھل نہیں رہی تھی۔

"اب زیادہ اداکاری نہ دکھاؤ۔" پولیس افسر نے آنکھیں نکال کر اور لہجہ بدل کر کہا۔ "صرف یہ بتا دو کہ ہمیں کس ملک میں اور کس شہر میں چلنا ہے۔ ہمیں ایک عرصے سے تمہارے گروہ کی تلاش تھی۔ لاکھوں فرانک کا مال ہضم کر گئے ہو تم لوگ!"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کسی گروہ کو نہیں جانتا!" اس نے زندگی میں پہلی بار خود کو کسی عقیدے کا پیرو سمجھا۔ "اگر یہ لوگ چور ہیں...... !" اس نے پنچو اور جوزا کی تصویروں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تو میں بلا تامل تمہیں ان کے پاس لے چلوں گا۔ میں ایک قانون پسند شہری ہوں۔"

"تو پھر ہمیں کہاں چلنا ہے۔" پولیس افسر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"انگلینڈ برمنگھم......" مائیکل نے بلا پس و پیش کہا۔

"تم وہاں کیا کرتے ہو؟"

"وہاں چل کر تمہیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا!"

"ہم صبح کی فلائٹ سے چلیں گے۔ تم رات یہیں رہو گے۔"

اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

برمنگھم کے محکمہ آثار قدیمہ کی دو منزلہ عمارت سے کچھ فاصلے پر ایک سیاہ رنگ کی کیڈلک آ کر رکی۔ اور اس میں سے مائیکل کے ساتھ بلیک سوٹوں میں ملبوس فلیٹ ہیٹ لگائے دو آدمی اترے۔ ایک وہیں کار کے پاس کھڑا رہا اور دوسرا عمارت کی طرف بڑھا اور باہر ہی رک گیا۔ پروگرام کے مطابق مائیکل کو اندر جا کر پنچو کو باہر لے آنا تھا۔ اس نے استقبالیہ پر پنچو کے بارے میں معلوم کیا تو اسے دوسری منزل کا ایک کمرہ بتا دیا گیا۔

پنچو فائلوں اور رجسٹروں سے بھرے ہوئے چھت کو چھوتے ہوئے شیلفوں کے درمیان بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ مائیکل کو دیکھتے ہی وہ ہڑ بڑا کر کھڑا ہو گیا اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کی صورت دیکھ کر مائیکل اپنا قانون پسند شہری ہونا بھول گیا۔ اس کا جرائم پیشہ ہونا بھول گیا۔ اسے صرف اپنا دوست پنچو یاد رہا۔ ایک خوش مزاج اور فراخدل انسان یاد نہ رہا۔ مائیکل کو اس کے چہرے پر جرم کی علامت کہیں نظر نہ آئی۔ وہاں تو اسے خلوص اور جذبہ ہمدردی کی چھاپ دکھائی دی۔ اس نے پھولی ہوئی سانس سے اسے جلدی جلدی سب کچھ بتا دیا۔

"پولیس کہاں ہے؟" پنچو نے اضطراب سے پوچھا۔

"نیچے سڑک پر!" مائیکل نے بتایا۔

پنچو اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لایا اور دونوں لمبی راہداری سے تقریباً دوڑتے ہوئے گزر کر آخری سرے پر لوہے کے گول زینے سے نیچے اترنے لگے۔ چند منٹوں میں وہ عمارت کی پچھلی سڑک پر تھے۔ انہوں نے تیز تیز قدموں سے موڑ کاٹا اور پنچو نے ایک ٹیکسی روک کر ڈرائیور کو جوزا کا پتا بتا دیا۔ راستہ بھر دونوں خاموش رہے۔ جوزا کے فلیٹ پر پہنچ کر پنچو نے دروازے پر مکا مار کر چلاتے ہوئے کہا۔ "جوزا...... دروازہ کھولو۔"

چند لمحوں بعد اندر سے سلیپر گھسیٹ کر چلنے کی آواز آئی۔ اور جوزا نے دروازہ کھولا۔ اس کے جسم پر صرف ایک باریک گاؤن لپٹا ہوا تھا۔ اور وہ اس کے بٹن لگا رہی تھی جیسے برہنگی کی حالت میں اٹھ کر آئی ہو۔ پنچو بھاگ کر کمرے سے گیا تو مائیکل بھی نیم برہنہ جوزا کو حیرت زدہ چھوڑ کر اس کے پیچھے دوڑا۔ وہ ملحقہ کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اس کی نظر ایک نیگرو پر پڑی۔ جس کے جسم کا اوپر کا حصہ ننگا تھا اور دروازے کی طرف پشت کیے اطمینان سے پتلون پہن رہا تھا۔

مائیکل کی دوسری نظر شکن آلود بستر پر گئی اور وہ سمجھ

گیا کہ کچھ دیر پہلے کمرے کے در و دیوار کیا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ اس کے تخیل میں جوزا کا سر ریزہ ریزہ ہو کر پاش پاش ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر جوزا کی طرف دیکھا اور نفرت آمیز حقارت کی چنگاریاں اس کی آنکھوں سے نکل کر جوزا کے خفت زدہ چہرے سے ٹکرائیں۔ پھر اس نے سر گھما کر نیگرو کی طرف دیکھا جو اسی اطمینان کے ساتھ فینسی پہن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مائیکل کی نگاہیں جم سی گئیں۔

جیل میں پولیس افسر نے اسے شناخت کے لئے جو تصویریں دکھائی تھیں ان میں ایک چہرہ یہ بھی تھا۔ اس نے پچو کی طرف دیکھا جو دیوار سے جڑی ہوئی الماری سے نہ جانے کیا کیا نکال کر ایک سوٹ کیس میں ڈالتا جا رہا تھا۔ اور پھر وہ دانت پیستا ہوا جوزا کی طرف بڑھا۔

”مکار...... چور......!“ اس نے جوزا کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ ”تو...... تو نے چوری کے ہار مجھے دیئے کر......“

”جو......!“ جوزا نے چیخ کر اس کی بات پوری نہ ہونے دی۔ ”جو اسے پکڑ لو...... ختم کر دو اسے۔“

اگلے لمحے اس کے کانوں نے کمانی دار چاقو کھلنے کی کڑکڑاہٹ ٹکرائی اور بجلی کی سی سرعت سے اس نے ایک طرف اچھل کر جو کا وار خالی کر دیا۔ جو غراتا ہوا دوبارہ اس پر جھپٹا اور اس نے جھکائی دے کر جو کے پیٹ میں ایک زوردار گھونسہ لگایا اور وہ کراہ کر لڑکھڑایا تو مائیکل نے اس سے چاقو چھین لیا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا اور ایک جنونی کیفیت سے چاقو تانے وہ جو پر لپکا۔

جو نے چیتے کی طرح پھرتی دکھا کر جوزا کو پیچھے سے پکڑ کر اس کے سامنے کر دیا۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رک نہ پایا اور چاقو جوزا کے پیٹ میں اتر گیا۔ اس کی دلخراش چیخ سن کر اپنے کام میں مستغرق پچو نے پلٹ کر دیکھا اور پھر لمبے لمبے قدم اٹھا کر ان کے قریب آیا تو فرش پر چت پڑی ہوئی جوزا کی کھلی آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں۔

”یہ...... یہ تم نے کیا کیا!؟ اسے...... م...... م...... مار ڈالا؟“ وہ لکنت سے بڑبڑایا۔

مائیکل سناٹے میں تھا اور جو دونوں ہاتھ پیچھے باندھے ڈھیلے بدن سے لاپرواہ سا کھڑا تھا۔ جیسے جوزا کا قتل چنداں افسوس اور تشویش کی بات نہیں تھی۔

”جو...... وہ سوٹ کیس اٹھا لاؤ...... چلو جلدی کرو!“ پچو نے مائیکل کا ہاتھ پکڑا اور اس کے پتھرائے ہوئے جسم کو گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر آ کر اس نے ٹیکسی روکی اور تینوں پیچھے بیٹھے تو پچو نے ڈرائیور کو کسی جگہ کا پتا بتایا۔ ٹیکسی چلتی رہی اور دروازے کے قریب بیٹھا ہوا پچو بند شیشے سے سر ٹکا کر مستقل باہر دیکھتا رہا۔ دروازے میں بیٹھا جو مزے سے پاؤں پھیلا کر گنگناتا رہا اور مائیکل جیسے کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا رہا تھا۔

پچو انہیں جہاں لے گیا وہ صنعتی علاقہ تھا۔ گرد و پیش میں دور دور تک فیکٹریاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک پانچ منزلہ بوسیدہ بلڈنگ کی پانچویں منزل پر ایک سیلن زدہ نیم تاریک کمرے میں ٹھہرے جہاں ہوا کا گزر یوں تھا جیسے چھپ چھپا کر کبھی ابھی گھس آئی ہو۔ وہ ساری رات اور اگلا سارا دن پچو غائب رہا۔ مائیکل کی تو بھوک پیاس ہی غائب تھی۔ جو بھی اس طرف سے بے فکر نظر آتا تھا۔ مائیکل سوچتا رہا کہ جانے یہ جو کس مٹی کا بنا ہوا ہے کہ انسانی احساسات اسے چھو کر نہیں گزرے تھے۔

اگلے روز پچو لوٹا تو اس نے آتے ہی ان سے چلنے کو کہا۔ اس دوران میں مائیکل اپنے حواس پر قابو پا چکا اور جوزا کا قتل اس کے ذہن کے پردے پر اس کے انجام کی ایک بھیانک تصویر کھینچ رہا تھا۔ اس نے مری ہوئی آواز سے پوچھا کہ پچو اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ تو پچو نے جواب میں صرف اتنا کہا۔ ”جہاں جیل خانہ اور گیس چیمبر نہیں ہوگا۔ آزادی اور درندگی نہ ہوگی۔ رہنے کھانے پینے، پہننے اور عیش کرنے کے لئے دولت ہوگی۔“

مائیکل نے یہ نہیں پوچھا کہ موجودہ حالات میں عارضی جنت کہاں ہے؟ اسے تو صرف گیس چیمبر سے دوری مقصود تھی۔ جو نے پچو سے قطعی کچھ نہیں پوچھا۔

اسی شام کو تینوں ایک جہاز پر سوار ہو کر ایک ایسی منزل کی طرف چل پڑے، جس کا علم صرف پچو کو تھا لیکن پچو لو وجو راہ میں کھو گئے اور مائیکل کو سمندر کی پرغضبناک لہروں نے ایسے مقام پر پہنچا یا جہاں ایک اور قتل اس کا منتظر تھا۔

☆......☆......☆

مائیکل کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ تشویشناک تھا کہ سردار اور گول جھونپڑی والی لڑکی میں سے کس کی پیشکش کو قبول کرے اور کس کی جان لے بھی لڑکی کی مظلومیت اسے واسطہ دیتی اور کبھی سردار کی باا ثر شخصیت ترغیب دیتی تھی۔ دونوں باتوں کے درمیان اپنے تحفظ کا سوال تھا کہ کس کا ساتھ دینے سے کس کی بات ماننے سے تحفظ مل سکتا ہے۔

جوں جوں شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے اس کا ذہنی خلفشار بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ صبح کی ملاقات میں گول جھونپڑی والی نے کہا تھا کہ وہ رات کو اسے خنجر دے گی۔ ایک خیال اسے یہ بھی آ رہا تھا کہ وہ لڑکی سے خنجر لے کر رکھ لے اور پھر اس کا گلا گھونٹ دے۔ یہ خنجر جس کا سردار کو علم نہیں ہوگا بوقت ضرورت اس کے کام آئے گا۔ اسے اس لڑکی کی مظلومیت سے کیا واسطہ! وہ تو اسے کوئی فراڈ نظر آ رہی تھی کیونکہ وہ انگریزی صاف بول رہی تھی۔ کیا وہ سردار اور دوسرے لوگوں سے بھی تو فراڈ نہیں کھیل رہی تھی۔ جس کا سردار کو علم ہو گیا تھا اور وہ اسے ختم کرنے پر تلا تھا!

اس رات لڑکی اس کے پاس آئی اور خنجر اسے دیا تو اس نے پوچھا کہ کیا اسے یقین ہے کہ سردار یا کسی اور نے اسے یہاں آتے نہیں دیکھا ہے۔

"سردار کی طرف سے رات کے اس حصے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ نشہ آور مشروب استعمال کرنے کا عادی ہے۔ اور اس وقت اسے اپنا ہوش نہیں رہتا ہے۔" لڑکی نے انکشاف کیا تو مائیکل کو تاسف ہوا کہ وہ خواہ مخواہ ڈر رہا کہ کہیں سردار اسے لڑکی کے ساتھ پکڑ نہ لے۔

"یہ دوسرے لوگ!" لڑکی کہہ رہی تھی۔ "تو انہیں میری پروا نہیں ہے۔"

"وہ جو موٹے تازے آدمی اس کے ساتھ رہتے ہیں ان کا چکر کیا ہے!" مائیکل کا اشارہ سردار کے دونوں بڑے مشیروں کی طرف تھا۔

"اس نے انہیں اور سب لوگوں کو الو بنا رکھا ہے۔" لڑکی نے بتایا۔ "وہ بے حد چالاک اور مکار ہے۔ جزیرے بھر میں کوئی اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ سب اس سے ڈرتے ہیں اور اس کے وفادار بھی ہیں۔"

"تو اس صورت میں کیا میرا مشن ناکام نہیں ہو جائے گا۔" مائیکل نے لرزدہ سے کہا۔ "سردار کی ہلاکت کی خبر سنتے ہی سب کے سب شکاری کتوں کی طرح میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"میں نے ساری چیزیں پہلے ہی سوچ رکھی ہیں!" لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تمہیں گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے!"

اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی مائیکل کو اچانک اپنے قریب ایک لڑکی کی موجودگی کا احساس ہوا، اور اس کے الفاظ بھی ذہن میں دوڑ گئے کہ اس وقت سردار کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کا سونا اور مرنا برابر ہے۔ اس نے سردار سے لڑکی کو نہ چھونے کا جو وعدہ کیا تھا وہ وعدہ اس گھڑی نشے میں بے سدھ تھا۔ لڑکی کا خنجر اس کے قبضے میں آ کر اب اسے نہتا کر چکا تھا۔ وہ اپنا تحفظ کرنے سے قاصر تھی۔ اس لڑکی کی طرف پیش قدمی کو اب کون سی طاقت روک سکتی تھی۔ اس کے اور لڑکی کے درمیان اب رکاوٹ کی کونسی دیوار حائل رہ گئی تھی وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ لڑکی ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کی گود میں گر گئی۔ اس نے مائیکل کے جسم کے مطالبے کے بغیر اپنا جسم اس کے سپرد کر دیا۔

وہ اس شکاری کی طرح مسرت آمیز حیرت میں ڈوبا ہوا تھا جو درخت پر بیٹھے ہوئے چوکنا اور چالاک پرندے کا نشانہ باندھ رہا ہو کہ وہ پرندہ خود اس کے قدموں میں آ گرے، کیف و مستی کے لمحات گزر گئے تو

لڑکی نے نیم خوابیدہ اور شکست خوردہ آواز میں کہا۔ ’’اجنبی میں تمہیں دوست کہوں یا دشمن تم نے ایک پاک وصاف بدن میں غلاظت بھردی ہے۔ معطر...... پانی میں بدبودار سفوف گھول دیا ہے۔ صاف شفاف قالین پر کبھی نہ مٹنے والے دھبے ڈال دیئے ہیں اور یہ سب تم نے نادانستہ نہیں کیا ہے اور تم سے کرایا بھی دانستہ گیا ہے۔ تم قصور وار نہیں ہو، تمہیں اپنے جسم کی تسکین کی صورت میں معاوضہ مل گیا ہے۔ آئندہ بھی ملتا رہے گا، مالی معاوضہ الگ ہے اور اتنا بہت ہے کہ تم اس سے دنیا کی ہر آسائش خرید سکو گے۔ اب تمہیں سردار کو ٹھکانے لگانے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔‘‘

’’نہیں ہوگا۔‘‘ مائیکل نے اس کی باتوں سے متاثر ہوکر بے ساختہ کہا اور اسے پھر اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔

’’اب میں چلتی ہوں!‘‘ لڑکی بولی۔ ’’اور اپنی جھونپڑی میں خوشخبری سننے کی منتظر رہوں گی۔‘‘ اس نے اٹھتے اٹھتے مائیکل کے گال کا ایک زبردست بوسہ لیا اور سائے کی طرح جھونپڑی سے نکل گئی اور اسے سوچ کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا چھوڑ گئی۔

وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک سردار کی شخصیت پوری طرح بے نقاب نہیں ہوجاتی ہے، وہ اس زندگی سے رشتہ نہیں توڑے گا۔ جہاں تک لڑکی کی بات تھی سو اس کی اصلیت بھی ظاہر ہوکر رہے گی کہ اس کا یہ روپ کس روپ کی پردہ پوشی کر رہا ہے۔ اس نے تہیہ کیا کہ سردار کی جھونپڑی میں جاکر اس کے مخصوص سامان کی تلاشی لے گا۔ اور یہ کام اسے مشکل نظر نہ آیا۔ اس نے دن کے وقت بستی کو مردوں سے خالی دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ آسانی سے سردار کی جھونپڑی میں جاسکتا تھا۔

وہ اگلے روز جھونپڑی سے نکلا تو راستے میں بچوں کی شور مچاتی فوج نے اس کا حسب معمول والہانہ استقبال کیا اور عورتوں کی منہ پھاڑ ہنسی نے بھی سواگت کیا۔ وہ ایک جگہ وہ رکا بھی تاکہ اپنے بے مقصد گھومنے کا جواز پیدا کرسکے۔ ایک جگہ بچوں کے دائرے میں بے ہنگم ناچ دکھاتا اور ٹھمکے پن سے انہیں ہنساتا رہا۔ اور دوسری جگہ عورتوں کے جھرمٹ میں مضحکہ خیز شکلیں بنا کر انہیں گدگداتا اور خود کو گرماتا رہا۔

بالآخر وہ سردار کی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ پچھلے حصے میں گیا جہاں گڑھے کو چٹائی سے ڈھک کر اس پر صندوق رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے زور لگا کر صندوق کو اٹھایا پھر چٹائی ہٹا کر ایک طرف رکھی اور پتھر کی سل ہٹائی۔ اس کے بعد گھٹنوں کے بل جھک کر گڑھے میں دیکھنے لگا۔ پوٹلی اور اس کے اندر کی چیزیں وہ دیکھ ہی چکا تھا۔ اسے ہٹایا تو ایک کونے میں سبز پلاسٹک کی جلد کی ایک ڈائری نظر آئی۔

غیرارادی طور پر اس کے منہ سے سیٹی نکل گئی اور اس نے جلدی سے ڈائری اٹھا کر بڑی پھرتی سے گڑھے کو بند کرکے اس پر صندوق جمادیا اور ڈائری کو پتوں کے زیر جامہ میں چھپا کر جھونپڑی سے نکل آیا۔ واپسی کے لئے اس نے جھونپڑی کی پشت کا راستہ منتخب کیا اور اپنی جھونپڑی میں آنے کے بجائے جھیل کے کنارے کنارے بائیں ہاتھ پر چلا گیا۔ جب خاصا دور نکل گیا تو کھجوروں کے ایک جھنڈ میں گھس کر بیٹھ گیا اور ڈائری کھولی۔ ڈائری کیا کھلی گویا انکشافات کے باب کھلتے گئے۔

سردار کا نام ایڈمنڈ تھا۔ وہ میکسیکو کے مضافات کا رہنے والا تھا۔ اس کا آبائی پیشہ ماہیگیری کاری تھا اس نے جوانی ہی میں رہزنی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ مسلح ڈاکے ڈالتا رہا کئی قتل کئے، ایک زمیندار کی نازو نعم میں پلی خوش جمال لڑکی کو اغوا کیا اور اسے اپنی داشتہ بنا کر رکھا۔ اس کا مکسن پہاڑ کے کھوہ اور کھنڈرات تھے۔ پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں تھی لیکن وہ ہاتھ نہ آتا تھا۔ زمیندار کی لڑکی کو اس نے قیدی بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے بطن سے مارگریٹ پیدا ہوئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ایڈمنڈ کے کس بل جواب دیتے جارہے تھے۔ اس نے رہزنی کم کردی اور جنگلی قبائل خصوصاً ریڈ انڈین لوگوں کو اسلحہ اور اجناس اور

سونے کی اسمگل کرنے لگا۔ اس کا یہ کاروبار خوب چمکا اور وہ ان لوگوں سے خوب گھل مل گیا۔ مارگریٹ دس برس کی تھی کہ اس نے اپنی بیوی کا ایک ریڈ انڈین سے سودا کیا تو اس کی بیوی نے احتجاجاً خودکشی کرلی۔

مارگریٹ ذہنی طور پر اپنی عمر سے بہت آگے تھی۔ سب دیکھتی اور سمجھتی تھی۔ اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت اور حقارت کا چشمہ ابل رہا تھا۔ اس کی دنیا پہاڑوں کے کھوہ اور کھنڈرات تک محدود تھی اور وہاں سے نکلنے کے سارے راستے مسدود تھے۔

پھر ایک روز پولیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ ایڈمنڈ مارگریٹ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر مختصر سے سامان کے ساتھ خچر پر بیٹھ کر بھاگ نکلا۔ وہ مسلسل تین راتوں تک سفر کرتا رہا۔ دن میں کہیں چھپ جاتا۔

چوتھے روز وہ ایک ساحلی علاقے میں پہنچا اس نے ایک بوری خریدی اور مارگریٹ کو ایک نشہ آور مشروب پلا کر اس کے منہ پر کپڑا باندھ کر بوری میں بند کردیا۔

پھر ایک مال بردار جہاز کے کپتان کو بھاری رشوت دے کر جہاز پر سوار ہوگیا۔

سات روز تک وہ جہاز پر رہا۔ رات کی تاریکی میں وہ مارگریٹ کو کھلاتا پلاتا اور پھر اس کا منہ باندھ کر بوری میں بند کردیتا۔ آٹھویں رات کو اسے جزیرہ نظر آیا اور اس نے اپنی سکونت کے لئے منتخب کیا۔ وہ گمنام دنیاؤں کے سارے خطرات سے آگاہ تھا اور اس سے نمٹنے کے لئے تدبیریں بھی اس کے ذہن میں تھیں۔

جزیرے پر اتر کر اس نے سب سے پہلے تاروں کی جھلملاہٹ میں نرم ریتلی زمین پر گڑھا کھودنا شروع کیا اور صبح کاذب تک ایک گہرا گڑھا کھود ڈالا۔ پھر اس نے مارگریٹ کے سارے کپڑے اتار دیئے اور اسے برہنہ بوری میں بند کرکے بوری گڑھے میں رکھ دی اور اس نے لکڑی کے صندوق کا جس میں وہ چند جوڑے کپڑے، سونا، ہیرے، جواہرات اور ہلکا اسلحہ لایا تھا..... اس نے اپنے اور مارگریٹ کے سارے کپڑے سمندر میں بہا دیئے اور مادر زاد ننگا ہوگیا۔ صندوق کے چندے کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور انہیں صندوق میں ڈال دیا اور صندوق کو گڑھے پر رکھ کر ریت برابر کردی۔

سپیدہ صبح نمودار ہوا تو اس نے اپنے سارے جسم پر ساحل کی گاڑھی کیچڑ ملی اور صرف سینے کے حصے کو صاف رکھا۔ جب کیچڑ خشک ہوگیا تو اس نے مٹھیاں بھر بھر کر خشک ریت جسم پر بکھیری۔ جس سے اس کے جسم کی رنگت بڑی عجیب سی ہوگئی اور وہ اسی حلیے میں چل پڑا۔

توقع کے عین مطابق درختوں کے جھنڈوں کے قریب اس کا سامنا مقامی لوگوں سے ہوگیا۔ وہ سفید فام تھا نہ سیاہ فام ان لوگوں نے ستر پوشی کر رکھی تھی اور وہ الف ننگا تھا اور چھوٹے سے جیبی پستول سے ہوائی فائر کرتا تھا اور ہاتھ پشت پر کرکے پستول چھپا لیتا تھا۔ وہ اس عجیب وغریب شخص کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس نے ریڈ انڈین لوگوں اور میکسیکو کے جنگلی قبائلیوں سے جو زبان سیکھی تھی، اس کے جملے ادا کرکے انہیں اور بھی ششدر کردیا۔ کیونکہ ان جملوں کا ایک آدھ لفظ ان کی بولی سے ملتا جلتا تھا۔ وہ اسے پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے چلے تو وہ راستے میں رک رک کر بازی گروں کی طرح قلابازی کھاتا اور پھرتی سے ہوائی فائر کرتا تو سارے لوگ سراسیمہ نظر آتے۔

سردار نے بھی اس منظر کو اچنبھے سے دیکھا اور اس کے سامنے جانے سے پہلے اس نے سب کی نظر بچا کر پستول کو ایک جھاڑی میں اچھال دیا۔

سردار کے سامنے بھی اس نے بڑی گمبھیر اور ڈراؤنی آواز میں جنگلیوں کی زبان کے جملے ادا کئے جن کے کچھ الفاظ اس کے ساتھیوں کے پلے پڑ گئے۔ اس نے اشاروں سے بتایا کہ ''وہ آسمان سے اترا ہے۔''

اور پھر اشاروں سے ہی انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ ورطہ حیرت میں ڈوبے اس کے پیچھے چل پڑے اور وہ انہیں اپنے صندوق کے پاس لے آیا۔ اس نے صندوق کا ڈھکن اٹھا کر سردار اور ساتھیوں کو اندر کا حصہ دکھایا اور پھر بلند آواز سے انٹ شنٹ بکنے لگا۔ کچھ دیر

بعد اس نے جھک کر صندوق کی چیزیں ادھر ادھر کیں اور ہاتھ بڑھا کر اس کے نچلے حصے میں رکھی ہوئی بوری کا منہ کھولا۔ مارگریٹ کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا ہٹایا اسے بالوں سے پکڑ کر صندوق سے باہر کھینچ نکالا۔

سردار اور دوسرے لوگوں کے منہ سے حیرت کے مارے چیخیں نکل گئیں۔ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ صندوق میں کوئی انسان نہیں تھا اور اب ان کے سامنے سفید چمکتی جلد کا حسین و جمیل نور کے پیکر میں ڈھلا انسانی وجود تھا اس کے شانوں پر لہراتے ہوئے سنہرے بال سونے کی تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ سینے کا چھوٹا سا مخروطی ابھار مقناطیسی طاقت سے اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور......

وہ یقیناً اس روئے زمین کا باشندہ نہ تھا۔ اگر آسمان سے نہیں اترا تھا تو زمین پر پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ سفید فام بھی نہ تھا۔ جس کے وہ جانی دشمن تھے۔ اس کے ساتھ خوف سے لرزاں یہ نسوانی پیکر دیوتاؤں کی طرف سے سوغات تھا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کی جان لینے کے ارادے ختم کردیئے گئے۔ اس نے اشارے میں سب لوگوں کو چلے جانے کو کہا اور وہ سب اس سے مرعوب ہوگئے۔ ان کے دور جاتے ہی اس نے مارگریٹ سے کہا "اگر اس نے زبان کھولی یا شور مچایا تو اسے جیتے جی سمندر کے حوالے کردیا جائے گا۔

جانے ہی جیسے ہی حالات درست ہوجائیں گے اور مہذب دنیا اس کے جرائم کو بھول جائے گی تو وہ اپنی دنیا میں واپس چلے جائیں گے۔" اس نے مارگریٹ کو یہ کہہ کر بھی ڈرا دیا کہ "اگر ان کا بھید کھل گیا اور جزیرے والوں کو معلوم ہوگیا کہ وہ اور مارگریٹ سفید فام انسان ہیں تو وہ انہیں زندہ جلادیں گے۔ یا کچا ہی کھاجائیں گے۔"

مارگریٹ اس مقصد سے لرز گئی۔ اسے اپنی زندگی عزیز تھی خواہ وہ کسی ماحول اور حلیے میں ہو۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے بلا چوں وچرا باپ کی بات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

ایڈمنڈ نے جلدی جلدی صندوق کا چپہ اس کے ٹکڑے جوڑ کر ٹھیک کیا اور اسے اٹھا کر بستی میں لے گیا۔

مارگریٹ اس ماحول میں رہ کر اور اس سے الگ تھلگ جوان ہوتی گئی۔ اس دوران میں اس نے مقامی زبان بھی سیکھ لی اور رسم و رواج بھی۔ اور اسی دوران میں جزیرے کا سردار ایک روز اچانک مرگیا۔ ایڈمنڈ نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ سردار کی موت کے بعد جزیرے کے لوگوں نے اسے اپنا سردار تسلیم کرلیا۔

مارگریٹ اب بھرپور جوان تھی۔ جزیرے کی عورتیں اسے پوجنے کی حد تک عقیدت رکھتی تھیں۔ بچے اس کے جنون کی حد تک گرویدہ تھے لیکن مرد اسے کوئی آسمانی مخلوق سمجھتے تھے لیکن ایڈمنڈ نے کمال ہوشیاری سے اس کے اور ان لوگوں کے درمیان حد فاصل قائم کر رکھی تھی۔

وہ مارگریٹ کو کسی سے گھلنے ملنے کا موقع نہ دیتا تھا اور اب وہ بھی اس کے منہ آنے لگی تھی۔ اسے کوئی اور برا بھلا کہتی تھی۔ اپنی ماں کا قاتل بتاتی اور اسے انجام کی دھمکیاں دیتی تھی۔

ایڈمنڈ نے اپنی سرداری اور بالادستی قائم رکھنے کے لئے اپنے تحفظ کے لئے اسے اپنے راستے سے ہٹانا ضروری سمجھا تھا۔ مارگریٹ اس کا اپنا خون تھی لیکن یہ خون اس کے وجود کو بہا دینا چاہتا تھا اور کیسے ممکن تھا کہ وہ اس بہاؤ کو نہ روکتا۔

ڈائری پڑھ کر مائیکل نے ایک طویل گہری سانس لی۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ روشن تھا۔ تذبذب اور ہچکچاہٹ کی گنجائش نہ تھی۔ اسے ایڈمنڈ یا مارگریٹ میں سے ایک کو ختم کرنے کا فیصلہ کرنا تھا اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ایڈمنڈ کا قصہ پاک کردے گا اور مارگریٹ کو اپنے ساتھ لے جاکر مہذب دنیا کو رہزن اور قاتل ایڈمنڈ کے انجام سے آگاہ کرے گا۔ اس کے دل میں مارگریٹ کے لئے انسیت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ واقعی مظلوم تھی اس نے دکھ سہے تھے۔ اگر شہری زندگی گزارتی تو ایک باعزت مقام حاصل کرتی لیکن وہ

دس سال کی عمر سے انسان نما جانوروں میں پل رہی تھی۔ اب ایک مہذب، تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل معاشرہ اس جاہل اور نیم پختہ شعور کی مالک لڑکی کو کیسے قبول کرے گا؟ حالانکہ اس غیر مہذب ماحول نے اسے معصومیت اور پاکیزگی کی وہ دولت عطا کر رکھی تھی جس سے مہذب دنیا کی بیشتر دوشیزائیں محروم تھیں اسے مردوں کے ہاتھوں نے تو کجا میلی نظروں تک نے نہیں چھوا ہے وہ پہلا انسان ہے جس نے اس کی دوشیزگی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس لئے وہ اسے اپنالے گا۔ یورپ کے کسی حصے کسی شہر میں اسے اپنی شریک حیات کی حیثیت سے لے جائے گا۔

وہ سارا دن اس نے بڑے اضطراب سے گزارا۔ اس سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ شام کو سردار اس سے ملنے آیا تو اس نے سر میں شدید درد کا بہانہ کیا۔ سردار اسے پھر بزور نصیحت کر گیا۔ مغرب تک وہ جھیل کے کنارے بیٹھا تھا۔ اپنے منصوبے کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔

شام رات کے طرف بڑھنے لگی تو وہ جھونپڑی میں آ گیا۔ اسے مارگریٹ کا انتظار تھا وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ حقیقت اس پر آشکار ہو چکی ہے اور اس نے مستقبل کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے۔ اس نے شام کا کھانا بھی نہ کھایا اور کھانا لانے والی پرکشش جسم کی عورت کی سپردگی کے لئے آمادگی پر بھی توجہ نہ دی۔ پھر رات آ ہی گئی اور اس کی سیاہ چادر میں لپٹی مارگریٹ بھی.....!

"مارگریٹ" اس نے اندھیرے میں سرگوشی کی تو اس کی آنکھیں مارگریٹ کے چہرے کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھیں مارگریٹ چپ تھی۔ "میرے ہاتھ تمہارے باپ کی..... ڈائری..... ڈاکو، اسمگلر اور قاتل کی..... تمہاری ماں کے قاتل کی ڈائری آ گئی ہے اور اب یہ راز میرے لئے راز نہ رہا ہے۔ تم میرے ساتھ میری بیوی بن کر چلنے کو تیار ہو۔ اگر میری بن کر نہ رہنا ہے تب بھی میں تمہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں آج ہی ایڈمنڈ کا..... تمہارے باپ کا قصہ پاک کر دوں گا۔ تم جھونپڑی میں میرا انتظار کرنا۔ فرار ہونے کا سارا انتظام تو مکمل ہے ناں۔"

"ہاں۔" مارگریٹ کی آواز جیسے کسی کنوئیں سے آئی۔

"تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہو گی؟"

"پچھلے پہر یہ کام کرو گے ناں!"

"ہاں ہونا تو اسی وقت چاہئے۔" مائیکل نے جواب دیا۔ مارگریٹ نے اسے پپی کی دوسری قسط دینا چاہی لیکن وہ ایک غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ایک ایسے راستے سے اس کی جھونپڑی تک لے جاؤں گی جدھر سے کوئی تمہیں دیکھ نہ سکے گا۔ ہم اس کی جھونپڑی کی پشت پر نکلیں گے۔ تم خنجر سے اس میں شگاف ڈالنا، بنانا اور اندر چلے جانا۔"

تجویز معقول تھی، مائیکل اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اسے جھیل کی سمت لے گئی اور دونوں بائیں ہاتھ پر جھیل کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ کوئی پچاس گز جا کر مارگریٹ نے کہا کہ وہ ہتھیلیوں اور گھٹنوں کے بل جھک جائے اور دونوں اس حالت میں چوپایوں کی طرح درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے۔ مائیکل کی ہتھیلیوں اور گھٹنوں میں سنگریزے چبھ رہے تھے اور اسے تکلیف بھی ہو رہی تھی لیکن مارگریٹ بلی کی طرح اطمینان سے دبکی دبکی چلی جا رہی تھی۔ سردار کی جھونپڑی کے قریب جا کر وہ رک گئے اور اس کے کان میں..... "انتظار کروں گی؟" کہہ کر مارگریٹ اس کے گال کا بوسہ لے کر لوٹ گئی۔

مائیکل جھونپڑی کی پشت پر گیا اور اس نے خنجر سے اسے کاٹنے کی کوشش کی تینوں جگہوں کے بعد چوتھی جگہ نرم مل گئی اور آسانی سے کٹ بھی گئی۔

اتنا بڑا شگاف ہو گیا تھا کہ وہ آسانی سے اندر داخل ہو سکے۔ وہ سانس روک کے جھونپڑی کے پچھلے حصے میں اور پھر سامنے کے حصے میں گیا جہاں ایڈمنڈ گینڈے کی طرح پڑا سو رہا تھا۔ وہ دم سادھے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر دبے پاؤں آگے بڑھا۔ آہستہ سے

گھٹنوں کے بل جھکا اور بایاں ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر رکھ کر خنجر اس کے نرخرے پر پوری قوت سے تین چار بار یوں پھیرا جیسے کسی موٹے سانڈ کو ذبح کر رہا ہو۔ گرم گرم گاڑھے گاڑھے خون سے اس کا ہاتھ کلائی تک لتھڑ گیا اور وہ ایڈمنڈ کے جسم کو تڑپتا چھوڑ کر جھونپڑی کے پچھلے حصے میں گیا۔ جلدی سے اس کا ہاتھ گڑھے تک پہنچا اور اس نے ٹٹول ٹٹول کر کپڑوں کا جوڑا اور دو بین ریوالور اور صندوقچی نکالی۔ پھر سب کو کپڑے میں لپیٹ کر گٹھری سی بنائی اور شگاف کے راستے باہر نکل گیا۔

پہلے کی طرح چوپایہ بن کر جھیل کے کنارے پہنچا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ٹھوکریں کھاتا سنبھلتا کنارے کنارے چلنے لگا۔ جب کافی دور آ گیا تو اس نے گٹھری ایک جھاڑی میں رکھی اور جھیل میں اتر گیا۔ خوب مل مل کے اس نے ہاتھوں اور جسموں سے خون کے چھینٹے صاف کئے اور جھاڑی سے گٹھری اٹھا کر چلا تو سوچا آیا کہ خنجر وہ جھونپڑی ہی میں بھول آیا ہے۔ ایک ثانیے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے لوٹنا نہیں ہے، اور وہ مارگریٹ کی جھونپڑی پر پہنچ گیا۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھل گیا۔

''مارگریٹ وہ ختم ہو گیا ہے! میں نے اسے مار ڈالا۔'' اس نے گٹھری زمین پر رکھ کر پھولی ہوئی سانس سے کہا تو مارگریٹ اس سے لپٹ گئی۔ اس نے مائیکل کے چہرے سینے اور بانہوں پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''مارگریٹ۔'' اس نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

''میں اس کی خفیہ چیزیں بھی لے آیا ہوں۔ اس میں سب سے زیادہ فوری طور پر کارآمد چیز ریوالور ہے۔ اب جو سامنے آئے گا میں اسے گولی مار دوں گا۔ ہم بڑی حفاظت کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوں گے۔ اب جاؤ تم نے کیا انتظام کر رکھا ہے؟ کوئی کشتی ہے جس سے سمندر میں جا سکیں یا خشکی کا کوئی راستہ ہے۔''

''صبر سے کام لو میرے نجات دہندہ میرے جیون ساتھی تھوڑا صبر کرو تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ سب کچھ تم گٹھری یہیں چھوڑ دو اور اپنی جھونپڑی میں جاؤ، میں وہیں آتی ہوں۔'' مارگریٹ کی آواز مسرت سے کانپ رہی تھی۔ مائیکل فوراً وہاں سے چل دیا۔

اپنی جھونپڑی میں آ کر وہ بڑی بے صبری سے مارگریٹ کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے کان پچھلے دروازے پر لگے تھے لیکن سامنے کے دروازے پر آہٹ سن کر اس نے چونک کر دیکھا تو مارگریٹ پہلی بار اس دروازے سے داخل ہو رہی تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ اب مارگریٹ کا حوصلہ بڑھ گیا ہے اب اسے کسی کا ڈر نہیں ہے اس لئے سینہ تان کر سامنے کے دروازے سے آئی ہے۔ مائیکل سے دو قدم کے فاصلے پر وہ رک گئی۔

''میرے محسن!'' اس کی سرگوشی کی لہریں مائیکل کے کانوں میں رسائیت سے اتریں۔ ''میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے اس موذی کو جہنم رسید کر دیا۔ یہی میری زندگی کا اولین مقصد تھا اور آخری مقصد یہ تھا کہ میں اس جزیرے پر حکمرانی کروں۔ اس ملعون کی جگہ میں لوں، مجھے تمہاری دنیا کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اس لئے میری نظروں میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور پھر مجھے بھی وہاں پر عورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی۔ میں یہاں کی دنیا میں پروان چڑھی ہوں۔ یہاں میرا اعتقاد کی حد تک احترام کیا جاتا ہے۔ مجھے آسمانی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ میرا باپ آدھی دنیا کا حکمران تھا۔ میری حکمرانی کو آسمانی حکومت سمجھا جائے گا۔ تمہاری دنیا میں مجھے یہ رتبہ یہ مقام کہاں ملے گا۔ میرے نجات دہندہ میں نے تمہارے احسان کا بدلہ تمہارے ہاتھوں اپنے پاک کنوارے جسم کو پامال کرا کے چکا دیا ہے تاکہ اگر میرے ہاں اولاد ہو...... تو وہ سفید فام ہو...... لیکن کوئی...... اس کا باپ کہلوانے کا دعویٰ نہ کر سکے گا۔ اس طرح ان لوگوں کے نزدیک یہ ایک معجزہ ہوگا۔'' اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے ایک عجیب آواز نکالی تو چشم زدن میں جھونپڑی آدمیوں سے بھر گئی۔

چھوٹے چھوٹے ٹکی بھالے فضا میں بلند ہوئے اور مائیکل کے جسم میں اترتے چلے گئے!

موت کا قہقہہ

آصف سراج۔لاہور

اچانک وقت نے پلٹا کھایا اور وہ کچھ ہوگیا جس کا کوئی تصور نہیں کرسکتا تھا لیکن ایسا ہونے میں اس کا اپنا عمل دخل تھا اور جب اپنا عمل ہی جان لیوا ہو تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔

احکام خداوندی کو جھٹلانے والوں کا انجام عبرت انگیز ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کا احاطہ کرتی روداد

ڈاکٹر سرفراز ملک کے نامور سرجن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں بہت شفا دی تھی، یہی وجہ تھی کہ اپنے ملک کے علاوہ بیرون ملک سے بھی لوگ ڈاکٹر سرفراز سے علاج کے لئے آتے تھے وہ بہت بڑا اور مہنگا اسپتال چلا رہے تھے۔ جس میں مشہور و معروف قابل ڈاکٹرز اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ یہ اسپتال انہوں نے بہت محنت سے بنوایا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ اسپتال ہے بلکہ یہ کوئی شاپنگ مال دکھتا تھا، باہر سے بھی نہیں بلکہ اندر سے بھی بہت زیادہ خوبصورت تھا۔

ڈاکٹر سرفراز کا کہنا تھا کہ ”مریض کو گھر جیسا ماحول ملے تو مریض جلد صحت یاب ہوتا ہے۔“

ان کے گزرے ہوئے کل کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر سرفراز کل تک جو سرفو تھا اور پھلوں

کی ریڑھی لگاتا تھا اس مقام پر پہنچنے کے لئے انہوں نے بے انتہا محنت کی تھی اور آج اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ سرخرو سے ڈاکٹر سرفراز بن گئے تھے۔

مگر محنت کی اس دوڑ میں وہ صرف ایک ہی چیز سے متاثر تھے پیسہ...... پیسہ...... اور صرف پیسہ۔

وہ جانتے تھے کہ پیسے سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے حتیٰ کہ زندگی بھی کیونکہ وہ اپنے مریضوں سے منہ مانگی رقم وصول کرتے تھے۔

اور بے چارے غریب لوگ اپنے مریض کی جان بچانے کے لئے رقم کا کیسے انتظام کرتے تھے یہ تو وہی جانتے تھے۔ مگر ڈاکٹر سرفراز کو اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ وہ کیسے اتنے پیسوں کا انتظام کرتے ہیں۔ انہیں بس پیسے سے غرض تھی۔ اور پیسے کم ہونے کی وجہ سے ہر غریب کا علاج کرنے سے منع کردیتے تھے اور ہر ایسے لوگوں سے بہت برے طریقے سے پیش آتے اور بہت سخت رویہ اختیار کرتے تھے غرض کہ پیسوں کے معاملے میں ان کا دل پتھر بنا ہوا تھا۔

ورنہ سرفراز جو اسکالرشپ لینے کے بعد اساتذہ کے سامنے غریبوں کا مفت علاج کرنے اور انسانیت کی خدمت کا وعدہ اور گھسا ہوا عزم دہرایا کرتا تھا آج ڈاکٹر سرفراز بن کر علاج کے چکر میں لوگوں کی کھال اتار لیتا ہے اسے نہ انسانیت یاد رہی اور نہ خدمت۔

اب ڈاکٹر سرفراز کو ہر مشکل کا حل اور ہر قسم کی تکلیف کا واحد علاج دولت ہی نظر آتی تھی۔

"کمال ہے سرفراز آپ سوات جارہے ہیں اور آپ کا لاڈلا بیٹا احسن اسلام آباد اسکول ٹرپ پر جارہا ہے۔ میں اکیلی کیا کروں گی۔" احسن ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور میٹرک میں تھا اور رابعہ ان کی بیگم تھیں۔

"احسن کی اور میری عمروں کا فرق شاید تم بھول گئی ہو، ویسے بھی احسن تفریح کے لئے جانا چاہتا ہے اور میں بزنس کے لئے ایک بہت امیر خاندان کا ایک آدمی سوات میں ہونے والی تباہ کاریوں کے باعث دماغی مریض بن گیا ہے۔ اپنے طور پر وہ لوگ تمام بھاگ دوڑ میں ناکامی کے بعد اب مجھ تک پہنچے ہیں۔ فیس ایڈوانس میں میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرچکے ہیں میں زیادہ سے زیادہ 3 دن میں واپس آجاؤں گا۔ دو دن اسپتال میں ڈیوٹی دینے کے بعد تیسرے دن مجھے سوات کے لئے نکلنا ہے۔" وہ بولے۔

"اور اگر وہ آپ کی فیس نہ دے پاتے تو۔" ان کی بیگم بولیں۔

"تو کیا مطلب؟ میں نے کوئی ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا مفت علاج کرنے کا اور پھر جن کے پاس رقم ہوتی ہے وہی مجھ سے رابطہ بھی کرتے ہیں ورنہ آج کل تو جس گلی محلے میں پتھر اٹھاؤ...... درجنوں ڈاکٹر نکل آتے ہیں۔" وہ بولے۔

اسی وقت موبائل کی بپ بجی...... اور ڈاکٹر سرفراز فون سننے لگے۔ "ہاں کیا اچھا ٹھیک ہے ہمت تو کریں اچھا، اچھا آتا ہوں۔"

"ایک ایمرجنسی ہے مجھے جلد اسپتال پہنچنا ہے۔" ڈاکٹر سرفراز بیوی سے یہ کہتے ہوئے نکل گئے۔

اسپتال پہنچے تو کافی لوگ جمع تھے جو کہ اسی لڑکی کے گھر والے تھے۔ جسے اس کے سسرال والوں نے تیزاب پلادیا تھا۔ لڑکی کی حالت کافی سیریس تھی اور اس کے گھر والے بے حد پریشان اور مایوس تھے۔ ڈاکٹر سرفراز کو دیکھتے ہی ان سب کے چہروں پر امید کی ایک کرن نظر آئی اور لڑکی کا باپ اور بھائی جلدی سے ڈاکٹر کے پاس آگئے اور منتیں کرنے لگے۔ "ہماری بچی کو بچالو۔" ڈاکٹر سرفراز انہیں تسلی دے کر آپریشن تھیٹر میں چلے گئے اور ایک جان لیوا آپریشن کے بعد لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے یہ رسکی کام پہلے بھی کئی مرتبہ کیا تھا۔ لڑکی کی حالت کافی سیریس تھی اور جب انہوں نے اسے اچھی طرح سے چیک کیا تو پتہ چلا کہ تیزاب نے لڑکی کے جسم کے اندر موجود اعضاء کو بے حد متاثر کیا ہے انہوں نے دیکھا کہ لڑکی کے اکثر اعضاء جلنے سے متاثر ہوگئے ہیں اور لڑکی بے

حد تکلیف میں ہے۔ انہوں نے لڑکی کا آپریشن کرکے نالیوں کی جگہ پلاسٹک کی نالیاں ڈال دیں اور قدرتی نالیوں اور قدرتی سسٹم کی بجائے پلاسٹک کی نالیوں سے لڑکی کی زندگی کو برقرار رکھا گیا۔

لڑکی کے گھر والے ڈاکٹر سرفراز کے بے حد مشکور تھے کہ انہوں نے ان کی بچی کی زندگی بچالی تھی۔

ڈاکٹر سرفراز لڑکی کے گھر والوں کو ہدایت دے رہے تھے کہ لڑکی کا خاص خیال رکھا جائے اور یہ کہ لڑکی ابھی دو تین دن تک آئی سی یو میں ہی رہے گی اور ہاں وہ کھانے میں صرف لیکوئڈ والی چیزیں ہی استعمال کر سکتی ہے وہ بھی منہ کے ذریعے نہیں بلکہ اس کی خوراک کی نالی کے ذریعے جو اسے لگائی گئی تھی اور یہ کہ اللہ نے اتنے نظام بنائے ہیں اس میں سے ایک نظام انسانی جسم کا یہ بھی ہے کہ جلنے کی وجہ سے جو اعضا جسم کے متاثر ہوئے ہیں وہ قدرتی طور پر آہستہ آہستہ خودبخود ٹھیک ہوجائیں گے چاہے اس میں چھ ماہ لگے یا سال۔

بہر حال جب ایسا ہوگا تو پھر لڑکی کا آپریشن کرکے موجود پلاسٹک سسٹم کو باہر نکال لیا جائے گا جو انہوں نے اس کی زندگی کے بچاؤ کے لئے جسم میں فٹ کیا تھا۔

لڑکی کے گھر والے بہت خوش تھے لڑکی ابھی تکلیف میں تھی مگر وہ جانتے تھے کہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔

ڈاکٹر سرفراز دو گھنٹے سے اپنے کیبن میں تھے کہ فریش ہوجائیں اتنے میں ایک اور ایمرجنسی آگئی ڈاکٹر جلدی سے اٹھ کر باہر آگئے۔

مگر یہ کیا ڈاکٹر سرفراز کو وہ لوگ حلیہ سے کافی غریب نظر آئے تو ان کے قدم سست پڑ گئے۔ ذمہ داروں سے پتہ چلا کہ ان کی بہو چھت پر کپڑے پھیلانے گئی تھی مگر چھت کے کنارے کی طرف جاتے ہوئے منڈیر پر سے پھسل کر نیچے جا گری اور سر پر چوٹ آنے سے کافی سیریس حالت میں تھی کیونکہ خون کافی تعداد میں بہہ چکا تھا۔

لیکچر

پروفیسر صاحب کلاس میں لیکچر دے رہے تھے۔ سامنے کی ڈیسک پر بیٹھا ہوا لڑکا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر صاحب نے انگلی کے اشارے سے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ تم میرا لیکچر غور سے نہیں سن رہے۔ طالب علم نے کہا بالکل درست ہے جناب اگر میں بھی آپ کا لیکچر غور سے سنتا تو ان سب کی طرح سو گیا ہوتا۔

(محمد عبداللہ۔ سبزونکال)

مگر ڈاکٹر صاحب کی فیس کے بارے میں جانتے ہی وہ لوگ گڑگڑانے لگے ہاتھ جوڑنے لگے کہ ان کی بہو کا علاج کریں ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہے مگر ڈاکٹر سرفراز انہیں ڈانٹنے لگے۔ ”یہاں مفت علاج نہیں ہوتا ہے ڈاکٹری ڈگریاں میں نے مفت میں نہیں لیں۔ ہمارا اسپتال بہت مہنگا ترین اسپتال ہے۔ میں نے رعایتی اور مفت علاج کرنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔“

وہ لوگ روتے گڑگڑاتے ہوئے واپس چلے گئے۔

دو دن کے بعد ڈاکٹر سرفراز سوات چلے گئے اور ان کا بیٹا احسن ٹرپ پر چلا گیا۔ واپسی پر ڈاکٹر سرفراز نے اپنی بیگم رابعہ سے احسن کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ دو دن مزید اسلام آباد میں رہے گا۔ احسن کا دوست منیب ہے نا اس کے انکل کا گھر ہے اسلام آباد میں وہ ان کے گھر پر ہے۔

تین دن گزرنے پر بھی احسن گھر واپس نہیں آیا۔ انہوں نے فون کیا تو احسن نے کہا کہ وہ راستے میں ہے آرہا ہے اور شام تک ان کے پاس ہوگا۔

ڈاکٹر سرفراز بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ گھر سے اسپتال کے لئے نکلے...... اسپتال پہنچ کر انہوں نے اپنے موڈ کو نارمل کیا اور بظاہر اپنے آپ کو فریش

ظاہر کیا یوں وہ اسپتال کا راؤنڈ کیا مریضوں کو چیک کیا ایک وارڈ جس میں تنہائی اور راہ بنے کیبن میں آکر آنکھوں کو موند کر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک آدمی بوکھلاتا ہوا آیا۔ "ڈاکٹر صاحب...... ڈاکٹر صاحب جلدی کریں بہت بڑا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ...... وہ...... لڑکا بہت بری حالت میں ہے اسے بچالیں۔ پلیز اسے بچالیں۔"

رہاں...... ڈاکٹر سرفراز جلدی سے اٹھے اور باہر کی طرف بھاگے۔ اسٹریچر پر ایک نوجوان لڑکا بہت زخمی حالت میں موجود تھا۔ ڈاکٹر سرفراز نے صرف ایک نظر اسے دیکھا...... لڑکے کا چہرہ دوسری طرف ہونے کی وجہ سے وہ لڑکے کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ اتنے میں جونیئر ڈاکٹر ندیم احمد آگئے اور کہنے لگے سر ان لوگوں نے جمع تو کر دی ہے مگر پچاس ہزار روپے کم ہیں ان کا کہنا ہے کہ آپ ٹریٹمنٹ کریں ہم پیسے آپ کو دے دیں گے۔"

ڈاکٹر سرفراز یہ سنتے ہی غصے میں آگئے۔ "کیا آپ لوگ پاگل ہوگئے ہیں یہ کوئی فقیروں کا ڈیرہ ہے یا ہم نے ہر ایرے غیرے اور کنگلوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔" ڈاکٹر سرفراز غصے میں بولتے چلے گئے۔

اتنے میں ایک بھری جیب سوٹ میں ملبوس شخص آگے آیا اور ڈاکٹر سرفراز سے کہنے لگا "ہمارا ملازم گھر گیا ہے پیسے لانے۔ آپ ٹریٹمنٹ شروع کریں ہم آپ کی پوری جمع کر دیں گے۔"

مگر ڈاکٹر سرفراز کہنے لگے "نہیں پہلے مجھے میری پوری فیس چاہئے۔"

وہ صاحب کہتے رہے کہ "آپ لڑکے کو چیک تو کرلیں۔"

مگر ڈاکٹر سرفراز اپنی ضد پر اڑے رہے اور شوت ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈی پکڑے قہقہہ لگاتی رہی۔ کافی دیر گزرنے کے بعد جب ان صاحب کا ملازم رقم لے کر آیا تو ڈاکٹر سرفراز لڑکے کے ٹریٹمنٹ کے لئے آگے بڑھے اور جیسے ہی انہوں نے اس لڑکے کا چہرہ دیکھا۔ تو ڈاکٹر سرفراز کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی وہ لڑکا کوئی اور نہیں بلکہ ان کا اپنا بیٹا احسن تھا۔

وہ دیوانہ وار آگے بڑھے اور احسن کی نبض ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگے مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ احسن اس دنیا سے جا چکا تھا۔ ان کا لاڈلا اکلوتا بیٹا وہ سکتے میں آگئے۔

"ڈاکٹر سرفراز...... ڈاکٹر سرفراز یہ تو مر چکا ہے۔" اتنے میں وہی بھری جیب میں ملبوس شخص آیا اور کہنے لگا "یہ نہیں کیا انسانیت ہے ایک ٹرک والا اس لڑکے کو ٹکر مار کر چلا گیا یہ وہاں سڑک پر پڑا تڑپ رہا تھا کہ ہم اسے یہاں لے آئے خیر پتہ نہیں اس کے ماں باپ کون ہیں...؟"

ڈاکٹر سرفراز بلک بلک کر رو پڑے وہ کیسے ڈاکٹر تھے جو کہ اپنے بیٹے کا علاج ہی نہ کر سکے وہ دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔

اس حادثے کے بعد سے ڈاکٹر سرفراز اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے وہ ہر وقت یہی کہتے رہتے کہ "پہلے اپنی پوری فیس لوں گا پھر علاج کروں گا ایک لاکھ روپے پورے ایک لاکھ روپے میری فیس ہے۔"

پھر ان کو ہر جگہ اپنا بیٹا احسن دکھائی دینے لگا جو کہتا تھا "ابوجان یہ لیں آپ کی اپنی فیس" وہ خود ہنسنے لگتے اور خود بخود ہی رونے لگتے۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکے تھے۔

مگر آج تک یہ معمہ حل نہ ہو سکا کہ وہ اکیلے میں کس سے باتیں کرتے تھے احسن...... احسن...... پکارتے ہوئے ایک طرف دوڑ لگا دیتے۔

اور زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ان کی ایسی حالت میں بھی ان کے پاس ہر وقت ایک کثیر رقم رہتی تھی جتنی کبھی اس زمانے میں ان کی فیس ہوتی تھی جب وہ ڈاکٹر تھے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ان کا بیٹا احسن انہیں یہ رقم دیتا ہے اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کیا راز ہے۔

روحوں کا زندان

صبا محمد اسلم۔ گوجرانوالہ

اچانک جہازی سائز دروازے سے رنگا رنگ روشنی منعکس ہونے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس روشنی میں ہیولے نمودار ہوئے مگر پھر وہ ہیولے انسانی شکل اختیار کر گئے کہ پھر اچانک……

صدیوں پر محیط ایک دل دہلاتا اور عقل کو حیران کرتا اپنی نوعیت کا لرزہ براندام شاخسانہ

ہمارا ہرا بھرا گھر تھا۔ شام ہوتے ہی آنگن میں نوکر چارپائیاں بچھا کر ان پر اُجلے اُجلے بستر اور مچھر دانیاں لگا دیتے تھے۔ میں تو ساری رات جاگ کر آسمان پر روشن ٹمٹماتے دیے جیسے ستاروں کو تکا کرتی تھی اور انہیں گننے کی ناکام کوشش کرتی تھی۔ جب ہوا درختوں سے ٹکراتی تو سائیں سائیں کی آواز سناٹے میں ہلچل مچا دیتی تھی۔ جس سے ڈر بھی بہت لگتا تھا لیکن صحن میں اتنے بہت سارے لوگوں کی موجودگی سے تحفظ کا احساس بھی ہوتا تھا۔ ویسے بھی ہمارے گھر میں کوئی بھی بچہ بزدل نہ تھا۔ ہم لوگ سندھ سے آئے تھے۔ سندھ کے تمام شہروں میں بڑی تعداد میں ہندومت کے ماننے والے ہیں۔ یہ یہاں کے قدیمی باشندے ہیں۔ ان کا مسلمانوں کے ساتھ میل جول کاروبار، لین دین اور اٹھنا بیٹھنا ہے۔ وہاں ابو کے دوستوں کی اکثریت ہندو تھی اور کراچی آنے کے بعد بھی ان کے دوستوں میں ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔

ابو بہت آرٹسٹک اور براڈ مائنڈ تھے، انہوں نے پورے گھر کو بہت پلاننگ کے ساتھ سجایا اور سنوارا تھا بلکہ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ گھر کے درو دیوار پر بیتر رنگا رنگ قسم قسم کے خوبصورت پھولوں سے بھر دیں، ہمارا اتنا بڑا گھر ابو کے شوق کے نتیجے میں مختلف قدیمی اشیا نوادرات اور فرنیچر سے بھرا ہوا تھا ابو ایک شپنگ کمپنی میں تھے، اس لیے ملکوں گھومتا اور وہاں کی نادر و نایاب اشیاء کو جمع کرنا ان

کو شوق تھا۔ ان کے شوق کے نتیجے میں ایسے مجسمے بھی گھر میں تھے جن کے بارے میں اکثر لوگوں کا کہنا تھا کہ "انہیں گھر میں نہ رکھو ان کا گھر میں رکھنا نحوست کا سبب بن سکتا ہے۔" لیکن ابو ان باتوں کو نہیں مانتے تھے۔

یہ واقعہ سچا ہے جو میں سنانے جارہی ہوں یہ ابو کے نوادرات جمع کرنے اور سجانے کے شوق کے نتیجے میں پیش آیا تھا ابو کے بہت قریبی دوست نے بتایا تھا کہ "فلاں جگہ ایک قدیم مندر کے کچھ حصوں کی نئے سرے سے تعمیر ہونے والی ہے اس مندر کے دروازے شمشیر، بلم، گرز وغیرہ جو کہ بہت قدیم ہیں اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جو وہ لوگ نیلام کرنا چاہتے ہیں۔"

قدیم چیزیں اور وہ بھی خوبصورت ابو کہاں پیچھے رہنے والے تھے، وہ اپنے دوست کے ساتھ مندر گئے اور اپنے مطلب کے منقش شمشیر، گرز اور ایک دیوہیکل چوبی دروازہ پسند کرکے اس کی فوری ایڈوانس پیمنٹ کرآئے۔

جب یہ تمام سامان ٹرک سے گھر کے دروازے پر اترا تو دیکھنے والے حیران ہوہوکر پوچھ رہے تھے۔ "یہ دیوہیکل جناتی دروازہ جس کا ایک ایک پٹ چار چار فٹ چوڑا ہے اور یہ غیر معمولی لمبے شمشیر وغیرہ کہاں لگائے جائیں گے؟"

ابو اس کے لئے پہلے ہی اپنے ذہن میں پلاننگ کرچکے تھے گھر کے چھوٹے سے صحن گیٹ کو نکلوا کر باقاعدہ پوری دیوار تڑوا کر بھاری بھرکم مندر والا چوبی دروازہ لگوایا گیا پچن، باتھ روم اور اس کے ساتھ والے کمرے میں پکی چھت ہونے کے باوجود خوبصورت نقش ونگار سے مزین شمشیر کو انہوں نے اس طرح لگوایا کہ دیواروں کے ساتھ پلاسٹر آف پیرس کی نقاشی کروائی گئی مضبوط بلم جو کہ ان پر خوبصورتی کے ساتھ دو جوڑے شمشیر رکھوائے گئے تھے۔

وہ دیوہیکل منقش دروازہ جو مندر سے لایا گیا تھا کسی بادشاہ کے دور کا نادرونایاب دروازہ تھا۔ جو لوگ اس کے بارے میں سنتے تھے اسے ضرور دیکھنے آتے تھے ابو کو یہ سارا کام کراتے ہوئے شاید تین یا چار ماہ ہی ہوئے تھے کہ چھوٹے چھوٹے عجیب وغریب واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

یہاں یہ بات بتاتی چلوں کہ میں بچپن میں بہت شرارتی تھی، میں ہی کیا ہمارے گھر کے سب بچے بہت شرارتی تھے۔ بڑے بھائی کو فلم دیکھنے کا بہت شوق تھا اکثر انگریزی معیاری فلمیں دیکھتے اور گھر والوں کی اجازت سے اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ جاتے تھے۔

اس وقت بھی فلم کا آخری شو دیکھ کر حسب معمول اپنے دوستوں کے ساتھ رات گئے واپس آرہے تھے کہ گھر سے کچھ فرلانگ پہلے انہوں نے دیکھا کہ ان کے آگے دھنک رنگ اور روشنی کے جھماکے ہورہے تھے پہلے تو وہ یہ سمجھے کہ ان کے کسی دوست کے پاس ٹارچ وغیرہ ہے اور وہ یہ حرکت کررہا ہے مگر ایسا نہیں تھا ان کے دوست خود اس روشنی کو دیکھ کر حیران ہورہے تھے۔

اچانک اس روشنی میں سے کچھ عجیب وغریب سے چہرے نمودار ہوئے، کبھی بھیانک سے بندر کا چہرہ کبھی بڑے سے ہاتھی کا چہرہ ان جانوروں کے بے تحاشہ لمبے دانت اور آگ کی طرح سرخ چپڑ چپڑ کرتی زبانیں کئی گز لمبی تھیں۔ اور سڑک پر لگ رہی تھیں، کبھی عورتوں کے ایسے ہیولے نظر آتے جن کے کئی بھیانک چہرے اور کئی سر سے بڑے ہاتھ تھے۔

بھائی آیت الکرسی پڑھتے ہوئے گھر تک تو پہنچ گئے تھے مگر خوف سے ان کی حالت خراب تھی، کیونکہ ان تمام عورتوں کو انہوں نے چوبی دروازے تک آتے دیکھا تھا۔

کریم بابا ہمارے نوکر نے دروازہ کھولا تھا۔ اور بھائی کو اس بدحواسی میں دیکھ کر وہ خود پریشان ہوگئے تھے۔

صبح جب گھر والوں کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو بھائی کے رات گئے تک فلم دیکھنے پر پابندی لگ گئی، پھر روزانہ ہی گھر میں کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آنے لگا۔

بڑے ابو نے گھر کے سب افراد چھوٹے بڑوں کو کہہ دیا کہ "زیادہ تر باوضو رہیں اور ہر وقت آیت الکرسی کا ورد کرتے رہیں۔"

اب تو روزانہ رات کو شور کی آوازیں آتی رہتیں ہم سب بچوں کو عادت تھی کہ اگر رات میں کسی کو ٹوائلٹ جانا ہوتا تھا تو سب باجماعت ہوکر جاتے تھے بڑے سے

آنگن کی بالکل آخری حد پر بنے ٹوائلٹ میں اکیلے جانے کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی۔

ایک رات چھوٹے بھائی نے مجھے اٹھایا اسے باتھ روم جانا تھا۔ میں نے اپنی کزن شبانہ کو اٹھایا اور جتنی دیر ٹوائلٹ میں رہا میں نامعلوم کیوں چوبی دروازے کے پاس کھڑی ہوکر بہت غور سے اسے دیکھنے لگی۔

اچانک عجیب منظر نظر آیا پوجا پاٹ کے مناظر، پھول پھل، باغات خوبصورت اور بدہیئت چہرے ہاتھی، بندر، سانپ، گھوڑے کئی چہرے ایسے بھی تھے جن کی ناک کی جگہ ہاتھی کی سونڈ بنی ہوئی تھیں۔

پورے دروازے پر گول گول ابھرے ہوئے نقش اتنا باریک کام تھا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ انسانی ہاتھوں کا کام ہے۔ اس دروازے کی تیاری میں کتنے ہی کاریگروں نے انتھک محنت کئی سالوں تک کی ہوگی۔

میں دروازے میں ایسی کھوئی تھی کہ جب چھوٹے بھائی نے آکر بلایا۔ "آپی...... چلیں...... نیند بھی آرہی ہے اور ڈر بھی لگ رہا ہے۔" وہ دونوں چلے گئے مگر میں وہیں دروازے کے آگے کھڑی رہی پھر مجھے اچانک محسوس ہوا کہ جیسے وہ بھاری بھرکم چوبی دروازہ بغیر کسی آواز کے آہستہ آہستہ کھل رہا ہے تھوڑی ہی دیر میں دروازے کے دونوں پٹ کھل چکے تھے مگر وہاں مسجد یا ہماری گلی نہیں تھی بلکہ کوئی اور ہی دنیا تھی رنگ، خوشبو، اسرار اور تحیر سے بھری ہوئی دنیا۔

میں حیرت بھری نظروں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی دور تک پھیلا ہوا ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا۔ جس کی جگمگاتی چھت پر مینا کاری ہوئی تھی، دیواروں پر خوبصورت کام کیا ہوا تھا لاتعداد فانوس اور جلتی ہوئی موم بتی نے آنکھوں کو خیرہ سا کردیا تھا۔ ہال میں لوبان، اگربتی اور مختلف قسم کی خوشبوؤں کی لپٹیں، دھوئیں کے مرغولے بناتی باہر نکل رہی تھی ڈھیروں چراغ جل رہے تھے پھر میں نے دیکھا کہ بدن پر مخصوص طلے ہندوانہ انداز کی دھوتی باندھے گیروے کپڑوں میں ملبوس چار آدمی جن کے منڈے ہوئے سروں پر چٹیا اور ماتھے پر تلک لگی تھی۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالائیں اور لکڑی کے کھڑاویں پہنے اپنے کاندھوں پر ایک سجی ہوئی پالکی کو اٹھائے ہال کے اندر داخل ہوئے۔

انہوں نے ہال کے درمیان آکر آہستگی سے پالکی کو نیچے رکھ دیا۔ اور سجدہ کرنے کے انداز میں اس وقت تک جھکے رہے جب تک پالکی کا پردہ اٹھا کر ایک خوبصورت لڑکی باہر نہیں آگئی تھی، ان لوگوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر لڑکی کو پرنام کیا اسی دوران ہال کے کونے کونے سے بالکل اسی جیسی سینکڑوں لڑکیاں نکل نکل کر رقص کرنے لگیں، رقص کرتے ہوئے انہیں بالکل اپنی سدھ بدھ نہیں تھی۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں سے خون نکل رہا تھا۔ جسے اپنی انگلیوں کی پوروں سے زمین سے اٹھا کر وہ اپنی مانگ میں سیندور کی طرح بھر رہی تھیں۔

پھر میرے کانوں میں اللہ اکبر کی دلگداز آواز گونجی تھی مسجد کا موذن نیند میں بے خبر لوگوں کو فلاح کی طرف بلا رہا تھا۔ نماز پڑھنے کی دعوت دے رہا تھا اور اب یہاں سے سب کچھ غائب ہوچکا تھا ہر منظر مٹ گیا تھا۔

دروازہ بھی بدستور بند تھا میں نے ایک جھرجھری لی درلڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنی چارپائی تک پہنچ کر بے سدھ ہوکر سوگئی تھی۔ اس کے بعد تو ہر رات یہی ہونے لگا۔

پھر ایک رات ابو سمیت گھر کے ان افراد نے جو اس وقت جاگ رہے تھے کھلی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا جس پر شاید کسی کو بھی یقین نہ آئے۔

"بابا...... ابو...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"نہیں ڈرو...... نہیں ہم جاگ رہے ہیں۔" ابو نے میرے سر میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تاکہ مجھے نیند آجائے گی۔" میری نظر دروازے کی طرف گئی تو ایسا لگا جیسے وہاں آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن ہے۔"

"ابو...... ابو...... در دیکھیں...... دروازے کی طرف۔" میں نے آہستہ سے ابو کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"ہاں بیٹا میں وہی دیکھ رہا ہوں۔" انہوں نے مجھے اپنے سے لپٹاتے ہوئے سرگوشی کی آواز میں کہا تھا۔" تم آیت الکرسی پڑھو اور آنکھیں بند کرلو ڈرو نہیں۔"

مگر میری آنکھوں میں نیند کہاں بلکہ خوف نے ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر اچانک ایسا لگا کہ جیسے پورا آنگن عجیب

رغریب قسم کے شور سے بھر گیا ہو۔ نامعلوم اور نامانوس آواز سے ایسا شور مچا تھا کہ میں نے بے اختیار اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

اچانک چوبی دروازے کے دونوں پٹ ایک زوردار جھٹکے سے ایسے کھلے جیسے ان میں اسپرنگ لگا ہو۔ دروازہ کھلتے ہی ایک خوفناک منظر سامنے آ گیا۔ انتہائی بھیانک چہرے والے خونخوار کے چہرے کی طرح ان کی تھوتھنیاں تھیں سرخ سرخ خون سے زیادہ ہونٹ کانوں کی غیر معمولی لمبی لووں تک پھیلے ہوئے وہ جھلسے ہوئے ڈراؤنے اور کریہہ چہرے تھے۔ جن کے بہت موٹے موٹے لٹکے ہوئے ہونٹ مسلسل اس طرح حرکت کررہے تھے۔ جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں۔ ان کی آنکھوں کی جگہ دو گڑھے تھے جن میں نیچے انگارے دہک رہے تھے۔ کھجور کی چوٹیوں کی طرح لمبے گندھے ہوئے بال جٹاؤں کی صورت میں گردن پر پڑے ہوئے تھے دروازے سے وہ ایک ایک کرکے سینکڑوں کی تعداد میں برآمد ہونے لگے۔ اور درختوں کی ایک ایک شاخ پر ایسے لٹک گئے جیسے درخت کے پھل ہوتے ہیں۔

گھر کے جن لوگوں نے اس رات دم سادھ کر اس ہولناک منظر کو دیکھا تھا صبح ہونے تک سب ہی خوف زدہ اور پریشان تھے۔

صبح ہوتے ہی بڑے ابو سب سے پہلے مشہور معروف عامل بھائیوں کو تمام صورت حال بتا کر گھر لے آئے تھے انہوں نے کہا کہ "گھر کے تمام افراد کو پہلے کہیں اور منتقل کریں۔" ہم سب فوری طور پر اپنے رشتہ داروں کے گھر چلے گئے تھے۔

عامل صاحب کا کہنا تھا "علی صاحب خدا کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے کہ آپ لوگوں کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا مسجد سے پانچوں وقت بلند ہونے والی اذان اور نماز کی صدائیں آپ لوگوں کی پڑھی جانے والی دعائیں اور ہر وقت کا حصار کرنا کام آ گیا ورنہ جو کچھ ہوتا جو آپ لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔"

پھر انہوں نے کہا "جتنی جلدی ہوسکے یہ چوبی دروازے اور شہتیر وغیرہ نکلوا دیئے جائیں۔"

ابو خود پریشان اور خوف زدہ تھے انہوں نے فوراً مزدوروں کو بلا کر دروازے اور دوسرا سامان نکلوا دیا۔

عامل صاحب کا حکم تھا کہ "یہ چیزیں فوری طور پر تلف کردی جائیں اب انہیں کہیں اور فروخت نہ کیا جائے۔"

ہمارے مکان کے پیچھے ایک وسیع کھلا میدان تھا محلے والوں سے مشورے کے بعد وہ چوبی دروازہ اور دوسرا سامان کئی مزدوروں کی مدد سے میدان میں پہنچایا گیا پھر اس پر کئی لیٹر مٹی کا تیل ڈالنے کے بعد اسے آگ لگادی گئی لگتا تھا اس میں لگی آگ کی سرخ لپٹیں قرب و جوار کی ہر چیز چاٹ جانے کے لئے بے چین ہیں لکڑی کے چٹخ کر جلنے کی آوازیں رونے کی آوازوں سے مشابہ تھیں۔

صبح کی لگائی گئی آگ دوسرے دن رات تک جلتی رہی تھی اور اس کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے رہے تھے۔

جب وہ سب چیزیں جل کر خاکستر ہوگئیں تو وہاں راکھ اور ہڈیاں بچی تھیں جو لوگ آگ لگائے جانے کے وقت وہاں موجود تھے ان کا کہنا تھا کہ لکڑی نہیں جل رہی تھی بلکہ لگتا تھا کہ منوں کے حساب سے گوشت کو جلایا گیا ہو چربی اور گوشت کی بدبو ہفتوں فضا میں موجود رہی۔

اس کے بعد ابو نے وہ تمام نوادرات جن کے بارے میں سب کہتے تھے کہ منحوس ہیں انہیں سمندر کے بیچوں بیچ پھینک دی تھیں۔

عاملوں کا کہنا تھا کہ "وہ چوبی دروازے صرف دروازے نہیں تھا بلکہ ان روحوں کا زندان تھا جنہیں صدیوں پہلے جنوں نے اپنے عملیات کے ذریعے غلام بنا کر قید کرلیا تھا۔ یعنی نہ جانے کتنی غلام بے چین اور بھٹکی ہوئی روحیں اس طلسماتی دروازے میں قید تھیں۔ انہیں طویل قید سے رہائی ملی تو وہ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف ایسے گئیں کہ پھر واپس نہیں آئیں کیونکہ پھر اس کے بعد گھر میں کبھی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جہاں سائنس کی بے پناہ ترقی کے باوجود انسانی عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔

پرانی حویلی

رابعہ باسط مظہر۔ حامد جھنگی

ایک نوجوان دندناتا ہوا حویلی میں گھسا کہ پھر آناً فاناً اس کی لاش حویلی سے باہر آگری، لوگ حیران و پریشان تھے، عقل پر جیسے پردہ پڑگیا تھا کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا اچانک کیا ہوا۔

خوف کے سمندر میں غوطہ زن ایک عجیب و غریب ہولناک اور خوفناک کہانی

قارئین یہ کہانی جو میں آپ کے گوش گزار کرنے جارہا ہوں تقریباً کوئی بیس سال پہلے کی ہے۔ آج بھی جب میں ان بیتے ہوئے لمحات کو یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے گریجویشن مکمل کی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ چلا گیا۔ امریکہ میں میں نے تقریباً سات سال تعلیم حاصل کی۔ والد صاحب مسجد کے امام تھے اور ہمارا گھرانہ ماں، باپ کے علاوہ ایک میں یعنی محمد زین اور میرے چھوٹے بھائی میں ریحان پر ختم ہوتا تھا۔ ہم ایک خوبصورت گاؤں پھول نگر کے رہائشی تھے۔ میرے والد صاحب مسجد امام ہونے کے علاوہ دم وغیرہ بھی کرتے تھے۔ مثلاً اگر کسی کو کوئی پریشانی، تکلیف ہے تو وہ ان کے پاس آتے۔ وہ ان

کے لئے دعا کرتے اور تعویذ وغیرہ دیتے۔ والد صاحب نے تھوڑا بہت مخفی علم سے مجھے بھی روشناس کرایا تھا۔

میں اپنی تعلیم مکمل کرچکا تھا۔ اور سات سال بعد اپنے پیارے ملک وطن اپنے حسین گاؤں پھول نگر واپس آرہا تھا۔ میں نے گھر اطلاع کردی تھی چنانچہ وہ ائیرپورٹ پر پہلے سے ہی موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گلے سے لگایا، والدین کی شفقت سمیٹنے کے بعد میں نے اپنے چھوٹے بھائی ریحان کو گلے سے لگایا اور پیار کیا اس کے بعد ہم اپنے گاؤں کی سرزمین پہنچ گئے گھر پہنچتے ہی ایک ہجوم سا لگ گیا۔ گاؤں کے لوگ جوق درجوق ملنے آرہے تھے کہ امام صاحب کا بیٹا امریکہ سے تعلیم مکمل کر کے گھر آیا ہے۔ پھر میں نے اپنے دوستوں، یاروں سے ملاقات کی اور خوب گپیں لگائیں گاؤں کی یادیں تازہ کیں اس کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس کے بعد چونکہ میں سفر کی وجہ سے تھک چکا تھا لہٰذا اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا اور خواب خرگوش کے مزے اڑانے لگا۔

شام کو پہلے تو فریش ہوا پھر ایک کپ چائے پی اس کے بعد عصر کی نماز پڑھنے مسجد کی طرف روانہ ہوگیا۔ نماز کے بعد میں گھر آگیا۔ والد صاحب ادھر مسجد میں ہی رہے۔ والد صاحب مغرب کی نماز ادا کر کے گھر لوٹتے تھے۔ میں چونکہ P.H.D مکمل کرچکا تھا اس لیے میں نے نوکری کی تلاش شروع کردی اور جلد ہی مجھے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر کی Job مل گئی۔ تنخواہ بہت اچھی تھی لہٰذا میرے والدین مجھ سے بہت خوش تھے۔

ایک روز میرے والد صاحب عصر کی نماز کے بعد گھر آئے اور جائے نماز تسبیح، اور چند دیگر چیزیں لے کر جلدی جلدی مسجد واپس چلے گئے۔

میں نے پوچھنے کی کوشش کی مگر انہوں نے موقع ہی نہ دیا۔ مغرب کے بعد جب وہ واپس آئے تو کچھ پریشان سے لگ رہے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے والد صاحب سے پوچھا۔ ''ابا...... خیر تو ہے ناں آپ شام کو گھر آئے اور بنا کچھ بتائے واپس...... اور اب بھی آپ کے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہورہی ہے۔''

''بیٹا زین...... کچھ نہیں بس ایک اہم کام سر پہ آن پڑا ہے۔ بس اسی کی کڑیاں سلجھا رہا ہوں۔ آج شام کو قریبی گاؤں گلشن پور سے دو عمر رسیدہ میاں بیوی آئے اور آتے ہی پہلے تو زار و قطار رونے لگے میں نے انہیں بڑی تسلی دی اور چپ کرایا کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں سب بہتر ہوجائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ ''ہمارے گاؤں کے قریب ایک حویلی ہے جسے پرانی حویلی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ حویلی اب کسی کی ملکیت نہیں اس کے باوجود بھی وہاں کوئی نہیں جاتا اور ویسے بھی وہ صدیوں سے بند ہے۔''

اب اس حویلی سے طرح طرح کی ڈراؤنی آوازیں آتی ہیں۔ رات کو تو بہت شور ہوتا ہے مگر دن میں وقفے وقفے سے سنائی دیتی ہیں۔

کل رات بھی معمول کے مطابق ہوا میرے بیٹے کمال نے آوازیں سنی تو بولا۔ ''میں دیکھ کر آتا ہوں کہ آخر یہ کیا ماجرہ ہے۔''

ہم دونوں نے بہت سمجھایا پر جوان خون تھا، نہ مانا اور حویلی کی طرف چلا گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حویلی سے چیخ و پکار کی آوازیں واضح طور پر آنے لگیں۔ ان آوازوں میں میرے بیٹے کی آواز بھی واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔''

''بچاؤ، بچاؤ......''

''ہم دونوں حویلی کی طرف لپکے، ان آوازوں سے ہمسائے بھی جاگ چکے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ حویلی کے صدر دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں پر میرے بیٹے کا جسم بے حس و حرکت پڑا تھا۔

پوسٹ مارٹم پر پتا چلا کہ کسی خونی درندے نے بڑی بے رحمی سے اسے چیر پھاڑ ڈالا ہے۔

اس کے بعد ہمارے گاؤں کے ماسٹر صاحب جن کی دوکان بھی ہے۔ چند دن کی بات ہے وہ، ہر روز شام کو دکان بند کر کے گھر آجاتے تھے۔ پر ایک دن واپس نہیں آئے جب کافی ٹائم گزر گیا تو ان کے گھر والے انہیں تلاش کرنے دکان کی طرف آئے اور راستے میں حویلی کے صدر دروازے پر ان کی لاش میرے بیٹے کی لاش کی ہی

حالت میں پائی گئی۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ دونوں زاروقطار رونے لگے۔ اور جو حالت انہوں نے دونوں لاشوں کی بتائی وہ کچھ یوں تھی۔ "جسم سارا زخموں سے بھرا تھا اور سر کو بالکل کچل دیا گیا تھا۔" میں نے انہیں حوصلہ دیا کہ میں اس حویلی کا کچھ کرتا ہوں، کچھ تعویذ دیے اور گھر بھیج دیا۔

☆......☆......☆

کل دن معمول کے مطابق گزرا، میں نے دوپہر کا کھانا اختر کے گھر کھایا، وہ میرے قریبی دوستوں میں شمار ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات اس کی اکلوتی بہن سارہ سے مجھ سے منسوب کر دی گئی تھی۔ میں اور سارہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ کھانے پر اختر اور اس کے تمام گھر والوں سے ملاقات ہوئی پر سارہ سے نہیں۔ کیونکہ وہ اس وقت کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی۔ ویسے شادی سے پہلے محبوبہ کے ہاتھ کا کھانا بڑا ہی لذیذ لگتا ہے پر شادی کے بعد کھانے کا مزہ کیوں خراب ہو جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب میں آپ کو شادی کرنے کے بعد ہی دے سکتا ہوں۔

اتنے میں سارہ نے مجھے کچن کے دروازے کی اوٹ سے دیکھا اور مسکرا دی، میرا بھی پورا دھیان کچن کی طرف لگا ہوا تھا، میں نے بھی جواباً مسکرا دیا۔

اس لمحے مجھے کسی دانا کی بات یاد آ گئی کہ "شادی ایک ایسا قلعہ ہے کہ جو لوگ اس قلعے سے باہر ہیں ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس قلعے کے اندر رہیں اور جو اندر ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس قلعے سے کسی طرح باہر نکلیں۔"

اس کے بعد ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وقت کا احساس ہی نہ ہوا اور شام ہو گئی۔

عصر کی نماز پڑھی اور میں گھر آ گیا۔

والد صاحب نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "بیٹا ازین ہو سکتا ہے مجھے رات کو پرانی حویلی میں ہی رہنا پڑے اگر دیر ہو گئی تو میں صبح کے وقت واپس آؤں گا اس لیے میرا انتظار مت کرنا۔"

میں نے جواب دیا۔ "بابا اپنا خیال رکھنا۔" انہوں نے مجھے گلے لگایا۔

نجانے کیوں اس وقت میرے دل میں ایک انجانی سی بے چینی ہونے لگی تھی جیسے میری کوئی چیز چھن جائے گی یا میری قیمتی چیز کھو گئی ہو۔

بابا رات کو واپس نہیں آئے، میں نے بابا کا پیغام گھر پہنچا دیا تھا، گھر والوں کو خیال تھا کہ رات ادھر ہی یعنی گنگن پور میں کسی جاننے والے کے گھر گزاریں گے۔ پر میرے دل میں ابھی بھی وسوسے ابھر رہے تھے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

رات کو نجانے کب نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہوئی اور میں نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

اگلے دن صبح کے وقت دروازے پر دستک ہوئی تو میں عجلت میں دروازہ کھولا تو دیکھا۔ کہ باہر ایک ہجوم سا تھا، میرے ذہن میں آیا آخر کیا ماجرہ ہے۔ لوگوں نے کسی کی میت اٹھائی ہوئی تھی۔

جلدی سے میرے قریب دو فرد آئے اور بولے۔ "آپ مولوی صاحب کے بیٹے ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا...... اس کے بعد جو الفاظ انہوں نے کہے وہ سنتے ہی میں تو جیسے سکتے کا شکار ہو گیا۔

وہ بولے۔ "کل شام مولوی صاحب پرانی حویلی گئے تھے تاکہ جو بے گناہ لوگ اس حویلی کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتر گئے اور جو ان اموات کا سلسلہ شروع ہے اس کا تدارک کیا جائے۔ پر آج صبح ان کی لاش بے حس و حرکت حویلی کے دروازے سے باہر زمین پر پڑی ملی۔"

جب میں نے یہ الفاظ سنے تو ایسا محسوس ہوا جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی ہو، پر کیا ہو سکتا تھا، سچ کا سامنا تو کرنا ہی تھا، میں وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ چنانچہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میری ٹانگوں میں جان ہی نہ رہی ہو، میں گرنے لگا تھا کہ ان دونوں نوجوانوں نے مجھے سہارا دیا۔

یہ دیکھتے ہوئے میرے باقی گھر والے بھی نکل آئے اور جب انہیں پتا چلا کہ ان کی دنیا تباہ ہو چکی ہے تو ان کا حال بھی میری ہی طرح تھا۔

ہم اپنے بابا کی لاش کے ساتھ لپٹ، لپٹ کر رو رہے تھے ہم کبھی تو بابا کے چہرے پر بوسہ دیتے اور کبھی ہلاتے کہ شاید سو گئے ہیں ابھی اٹھ جائیں گے۔

لوگ ہمیں حوصلہ دے رہے تھے۔ ہماری تو دنیا ہی اجڑ چکی تھی۔ شام چار بجے میرے بابا کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ اور وہ اپنی آخری آرام گاہ میں داخل ہو گئے۔

ہماری پوری رات بابا کو یاد کرتے کرتے گزر گئی۔ نجانے کب مجھ پر غنودگی طاری ہوئی اور میں جہاں بیٹھا تھا وہیں پڑا سو گیا۔

خواب میں میرے والد صاحب نظر آئے، ایک بہت ہی خوبصورت مقام تھا جہاں طرح طرح کے پھول لگے تھے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ان کے بیچ میں میرے والد صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ مجھے مخاطب کیا۔ ”بیٹا کبھی ہمت نہ ہارنا اور پرانی حویلی کی شیطانیت کو سبق سکھا کر چھوڑنا میرا ادھورا کام مکمل کرنا۔ خدا تمہاری مدد فرمائے گا۔ ذرا ہمت کیونکہ رحمان بڑا ہے شیطان سے۔ اور شیطان کچھ نہیں بگاڑ سکتا رحمان کا۔“

اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ فجر کی اذان گونجنے لگی تھی۔ میں نے خواب کا ذکر کسی سے نہیں کیا اور اس معاملے کے بارے میں سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد سارہ اور اس کی والدہ ہمارے لئے ناشتہ لے کر آئیں۔ پر ہمارا تو سب کچھ چھن چکا تھا سارہ اور اس کی والدہ کے بے حد اصرار پر ایک دو نوالہ بامشکل حلق سے نیچے اتارا۔

اس وقت سارہ نے مجھے کافی حوصلہ دیا۔ اب مجھے دور ایک امید کی کرن دکھائی دینے لگی تھی۔ پھر گاؤں کے لوگوں کا افسوس کے لیے آنا جانا شروع ہو گیا۔ پھر رات کو جانے کب نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا اور پھر خواب میں میرے والد صاحب آئے اور فرمایا۔

”بیٹا زین، میری کتابوں کی الماری چیک کرنا۔“

”بیٹا تم نے میری طرح عمل کرنا، میرے بعد سب بار تمہارے کندھے پر ہے۔ اس لیے تمہاری ذمے داری ہے کہ میرا ادھورا کام مکمل کرو اور پرانی حویلی میں موجود آسیب کو ٹھکانے لگاؤ۔“

صبح اٹھتے ہی میں نے پہلا کام یہی کیا۔ بابا کی کتابوں کی الماری کو کھنگالنا شروع کیا مگر مجھے وہاں سے کچھ نہ ملا تو میں مایوس ہو گیا اور کتابیں ترتیب کے ساتھ رکھ رہا تھا کہ ایک کتاب میرے ہاتھ سے پھسل گئی اور جب زمین پر گری تو اس کے اندر ایک فولڈ کیا ہوا کاغذ تھا وہ بھی باہر زمین پر گر گیا، میں نے کتاب اٹھائی اور کاغذ کھولا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی اس میں بابا کے ہاتھ سے ایک عمل کا طریقہ کار لکھا ہوا تھا۔

اب میرے اندر انتقام کی آگ اور زور و شور سے بھڑکنے لگی۔ عمل اگرچہ مشکل تھا مگر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو، میں ضرور عمل کروں گا۔ اور پرانی حویلی نے جتنے معصوم لوگوں کا خون پیا ہے اور خاص طور پر میرے بابا کا تو ہر ایک کا بدلہ، گن گن کر لوں گا۔

اگلے روز میں ماں، ریحان اور سارہ کو ساری بات بتا دی، انہوں نے روکا کہ اس حویلی کی وجہ سے تمہارے بابا موت کے منہ میں چلے گئے اور اب تم۔“

ساتھ ہی سارہ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ پر جب میں نے انہیں سمجھایا کہ ”ایسی بات نہیں ہے اگر اس حویلی کا کام تمام نہ کیا گیا تو اس طرح ہم بھی ایک دن اس حویلی کی وجہ سے موت کے منہ میں پہنچ جائیں گے اور بابا کی بھی یہی خواہش ہے۔“ آخر کار وہ مان گئے اس کے بعد میں ان کی دعاؤں کے ساتھ اور اللہ کی کرم نوازی کے ساتھ حویلی کی جانب چل پڑا۔

اب میرا رخ پرانی حویلی کی طرف تھا۔ دل و دماغ انتقام کی آگ میں بھڑک رہا تھا۔ کیونکہ جس طرح بے گناہ لوگ عبرت ناک موت مارے گئے اگر میری جگہ کوئی ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔

تھوڑی دیر بعد میں پرانی حویلی کے صدر دروازے پر تھا، چونکہ میں بابا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر پڑھ چکا تھا کہ عمل کس طرح کرنا ہے اور اس میں کون، کون سی احتیاط ضروری ہیں لہٰذا میں نے حفاظت کے لیے اپنے جسم کا حصار کیا اس کے بعد دروازے کو دھکا دیا، دروازہ آہستہ آہستہ، چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا

اندر میں داخل ہو گیا۔

حویلی کے اندر ہر طرف گھاس پھونس، جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں صحن کے وسط میں ایک پیپل کا درخت تھا سو میں نے اس جگہ کا انتخاب کیا اور صاف کرنا شروع کیا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا، جیسے کوئی ذی روح میرے پیچھے موجود ہو، میں نے فوراً مڑ کر دیکھا پر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

میں نے اللہ کا نام لیا، اپنے چاروں طرف حصار کھینچا، اس کے بعد عمل کی کارروائی کا آغاز کر دیا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اندر سے عجیب، عجیب قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ اس طرح کی آوازیں میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔

"اوہ میرا خدایا....." اتنی بھیانک کہ اگر کوئی اور سن لیتا تو دل کی دھڑکن ادھر ہی بند ہو جاتی۔ ان آوازوں کا شور رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا، پر میں نے اپنا پورا دھیان عمل کی طرف رکھا، وہ آوازیں حویلی کے درمیانے کمروں سے آ رہی تھیں کچھ دیر بعد ان کا سلسلہ ختم ہو گیا، اب ہر طرف پہلے جیسا سماں تھا۔

نماز ظہر کا ٹائم ہو گیا میں نے ظہر کی نماز ادا کی اس کے بعد دوبارہ پڑھائی شروع کر دی ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حویلی کے در و دیوار کسی کی چیخوں سے لرزنے لگے جیسے کسی لڑکی پر تشدد ہو رہا ہو۔ مجھ سے نہ رہا گیا کیوں کہ اس لڑکی کی آواز میں بہت غم اور دکھ تھا میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی حصار سے باہر نکل کر اس لڑکی کی جان بچا لوں۔

پر عین موقع پر میرے کانوں میں بابا کی آواز پڑی۔ "بیٹا یہ سب تمہیں عمل سے دور کرنے کے لیے ایک چال ہے پڑھائی جاری رکھو۔" میں نے اپنا دھیان دوبارہ عمل کی طرف کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی کی چیخوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میں نے پڑھائی جاری رکھی اور آخر کا وقت گزر گیا اور نماز عشاء کا ٹائم ہو گیا۔ میں نے حصار کے اندر ہی نماز ادا کی اور دوبارہ اپنے مقصد میں ڈوب گیا۔

اچانک تیز ہوا چلنے لگی جس کی وجہ سے گرد و غبار کا طوفان اٹھا پھر جب گرد و غبار ختم ہوا تو اچانک میرے سامنے ایک ایسی لڑکی نمودار ہوئی۔

"اوہ..... میرے خدایا کیا بتاؤں، اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اسی وقت زندگی کی قید سے آزاد ہو جاتا۔ اس لڑکی کے دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے ہونٹوں پر تازہ خون لگا ہوا، سر کے بال جیسے سر پہ سانپ رقص کر رہے ہوں۔ ناک آدھی کٹی ہوئی اور آنکھیں سفید بے جان جیسے ان میں زندگی کی رمق باقی نہ ہو۔ پاؤں اور ہاتھوں کے ناخن ایسے جیسے ریچھ کے ہوں۔ سرخ لباس میں ملبوس وہ چڑیل نما لڑکی میرے سامنے کھڑی اپنے بے جان آنکھوں سے مجھے، دیکھنے میں مصروف تھی اور اس وقت مجھے اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔

اچانک فضا میں ایک کرخت دل و دماغ کو مبہوت کرتی آواز گونجی۔ "لڑکے چھوڑ دے یہ عمل اور بھاگ جا، اگر عمل نہ چھوڑا تو میں تیرا وہ حشر کروں گی کہ موت بھی ڈر جائے گی۔ لگتا ہے تو ایسے نہیں مانے گا تجھے سبق سکھانا ہی پڑے گا۔"

اچانک اس کی بے جان آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہکنے لگیں اور ان آنکھوں سے وہ آگ کے گولے نکل کر میری جانب سست رفتار سے بڑھنے لگے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی بھاگ جاؤں پر پھر بابا کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "حصار سے باہر نہ نکلنا بیٹا یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

اب وہ آگ کے گولے میرے بالکل قریب تھے کہ حصار سے ٹکرا کر وہیں ختم ہو گئے۔ جب چڑیل نما لڑکی نے یہ دیکھا کہ اس کا وار ناکام ہو گیا تو وہ اور غصے میں ہو گئی اور مجھے مخاطب کر کے بولی۔ "لڑکے تو اپنے والد کو تو ویسے ہی کھو چکا ہے اب کیا اپنے چھوٹے بھائی اور ماں کو بھی کھونا چاہتا ہے۔"

یہ بات سنتے ہی میرا خون کھولنے لگا، میں نے پڑھائی اونچی آواز میں شروع کر دی اب وہ تڑپنے لگی کسی سانپ کی طرح زمین پر بل کھانے لگی اور ساتھ ہی

غائب ہو گئی۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میری حیرانگی میں اضافہ ہو گیا کیونکہ میرے سامنے گھٹنے ٹیکے میری ماں اور چھوٹا بھائی تھے۔

ماں بولی۔ ''بیٹا چھوڑ دو اس عمل کو اگر تم نے نہ چھوڑا تو وہ ہمیں مار دے گی۔'' پھر میرا معصوم بھائی ریحان بولا۔ ''بھیا آؤ گھر چلیں ورنہ وہ مجھے مار دے گی۔'' اور وہ سسکنے لگا۔

پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو میں اپنی ماں اور بھائی کو کھونے نہیں دوں گا اور حصار سے باہر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ میرے والد صاحب کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''ذین بیٹا پڑھائی جاری رکھو یہ سب تمہاری نظروں کا دھوکا ہے۔''

میں نے پھر اونچی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا اور وہ دونوں غائب ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس چڑیل نما لڑکی کی چال تھی، وہ کامیاب نہ ہو پائی۔

اب کوئی خوفناک واقعہ پیش نہ آیا اور میں نے عمل جاری و ساری رکھا تھوڑی دیر بعد فجر کی اذان کا وقت ہونے والا تھا اور فجر کی نماز کے ساتھ ہی میرا عمل اپنے اختتام کو پہنچ جاتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد فجر کی اذان ہر طرف گونجنے لگی میں نے فجر کی نماز ادا کی پھر اپنا عمل شروع کر دیا۔ حویلی کے در و دیوار جیسے کانپنے لگے۔ ایک طوفان آ گیا مٹی اڑنے لگی درختوں کی شاخیں تیز ہوا کی وجہ سے ٹوٹنے لگیں ساتھ ہی خوفناک قسم کی آوازیں آنے لگیں میرا بہت برا حال ہونے لگا اور یہ سلسلہ تقریباً کوئی 35 منٹ تک جاری رہا اس کے بعد آہستہ آہستہ ماحول پر سکوت چھانے لگا۔

اب میرے سامنے وہ چڑیل نما لڑکی تھی جو ہاتھ جوڑے کھڑی تھی بولی۔ ''سو سال گزر گئے حویلی میں کوئی مجھے زیر نہ کر سکا آج تو نے مجھے اپنا غلام بنا لیا۔''

میں نے کہا۔ ''ان تمام بے گناہ اموات اور خاص طور پر اپنے بابا کی موت کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ ''ان سب اموات کے پیچھے ایک کہانی ہے وہ ایک سچی کہانی۔''

میں نے کہا۔ ''جلدی بتا اپنی اصلیت ورنہ جلا کر ختم کر دوں گا تجھے۔''

وہ پھر اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''کوئی سو سال پہلے کی بات ہے میں اور میرا پتی کومال اس حویلی میں رہتے تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے میں ایک امیر خاندان سے تھی جب کہ کومال مڈل طبقے سے تعلق رکھتا تھا ہم نے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی کومال مجھے بہت چاہتا تھا اور میں بھی اسے بہت پیار کرتی تھی۔ ایک صبح کومال چھٹی کے دن دفتر کا بہانا بنا کر گھر سے نکلا تو میں سمجھی شاید کام زیادہ ہو اس لیے چھٹی کے دن بھی کومال کام پر جا رہا ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں گھر کا سودا سلف لینے بازار کی طرف روانہ ہو گئی۔

راستے میں میری نگاہ سڑک کے ساتھ واقع ایک ہوٹل کی پارکنگ ایریا کی طرف اٹھی جہاں کومال کی گاڑی بھی کھڑی تھی مجھے شک سا ہوا کہ کومال اس وقت ہوٹل میں کیا کر رہا ہے۔ میں نے گاڑی پارک کی اور ہوٹل کے اندر داخل ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لیے تو میں پتھر کی ہو گئی۔ کومال اور اس کے ساتھ ایک لڑکی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کافی پی رہے تھے۔ میرے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پاؤں سے زمین سرک گئی ہو۔ آخر میں نے ہمت کر کے پیچھے سے کومال اور اس لڑکی کے بائیں سائیڈ والے ٹیبل پر منہ دوسری طرف کر کے بیٹھ گئی تاکہ اگر وہ دونوں دیکھ بھی لیں تو انہیں میرا چہرہ نظر نہ آئے اس کے بعد میں نے ان کی باتوں پر دھیان دیا۔

کومال نے اس لڑکی کو مخاطب کیا۔ ''سونالی...... میری جان بس تھوڑا اور صبر کر لو...... ویسے بھی اب میری اور لکشمی کی شادی ہو چکی ہے...... اور اگر اسے کسی طرح موت کے منہ میں دھکیل دیا جائے تو اس کی ساری جائیداد میرے نام ہو جائے گی اور پھر ہم دونوں شادی کر لیں گے زندگی آرام سے عیش و عشرت کے ساتھ گزرے گی۔''

یہ سنتے ہی جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ

گئے ہوں۔ جیسے میرے اردگرد دھماکہ ہو رہے ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری روح میرا ساتھ چھوڑ رہی ہو۔ میری آنکھیں پتھرا گئیں۔

میں وہاں سے چپکے سے اٹھی اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ گھر پہنچ کر میں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ جس شخص کی خاطر میں نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف ہو گئی۔ جس کے لیے میں نے اپنے گھر بار والوں کو چھوڑ دیا آج وہی کسی دوسری لڑکی سے محبت کا دم بھر رہا ہے۔ اور مجھ سے محض دولت کی خاطر شادی رچائی۔ جھوٹا...... مکار...... فریب دیا مجھے۔'' اب مجھے غصہ آ رہا تھا اپنے آپ پر اور فریبی کومال پر بھی۔

کہ میں بھی کتنی بے وقوف تھی کہ کونال جیسے گھٹیا انسان کے فریب میں آ گئی اب میں نے عہد کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے کومال کو اپنی جائیداد سے ایک پائی تک نہ دوں گی۔

شام کو کومال واپس آیا اور آتے ہی مجھے بانہوں میں بھر لیا۔ ''جان من تمہارا دن بہت بور گزرا ہوگا ناں۔ میں جو نہیں تھا۔ میری جان۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ دفتر میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا تمہارے بنا میرا ایک ایک پل اذیت میں گزر رہا تھا۔''

اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ یہ سب باتیں دل سے نہیں بلکہ دماغ سے کہہ رہا تھا۔ معمول کے مطابق رات کو ہم کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے اور کھانا کھایا۔ اس کے بعد میں نے اپنے اور کومال کے لیے چائے بنائی اس کے بعد میں نے کونال کو مخاطب کیا۔

''کومال کیا تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو اور تم نے میری محبت میرے پیار کی وجہ سے مجھ سے شادی کی یا محض دولت کی خاطر۔''

اب کونال چونک پڑا اور تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میرے چہرے سے غصہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کومال اپنی کرسی سے اٹھا اور میرے قریب آ گیا۔ میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''کیوں لکشمی میری جان تجھ پر کسی قسم کا شک ہے کیا؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر کونال کے چہرے سے گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔ اب اسے مجھ پہ شک ہو گیا تھا کہ شاید لکشمی کو سونالی کے بارے میں پتا ہے کہ اچانک کونال اونچے اونچے قہقہے لگانے لگا۔

''لکشمی جی...... اگر آپ سننا ہی چاہتی ہیں تو سنیں میں نے تم سے صرف اور صرف تمہاری دولت کے لیے شادی کی تھی میرا پیار میری محبت میرا سب کچھ سونالی ہے سمجھی اب سن لیا ناں۔ ہاہا...... ہاہا......''

میں بھی غصے سے اس پر ٹوٹ پڑی۔ ''کونال کان کھول کر سن لو تمہیں میری جائیداد سے ایک ٹکا بھی نہیں ملے گا۔'' پھر ہم دونوں میں بحث شروع ہو گئی اور اس دوران کومال نے ٹیبل کے اوپر پڑا ہوا پھولوں کا گلدان جو کافی وزنی تھا۔ اسے میرے سر پہ دے مارا۔ گلدان بھاری ہونے کی وجہ سے جیسے ہی میرے سر سے ٹکرایا تو خون کا ایک فوارہ میرے سر سے نمودار ہوا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہو گئی سامنے صوفے پر کومال بیٹھا مسکرا رہا تھا پھر میں نے سرک سرک کر ٹیلی فون کی جانب جانا شروع کیا لیکن جب ٹیلی فون تک پہنچی، عین اسی وقت میرے سر پہ جہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس جگہ زور سے کونال نے لات رسید کر دی اور میری روح اسی وقت زندگی سے آزاد ہو گئی۔

اس کے بعد کونال اور سونالی نے میری لاش کو قریبی گاؤں کے ایک دیہاتی کو خطیر رقم دے کر ٹھکانے لگانے کا کام سونپ دیا۔ اس کے بعد کونال اور سونالی نے شادی کر لی اور میری دولت پر عیش کرنے لگے۔

ادھر اس دیہاتی نے میری لاش کو ایک عامل کے حوالے کر دیا۔ کیونکہ عامل نے اسے بھاری رقم دی تھی اس نے میری لاش جلانے کے بجائے اسے بیچ دی۔ عامل نے میری لاش پر چلہ کاٹنا شروع کر دیا اور چند ہی دنوں میں اس نے میری روح اپنے قبضے میں کر لی۔ وہ میری تمام تر حقیقت بھی جان چکا تھا۔

میں نے اسے بہت سمجھایا کہ بس چند دنوں کی مہلت دے تاکہ میں کونال اور سونالی سے اپنی موت کا

بدلہ لے سکوں پر وہ نہ مانا، میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ میں آ کر اس کی غلام بن چکی تھی۔

عامل مجھ سے طرح طرح کے کام لیتا تھا، اچھے بھی اور برے بھی۔

عامل ایک دن کسی کام سے دوسرے شہر جا رہا تھا کہ راستے میں اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا جس میں وہ مارا گیا اور میں آزاد ہو گئی۔ اب میرا رخ اپنی حویلی کی جانب تھا۔ جہاں پر کونال اور سونالی میری دولت میری جائیداد پر رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ جتنے دن عامل نے مجھے قبضے میں رکھا تھا اس دوران میری روح بہت شکتی شالی ہو گئی تھی۔

جب انہوں نے مجھے اپنے سامنے دیکھا۔ پہلے تو وہ ہنسے اور کہنے لگے کہ "اب تو لکشمی خیالوں میں بھی آنے لگی۔" لیکن جب میں نے اپنی پوری طاقت لگا کر کونال کے گالوں پر طمانچہ رسید کیا جس سے اس کی آنکھیں جیسے ابل پڑیں، پھر دونوں پر سے سارا نشہ ختم ہو گیا۔ مجھ سے دونوں معافیاں مانگنے مجھے پاؤں پڑنے لگے۔

پر میرے اندر تو انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، ان دونوں کی وجہ سے میری عیش کی زندگی اذیت میں بدل چکی تھی۔ میں انگلی کے اشارے سے کونال کو اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔ جب وہ چھت تک پہنچ گیا تب اسے الٹا نیچے پھینک دیا، جیسے ہی اس کا سر زمین سے ٹکرایا، کونال کا سر قیمے میں تقسیم ہو چکا تھا۔

اس کے بعد سونالی کی باری تھی، سونالی نے مجھ سے بہت معافیاں مانگی، بہت منت سماجت کی پر میں نے ایک نہ سنی اور اس کی طرف ایک پھونک ماری، ساتھ ہی اس کے جسم کو گرمی لگنا شروع ہو گئی، جوں جوں گرمی بڑھنے لگی تو وہ تڑپنے لگی اور آخر کار گرمی کی شدت اتنی بڑھ گئی کہ اسے آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔" اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔

میں یہ سب سن کر بہت زیادہ حیران بھی تھا اور خوف زدہ بھی تھوڑی دیر بعد لکشمی کی روح نے ایک سرد آہ...... بھری۔

پھر میں نے اس سے اپنے والد اور دوسری اموات کے بارے میں دریافت کیا جس کے جواب میں اس نے بتایا کہ عامل نے مجھ پر عمل کر کے مجھے قہر بنا دیا ہے، اب میں جب تک کسی کا خون نہ پی لوں چین ہی نہیں ملتا، میں جب وہ زندگی کی حد تک پہنچ کر کسی کا خون پیتی ہوں تو پھر مجھے سکون ملتا ہے اور تمہارا باپ اور باقی اموات بھی میں نے اسی لیے کی...... اور اب تمہاری باری ہے۔"

اچانک وہ میری طرف کسی بھوکی شیرنی کی طرح بڑھی اس کی آنکھوں سے آگ نکل کر میری جانب بڑھ رہی تھی۔

میں نے مٹھی بھر مٹی لی اور پھونک مار کر لکشمی کی طرف پھینک دی۔ اسی وقت اسے آگ لگ گئی۔ وہ بہت چلائی منت سماجت کی پر آخر کار آگ بڑھتی ہی چلی گئی اور اس کی چیخ و پکار اس آگ میں ہمیشہ کے لئے دب گئی، ساتھ ہی ایک طوفان آ گیا اور درخت جڑوں سے اکھڑنے لگے ہر طرف مٹی ہی مٹی اڑنے لگی۔ ایسا طوفان میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا تھوڑی دیر بعد طوفان چھٹ گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچا تو گھر والوں نے گلے لگایا ساتھ ہی گاؤں والوں نے بھی۔

کچھ عرصے بعد میری سارہ سے شادی ہو گئی، کالج میں میرے گریڈ بڑھتے بڑھتے میں پرنسپل کے درجے تک جا پہنچا۔ سارہ نے شادی کے کچھ عرصے بعد دو بچوں کو ایک ساتھ جنم دیا۔ میں سارہ والدہ اور چھوٹا بھائی آرام و سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔

مگر میں آج بھی جب ماضی کے دریچوں میں جھانکتا ہوں تو غم اور خوف کی ایک لہر میرے جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو اور چہرے سے خوف صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ اور آج لوگ ہر شام پھول کر کے مسجد امام کی جگہ ان کے بیٹے محمد زین کے پاس آتے ہیں کیونکہ بابا کے بعد گدی میں نے سنبھال لی تھی۔

عشق ناگن

ایم الیاس

قسط نمبر: 12

جاهت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کا احاطہ کرتی دلگداز کہانی

اپنی دنیا اپنی ہی ہوتی ہے۔ آکاش کو بے اختیار اپنی دنیا یاد آ گئی تھی۔

اسے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ وہ اپنے جیسے انسانوں سے نہ جانے کتنی دور ایک نئے جہان میں آ چکا تھا۔

معلوم نہیں اوڈی نگر سے اس کی واپسی ہوتی بھی ہے یا نہیں...... اسے اپنی واپسی ناممکن سی دکھائی دینے لگی تھی...... اس لئے کہ اس کی دنیا میلوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں کی مسافت پر واقع تھی۔

اسے نیلم یاد آ گئی...... جو اپنی دنیا سے دور کالی دنیا میں جو کالی راج دھانی...... جزیرہ کالی بھون...... اجل بھوی بھی کہلاتی تھی وہاں قید تھی...... اور وہ حالات کے رحم و کرم اور اس کی چکی میں پستا ہوا اوڈی نگر میں پناہ لینے جا رہا تھا...... جب اس نے اس بات کو جذباتی کیفیت میں محسوس کیا کہ اس کی دنیا جو بہت دور ہو گئی ہے تو اس پر گھبراہٹ اور ان جانے خوف نے اسے جیسے اپنی گرفت میں لے لیا...... اذیت کی تنہائی اور اجنبیت اس کے ذہن پر مسلط ہونے لگی۔

اس نے دیکھا کہ یہ سفر طویل ہوتا جا رہا ہے جیسے دنوں نہیں بلکہ مہینوں کا ہو...... گپھا کسی شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی جا رہی تھی...... اس پر جو وحشت طاری تھی اس سے ایسا لگ رہا تھا اس کا دم گھٹتا جا رہا ہو...... اور دہشت تھی کہ کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔

اسے اس بات کا کوئی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس ہولناک سفر کا انجام کیا ہوگا......؟ اس لئے وہ بے یقینی اور تذبذب کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اس نے اس وقت سکون اور اطمینان کا گہرا سانس لیا جب اس نے دیکھا گپھا دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہوئی نظر آئی۔

اس مقام پر گپھا کی چوڑائی بہت زیادہ ہوتی گئی تھی اس کے باعث پانی کے بہاؤ کی رفتار میں کمی آتی گئی تھی۔ ناگ رانی اور شگفتہ بانہ پاؤں چلاتی ہوئی ایک کنارے سے جا لگیں اور جب اوپر اٹھتے اٹھتے وہ تینوں اس جگہ پہنچے جہاں وہ گپھا دو حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی تو وہ دونوں اپنے اپنے پیروں پر زور دے کے پوری قوت سے اچھلیں اور پھر وہ تینوں ایک حصے میں جا پڑے۔

پھر جب آکاش نے خشک اور پتھریلی زمین پر گر کے خود کو پانی سے باہر محسوس کیا تو مسرت اور خوف سے پیوستہ چیخ اس کے حلق سے آزاد ہو گئی۔ وہ گپھا اس کے لئے ایک حیرت انگیز تجربہ تھی۔ زور و شور سے بہتا پانی اس

کے ایک حصے میں اوپر اٹھتا جا رہا تھا اور دوسرا حصہ جس میں دونوں کودے تھے...... پانی پر کسی رکاوٹ کے بغیر خشک اور پانی کے بہاؤ سے محفوظ تھا۔ خشکی پر قدم رکھتے ہی اس کا سانس تیز ہونے والا معتدل پر آتا گیا۔

"آکاش جانی...... اٹھتے بادھو...... ہم صحیح سلامت ادنی نگر پہنچ گئے...... یہ ایک سپنا سا لگ رہا ہے......"

امرتا رانی نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا تھا اور پھر اس نے آکاش کو اپنی مرمریں گداز اور سڈول باہوں کے حصار میں لے لیا۔

"مجھے کس قدر کٹھن...... اذیت اور تکلیف ہوئی میں بیان نہیں کرسکتا، کس قدر ہولناک سفر تھا...... میں یہ کہوں کہ یہ موت کا سفر تھا تو غلط نہ ہوگا۔"

پھر آکاش چونک کر جذبات کی افراتفری سے نکل آیا...... اس وقت گپھا میں سمندری پانی کے طوفانی اتھاؤ میں سے سینکڑوں جل ناگ شوں...... شوں کی آوازوں کے ساتھ اچھل اچھل کے گپھا کی خشک شاخ میں آنے لگے...... ان میں سے ایک قدرے بڑا امرتا کے پیروں تک آیا اور اپنا سر اس کے گورے گورے قدموں پر رگڑا...... پھر اس کے سڈول مرمریں عریاں پنڈلیوں پر سر اٹھاتا ہوا اوپر کی جانب رینگنے لگا......

وہ جل ناگ بدستور پنڈلیوں پر اوپر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

سنگیت ایک طرف کھڑی ہوکے ان کی جانب بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری سی آگئی۔ پھر آکاش بولا۔

"امرتا رانی...... یہ کیا بے ہودگی ہے......؟" پھر اس نے جل ناگ کی طرف اشارہ کیا جو اس کی پنڈلیوں پر رینگ کے اوپر کو بڑھتا جا رہا تھا۔ "یہ کیا حرکت کرنے والا ہے......؟ کیا تم اسے روک نہیں سکتی...... اپنے لباس کا انتظام کرو۔"

امرتا رانی نے اپنے شاخِ گل جیسے بدن کو جھٹکا دیا تو وہ ندیدہ جل ناگ زمین پر اس طرح گر گیا جیسے امرتا رانی کے بدن نے برقی جھٹکا دیا ہو...... پھر وہ کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ پھر اس نے فضا میں دو مرتبہ اپنے ہاتھ کو بڑے عجیب اور پراسرار انداز سے حرکت دی۔ اور پھر شاید کوئی منتر پڑھ کر پھونکا۔

دوسرے لمحے آکاش نے حیرت سے دیکھا...... سنگیت اور امرتا رانی کے عریاں بدن قیمتی لباسے میں ملبوس ہوگئے۔ وہ جان نہ سکا کہ یہ لباسے کیسے اور کہاں سے آئے تھے۔ جنہوں نے چشم زدن میں ان کے عریاں جسموں کی پردہ پوشی کردی تھی۔

"یہ ادنی نگر کی جل کماری کا اکلوتا اور چہیتا بیٹا ہے......" امرتا رانی نے زمین پر گرے ہوئے جل ناگ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بہت شریر بلکہ بے باک اور ندیدا بھی واقع ہوا ہے...... ابھی اسے انسانی روپ بدلنے کی شکتی نہیں ملی ہے...... میں اصل روپ میں ہوتی ہوں تو بڑی مستی اور شوخیاں اور جذباتی حرکتیں کرنے سے باز نہیں آتا ہے...... میں لڑکی کے روپ میں آجاتی ہوں تو اسے دیوانگی کا دورہ پڑجاتا ہے...... محبت کے اظہار حد سے تجاوز کرنے سے باز نہیں رہتا لیکن میں اسے باز رکھ دیتی ہوں۔"

آکاش نے امرتا رانی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے جل کماری کے اس اکلوتے بیٹے کو دیکھا۔ آکاش کو اس کی رنگین مزاجی اور بے باکی اور من مانی کی حرکتیں بڑی زہر لگی تھیں۔ اور پھر اس نے اپنے دل میں اس کے لئے حسد و جلن کا جذبہ محسوس کیا تھا۔ کیوں کہ امرتا رانی نے بڑے رومانی انداز سے اس کا تذکرہ کیا تھا۔

"اس گپھا کی یہ سوکھی شاخ ادنی نگر کی ابتدا ہے...... اور اب ہم ذرا دیر میں پہنچ جائیں گے...... جل کماری بڑی بے کلی سے میرا انتظار کررہی ہوگی......؟" امرتا رانی بولی۔ "میری راہ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں گی۔"

ان کی سواگت کو آنے والے جل ناگ انہیں خشکی تک پہنچانے کے بعد اب تیزی سے شمال کی سمت بڑھ چکے تھے...... جل کماری کا بیٹا بھی ان کے ساتھ چل پڑا تو

آکاش نے اپنے دل میں ایک عجب سی خوشی محسوس کی...... اس نے سوچا کہ اسے رقیب روسیاہ بننے کی کیا ضرورت تھی...... امرتا رانی خود مختار ہے...... اس کی زندگی میں قرب، محبت اور رقابت سے جانے کتنے سرفراز ہو چکے ہوں...... اور وہ سرفراز کرتی رہتی ہوگی۔

"مجھے اندازہ نہ تھا کہ تمہارا مزاج بہت زیادہ وہمی اور شکی ہے......" کچھ دیر مسافت طے کرنے کے بعد وہ ہنس کے بولی۔

"حسن جب والہانہ اور وارفتگی سے فیاضی پر اتر آئے تو فساد کی جڑ بن جاتا ہے......" آکاش نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور تم اس سے میری نظروں کے سامنے بڑی رغبت سے پیش آ رہی تھیں......"

"تم سنددیا کو قصور وار نہ ٹھہراؤ میری جان!" وہ شوخی سے بولی۔ "ہمارے چلن، سوچ اور ہمارے دھرم اور رسموں سے بے حد جدا ہیں...... ان میں زمین آسمان کا تضاد ہے...... وہ بے چارہ مجھ سے بہت چھوٹا ہے اور تم بلاوجہ اس کی معصومانہ حرکتوں پر کڑھ رہے ہو؟"

"کون بے چارہ......؟" آکاش نے انجان بن کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

آکاش نے چلتے چلتے سنگیت کو تھوڑی دیر پہلے بازوؤں میں بھر کے من مانیاں کرتا ہوا مچل رہا تھا۔ سنگیت نے بھی خود کو اس کے حوالے کیا ہوا تھا...... آکاش نے گپھا میں تیرتے ہوئے سنگیت کو جو دیکھا تھا وہ اس کی نظروں میں رقصاں تھا۔

"اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ تم بڑے سنگ دل ہو...... لگتا ہے کہ تم شما کرنا جانتے نہیں ہو......؟"

امرتا نے اتنا کہہ کے سنگیت کو اس کے بازوؤں کے حصار سے کھینچ کے نکال لیا۔

"یہ کیا......؟" آکاش نے حیران ہو کے پوچھا۔

"اس لئے کہ تم میرے من کے دیوتا اور میں تمہاری پجارن ہوں۔" وہ آکاش کے سینے میں جذب ہوتی ہوئی بولی۔ "اب میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گی...... کیوں اب تو خوش ہو نا......؟" پھر اس نے بڑی گرم جوشی اور بڑے اعتماد سے اپنی محبت کا یقین آکاش کو دلایا۔ اس کے دل کی کدورت دور ہوگئی۔ پھر وہ ہنستے مسکراتے اوبی نگری کی طرف بڑھنے لگے۔

کچھ دیر بعد اس خشک سمندر میں گپھا نے ایک وسیع اور ہموار میدان کا روپ دھار لیا۔ بس اتنی سی کسر تھی کہ کھلے آسمان کے بجائے ہر طرف بڑی بڑی پتھریلی چٹانیں نظر آ رہی تھیں...... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بہت بڑے قدرتی غار میں سفر کر رہے ہوں۔ سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ اس گپھا میں روشنی کا کوئی مخرج نہ ہونے کے باوجود اجلی اجلی سی ٹھنڈی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ہوا ہونے نہ ہونے کے باوجود فضا میں فرحت انگیز تازگی رچی ہوئی تھی۔

"گپھا کے اس حصے کا دوسرا دہانہ کہاں کھلتا ہے......!" آکاش نے امرتا رانی سے سوال کیا۔

"دوسرا دہانہ......؟" امرتا رانی معنی خیز انداز سے ہنسی۔ "اس گپھا کا کوئی دوسرا دہانہ نہیں ہے...... آگے سے بند ہے...... اس کا بس وہی راستہ ہے جدھر سے ہم یہاں آئے ہیں۔"

"اور گپھا کی دوسری پانی والی شاخ کہاں تک جاتی ہے......؟" آکاش نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس بات کا کسی کو کچھ معلوم نہیں......؟" امرتا رانی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "وہ سمندر کی آغوش میں نہ جانے کہاں تک چلی گئی ہے...... وہ اتنی لمبی ہے کہ بہت سے جل ناگ اس کا دوسرا سرا تلاش کرنے اندر گھسے اور مہینوں تک رہنے پر بھی اس شیطانی گپھا سے نکل نہ سکے۔ اس پر اسرار دراز کے کارن سینکڑوں جل ناگ موت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں...... اور جو گپھا کی دوسری شاخ سے بچ کے لوٹے ہیں ان کی حالت اتنی خستہ اور بگڑی ہوئی تھی کہ ان کی زندگی زیادہ دن نہ رہ سکی۔"

سمندر میں سیلوں نیچے قدرت نے عجائبات اور اسرار کی ایک بالکل ہی انوکھی دنیا بسائی ہوئی ہے......؟ اوبی نگر آنے سے قبل اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ سینکڑوں فٹ سمندر کی گہرائیوں میں زندگی

کے ایسے اسرار...... انوکھے اور غیر معقول مظاہر دیکھنے ہوں گے......؟

"سمندر کا پانی گپھا کے اس حصے میں کیوں نہیں آتا......؟" کچھ دیر بعد آکاش کے ذہن میں ایک نئے سوال نے جنم لیا تو اس کی زبان پر آ گیا۔ وہ معنی خیز انداز میں ہنسی اور اس کا ہاتھ تھام کے اس کی پشت کو امرتا رانی چوستی ہوئی بولی۔

"اصل بات تو یہ ہے کہ شکتیوں کے نہ صرف پراسرار، عجیب و غریب اور نرالے کھیل ہوتے ہیں آکاش جی......! جب دیوتاؤں کی سہائتا ساتھ ہو تو گہرے ساگروں کی تہہ میں آگ کے الاؤ بھی جل اٹھتے ہیں...... تم یہ سوچ کر خود کو نہ الجھاؤ؟"

تھوڑی دیر بعد انہیں اس پر ہیبت، پرجلال اور بے حد وسیع و عریض گپھا میں عجیب قسم کے نوکیلے میناروں کی جھلکیاں نظر آئیں...... جیوں جیوں وہ آگے بڑھتے گئے۔ ان پتھریلے میناروں کی ساخت واضح ہوتی چلی گئی۔

وہ پتھریلی چٹانوں کے کئی کئی سو فٹ اونچے نوکیلے مینار تھے جن کی چوٹیاں گپھا کی چھت سے ذرا سی نیچے رہ گئی تھیں...... ان کی بدوضع اور بغیر تراشی ہوئی چٹانوں سے صاف ظاہر اور واضح تھا کہ ان میں کسی کی دستکاری کا کوئی دخل نہیں ہے...... بلکہ وہ کٹے پھٹے اور کہیں کہیں سے ٹوٹے پھوٹے مینار اپنی قدرتی حالت میں موجود ہیں...... اس کے ان میناروں میں جابجا سوراخ نظر آتے تھے...... مینار وسیع گپھا میں بے ترتیبی سے کافی دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان کے وسط میں ایک عالی شان محل کی جھلکیاں دکھائی دینے لگیں۔

"یہ کیا ہے......؟" آکاش نے مسحور سا ہو کے پوچھا۔

"آکاش جی...... ہوشیار...... خبردار...... ہم اوٹی نگر آ پہنچے ہیں۔" امرتا رانی سرگوشی کے انداز میں بولی تو آکاش کو اس کا لہجہ بے حد عجیب اور پراسرار سا لگا۔ اس نے محسوس کیا امرتا رانی بڑی محتاط سی ہے۔ "مجھ پر اور سنگیت پر اس دھرتی کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں...... پر تم یہاں ایک اجنبی نسل کے فرد ہو...... میں نہیں جانتی اور نہ ہی مجھے اس بات کا کوئی اندازہ ہے کہ گہرے ساگروں پر راج کرنے والی جل کماری تمہارے بارے میں کیا سوچے گی اور تمہارے لئے کیا حکم دے گی......؟"

امرتا کی ان باتوں سے اس کا وجود کانپ اٹھا تھا...... اس لئے کہ امرتا رانی...... جل کماری سے بنا اجازت لئے بغیر اس پراسرار راجدھانی کی سرزمین پر اسے لے آئی تھی...... وہ بظاہر یہاں پناہ لینے آیا تھا۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ وہ اس اوٹی نگر کی زمین پر آزاد رہے گا اس کالی دنیا کی راج دھانی کے بجائے اوٹی نگر کا قیدی بنا دیا جائے گا...... آکاش نے محسوس کیا کہ اب اس کی حیثیت ایک بے بس اور لاچار کھلونے کی سی رہ گئی تھی۔

"یہ جو تم سر بفلک نوکیلے مینار دیکھ رہے ہو یہ ناگ آشرم کے ہیں...... ان ساگروں میں بسنے والے لاکھوں جل ناگ بسیرا کرتے ہیں...... ان میناروں میں جو تمہیں سوراخ دکھائی دیتے ہیں...... ان میں ہر ایک سوراخ میں ایک جوڑے کا آشیانہ...... ان کے بیچ جو محل...... سیپیوں اور سچے موتیوں کا جو محل تم دیکھ رہے ہو وہی جل کماری کا راج بھون ہے...... جل کماری ساگروں میں رہنے والے تمام چھوٹے بڑے ناگوں اور ناگنوں کی مہارانی ہے...... جب سے جل اور دھرتی وجود میں آئی ہے جل منڈل کے سنگھاسن پر جل کماریوں کی حکومت چلی آ رہی ہے......"

امرتا رانی اسے آہستہ آہستہ اوٹی نگر کے ماحول اور پس منظر سے آگاہ کر رہی تھی...... اوٹی نگر کے کئی نام تھے...... ایک نام کالی راج دھانی بھی تھا...... نجانے کتنے اور ناموں سے یہ دنیا مشہور تھی۔

آکاش کو اچانک یہ خیال آیا کہ اس کی آزادی کے فیصلے میں شاید لمحوں کی دیر ہے...... نہ جانے اس کے مقدر میں امرتا رانی سے دوبارہ ملاقات بھی ہے یا نہیں......؟ نہ جانے وہ ناگ بھون سے اپنی پیاری بیوی نیلم کی رہائی دلا سکے گا یا نہیں...... پھر اس کے دل کے کسی کونے میں ایک ہولناک سا خیال آیا کہ...... "کہیں نیلم اس کا

برسوں انتظار کرنے کے بعد..... آخر ناگ راجہ کے ہوس اور ناپاک عزائم کی قربان گاہ پر اس کی عزت و آبرو کی بھینٹ چڑھ چکی ہو......؟"

غیر یقینی کی اس کیفیت میں اسے مایوسی کا سانپ آہستہ آہستہ وہی اذیت ناک ڈسے کر ڈس رہا تھا..... اس کے ذہن میں اپنی دنیا..... اور ماضی کے واقعات کسی فلم کے مناظر اس کی نظروں میں گھوم رہے تھے..... اسے نیلم کی زلف کا اسیر ہونے اور اپنی بستی اور مربنہ مندر تک کے واقعات اور قصے یاد آئے..... پھر اسے یاد آیا کہ اس نے گاڑی بان سے جب کالی راج دھانی کا نام سن کے وہ دہشت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

"امرتا رانی.....! کیا تم میری ایک بات کا جواب دینا پسند کرو گی......؟" آکاش نے کہا۔

"ایک گاڑی بان اس کی زبان سے کالی راج دھانی کا نام سن کے دہشت سے بے ہوش کیوں ہو گیا تھا......؟"

"پوری دھرتی پر ناگوں کے علاوہ صرف نیکی کے سنیاسی سادھو کالی راج دھانی یا اونی نگر اور حقیقت سے آگاہ ہیں لیکن وہ کسی کو دانستہ اس کے محل وقوع کے بارے میں اس لئے نہیں بتاتے ہیں کہ لوگ اپنی جان جوکھم میں نہ ڈالیں..... اس لئے انہوں نے تمہیں نہیں بتایا..... وہ صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ تمہارا عشق نیلم سے کتنا سچا ہے..... ورنہ وہ تو تمہیں ایک لمحے یہاں غائبانہ پہنچا سکتے تھے..... وہ دنیا میں نیکی کی آدرش کے لئے ساری دنیا کی خاک چھانتے رہتے ہیں..... انہوں نے تم پر ایک عنایت کی۔ وہ یہ کہ منکا دے کے..... اور ہاں مربنہ مندر کے اطراف میں اونی نگر کے دیوتا راجہ نے ایک منتر کا جال پھیلا رکھا ہے کہ وہاں جو کالی راج دھانی یا..... اونی نگر کا نام لے گا وہ ناگوں کی اس دھرتی کے چالاک رکھوالوں کے قہر کا نشانہ بن جائے گا اور جو بھی یہ نام سنے گا وہ منتر کے اثر سے پاگل ہو کر خود اپنی جان ہلکان کرلے گا یا پھر مر جائے گا..... اس گاڑی بان نے وہ نام سن کے اپنی جان بچا لی اور بیلوں کو ایک کالے ناگ نے ڈس لیا..... تم بار بار کالی راج دھانی کا نام لینے کے باوجود اس لئے بچے رہے کہ منکے نے تمہاری حفاظت کی..... ان ویرانوں میں کالی راج دھانی کا نام بھیانک موت لے کر ابھرتا ہے تاکہ تمہاری دنیا کے باسیوں کو اس نام کی ہوا تک نہ لگے..... وہ اس راج دھانی کو خفیہ رکھنا چاہتے ہیں....." اتنا کہہ کر امرتا رانی نے گہرا سانس لیا اور خاموش ہو گئی۔

"لیکن تمہارے ناگ راجہ نے مربنہ مندر کے اطراف ہی میں منتر کا جال کیوں ڈال رکھا ہے......؟" آکاش نے سوال کیا۔ امرتا رانی نے وضاحت سے جو بتایا تھا اس نے آکاش کے رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑا دی۔

"یہ ایک راز ہے۔ جس پر سے پردہ اٹھانے کے لئے مجھے مجبور اور پریشان نہ کرو؟" امرتا رانی نے اس کی منت بھی کی۔

آکاش جان کہ کسی بھی لمحے پیش آنے والے غیر یقینی حالات کے خوف سے پریشان اور متفکر تھا..... زندگی اور آزادی کی جانب سے اسے خود غرض اور سرد مہر بنا کے رکھ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ امرتا رانی جوں کہ اس کے عشق میں پاگل ہے وہ یہ راز اس سے پوشیدہ نہیں رکھے گی۔ اسے رام کرنے کے لئے اس نے امرتا رانی کو بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مہر محبت بڑے جذباتی انداز سے ثبت کر کے بولا۔

"کیا تمہیں میری محبت پر بھروسا نہیں ہے......؟ تمہارے عشق نے مجھے کیسا اسیر بنا لیا ہے..... پھر بھی بتانا نہیں چاہتی ہو......!"

"دراصل اونی نگر کے دو راستے ہیں......؟" امرتا رانی نے اس کے عشق میں خود کو مجبور اور بے بس پا کے راز اگل دیا۔ "وہاں جانے والا ایک راستہ مربنہ مندر سے شروع ہوتا ہے......"

یہ انکشاف آکاش پر بجلی بن کے گرا..... اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے..... اس کا سر چکرایا تو لمحے بھر کے لئے اس کی نظروں کے سامنے ایک دھند سی چھا گئی۔

وحند چھٹی تو اس نے بڑے کرب سے سوچا..... وہ اپنی منزل سے اس قدر قریب ہو کے اوٹی نگر کے ناقابل حصار کے جال میں کسی ماہی آب کی طرح آ پھنسا تھا۔

پھر اس نے پاگلوں کی طرح امرتا رانی کو بری طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا..... آخر اس بات کو راز کیوں رکھا.....؟ میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے مرہٹہ مندر کے راستے کالی راج بھوانی میں جا گھستا..... میری نیلم، میری جانی..... وہاں پامالی سے قبل حسرت، کرب ناک اذیت اور بے بسی سے میرا انتظار کر رہی ہے..... امرتا رانی..... تم اتنی خود غرض اور سفاک اور بے رحم نکلی..... میں خواب وخیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا.....؟"

اس نے آکاش کے چہرے پر درندگی اور آنکھوں میں سفاکی اور چنگاریاں دیکھیں تو آکاش کی اس وحشت پر وہ سراسیمہ ہو گئی اور ایک دل خراش چیخ مار کے اس کی آغوش سے بجلی کی سی سرعت سے نکلی اور قدرے دور جا کھڑی ہوئی۔

"میری جان آکاش.....! ہوش کی دوا کرو..... مجھے خود غرضی کا الزام نہ دو..... میں تمہاری دشمن نہیں ہوں..... اگر میں نے فوری تدبیر اور دور اندیشی نہ کی ہوتی تو وہ مکار شیش ناگ تمہیں چیونٹے کی طرح مسل دیتا....."

آکاش کا جوش، نفرت اور غصہ اس کی التجا بھری آواز سے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا..... امرتا رانی کی درد بھری آواز نے اس پر فوراً اثر کیا۔ امرتا کی نگاہوں کی پراسرار مقناطیسی قوت جس نے اسے اشتعال کر دیا تھا۔

وہ ایک دم نقاہت محسوس کرنے لگا۔

اسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار سا لگا۔ وہ چکرا کے گرنے والا تھا کہ سنگیت نے لپک کے اپنی نرم اور گداز آغوش کا سہارا دیا اور اپنے رسیلے شیریں ہونٹ آکاش کے لبوں میں پیوست کیے تو آکاش نے قدرے توانائی سی محسوس کی..... پھر وہ اسے لے کے امرتا رانی کے ہمراہ سونے اور موتیوں کے اس محل کی طرف بڑھنے لگی جہاں جل کماری اس کی قسمت اور آزادی کا فیصلہ کرنے کے لیے منتظر بیٹھی تھی۔

آکاش کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دونوں اسے تختہ دار کی طرف کشاں کشاں لے جا رہی ہوں..... اس کا جی چاہا کہ وہ ان دونوں کو جھٹک کے واپس بے تحاشا بھاگ پڑے اور دونوں پہاڑوں کے سنگم پر سمندر کے دھاڑتے ہوئے سرکش ریلے میں کود پڑے، خواہ اسے اپنی جان سے ہی کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے..... اس ذلت آمیز اور اذیت ناک زندگی سے موت بہتر ہے۔

لیکن اس میں اتنی سکت باقی نہیں رہی تھی..... یوں لگ رہا تھا جیسے مایوسی اور ناامیدی کے غلبے نے اس کی قوت نچوڑ دی ہو..... وہ دونوں اسے کشاں کشاں جل کماری کے راج بھون کی طرف لے جا رہی تھیں..... جنگلز دس فٹ اونچے ناگ آشرم اب پوری طرح آشکار ہو چکے تھے اور آنے والی نحوستوں کے تصور سے اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا.....

کشاں کشاں امرتا رانی اور سنگیت اپنے قرب اور لمس اور میٹھی باتوں سے جیسے اس کی توانائی میں اضافہ کر رہی تھیں..... لیکن یہ سب بے سود تھا..... کوئی اور موقع ہوتا تو وہ خوب لطف اور کیف محسوس کرتا..... امرتا رانی اور سنگیت کے ہمراہ اوٹی نگر کے ان نوکیلے جناروں اور سیپ و موتیوں کے محل سے فاصلہ کم ہونے لگا تھا۔ وہاں جو ناگ آشرم کہلاتے تھے۔

سنگیت نے دیکھا کہ امرتا رانی بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کے آکاش کے قریب آ گئی کہ وہ امرتا رانی کے چہرے پر ان جانے خوف کے سائے دیکھ کے حوصلہ نہ ہار دے..... اس کے بدن کا خمار انگیز لمس اسے ان ڈر اور خوف آور لمحات میں بھی پریشان کرنے لگا۔

"اوٹی نگر کی دھرتی اس قدر خطرناک ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے..... یہاں تمہیں ہر قدم پھونک پھونک کے رکھنا اور ہر پل ہشیار رہنا پڑے گا۔" سنگیت نے اس کے کان کے پاس منہ لا کے سرگوشی کی تو اس نے چونک کے دیکھا۔

"بات یہ ہے کہ جل کماری کے سپوک اور اونی نگر کے محافظ بڑے مکار، کمینے اور دغا باز ہیں...... یہ بات تم ذہن میں رکھنا......" سنگیت نے اسے اپنی طرف متوجہ پا کے اپنی بات کی مزید وضاحت کی۔

اس وقت آکاش کی ذہنی کیفیت ہراساں سے بڑی ابتر ہو رہی تھی۔ اپنی اس غیر متوقع قید اور اس سمندر دنیا کی اجنبیت اور ناواقفیت نے اسے بہت زیادہ وحشت زدہ کیا ہوا تھا۔ سنگیت کی باتوں نے اسے ایک طرح سے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنگیت کی بات پر کچھ کہتا...... امرتا رانی چونک کے اس کی طرف متوجہ ہو کے بولی۔

"میرے پیارے آکاش...... اس بات کا خیال رکھنا کہ اب ہم اونی نگر کی دھرتی پہ موجود ہیں...... اور جل کماری سے کسی قسم کا کوئی بیر مول لے کے زندہ نہیں رہ سکتے...... تم تو پھر بھی منش ہو...... یہاں تو طاقت ور جل ناگ جو ہیں چھوٹے اور کمزور ناگوں کو بغیر ڈکار لیے ہضم کر جاتے ہیں...... اپنی زندگی اور جان کی تمنا اور آرزو چاہتے ہو تو تمہیں راج کماری کی ہر بات کا پالن کرنا ہوگا...... تھوڑے دنوں کی بات ہے...... بہت جلد اونی نگر سے نکلیں گے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ جل کماری ہمیں زندہ اور آزاد رہنے دے گی......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے کہ میں ایک منش ہوں......"

"اس دنیا میں کسی بات کا کوئی وشواش نہیں کیا جا سکتا...... میں یہ بات جو کہہ رہی ہوں اپنی سوچ کے مطابق۔" امرتا رانی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اب وہ اونچے اونچے ناگ آشرم بالکل سامنے آ چکے تھے...... ان میں مختلف قسم کے بے شمار سوراخ بنے ہوئے تھے اور ہر آشرم کے ہر سوراخ سے گول گول، بڑی بڑی اور خوفناک آنکھوں والے وحشی جل ناگ سر نکالے جھانک رہے تھے...... ان کی سلگتی ہوئی آنکھیں اسے اپنے وجود کی گہرائیوں میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

وہ پہلے آشرم کے قریب سے گزرے تو آکاش کا بدن خوف سے لرزنے لگا۔ اس کے بدن کا بند بند کانپنے لگا...... اسے ہر آن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں کوئی وحشی جل ناگ اس پر یک لخت حملہ آور ہو جائے۔

سمندری گھاس کی خشک شاخ کی کشادہ ترین جھیل میں چلتے ہوئے اس کے ذہن میں لاشعور کی ہمہ گیر اور بعید از فہم کارفرمائیوں کا گہرا احساس نمایاں تھا...... دنیا میں بسنے والے اس کے ہم نسلوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ سمندروں کے اندر کی مخلوق ایسے حیرت انگیز جھول میں بستی ہوگی۔

آہستہ آہستہ جل ناگوں سے لدے تین آشرم وہ پیچھے چھوڑ آئے اور اب چوتھے دیو ہیکل سنگی مینار کے قریب سے گزر رہے تھے جس کی چوٹی کے قریب والے سوراخ میں ہم کے بل ایک چپٹا سا اور بہت لمبا جل ناگ لٹکا ہوا تھا۔ اس کا کم از کم چالیس پچاس فٹ لمبا جسم لہریں لے لے کر نسی نفت اور لچکیلی بید کی طرح خلا میں جھول رہا تھا اور نہ جانے کتنا حصہ ناگ آشرم کے بنجر سوراخوں میں چھپے ہوئے آبی سانپ ذرا سے پیچھے سے نظر آتے تھے۔

اس لمبے جل ناگ پر نظر پڑتے ہی آکاش کے قدم غیر ارادی طور پر سست پڑنے لگے اور اس پر وحشت سی سوار ہونے لگی...... اس کی حس اسے جل ناگ کے قریب سے گزرنے سے روک رہی تھی۔

"ایسا لگ رہا ہے کہ تم ڈر گئے ہو؟" امرتا رانی نے اس کی سست رفتاری کو دیکھ کے پوچھا۔

"ہاں......" آکاش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "یہ لمبا جل ناگ مجھے بے حد خطرناک لگ رہا ہے۔"

امرتا رانی کی پیشانی کی شکنیں گہری ہو گئیں۔ وہ متفکر سے ہو کے بولی۔

"میں بھی سوچ رہی ہوں کہ یہ اپنے بل سے باہر کیوں نکل کے جھول رہا ہے...... اس سے نہ ڈرو...... بس تم اپنا من مضبوط رکھو...... جل کماری کی آگیا کے بغیر کوئی جل ناگ تم پر وار نہیں کر سکتا...... اگر کسی نے ایسی بھول کی تو وہ نشٹ ہو کے رہ جائے گا......"

"رانی جی......! ذرا اس کی طرف دیکھیں...... مجھے

اس کے تیور بڑے خطرناک اور جان لیوا قسم کے لگ رہے ہیں۔" سنگیت کے لہجے میں ایک نامعلوم سا خوف چھپا ہوا تھا۔ "اگر یہ جل ناگ سرکشی اور بدمعاشی پر اتر آیا تو ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کرسکتے کہ وہ راج کماری کی شرپہ کر رہا ہے...... شاید راج کماری کے من میں فتور آ چکا ہے...... اس لئے کہ جل ناگوں کا یہ سنسار کسی اجنبی کو سویکار کرنا نہیں چاہتا ہے......؟"

امرتا رانی کے دل کو سنگیت کی لگی تھی اور اس نے ایک صدمہ سا محسوس کیا تھا...... جب اس نے آکاش کو اپنی غزالی آنکھوں میں جذب کیا تو ان کے افق تا افق محبت کے وہ صاف شفاف آب دار موتی موتی دمک رہے تھے اور اس کی ترنم کی آواز فرط جذبات سے بھرائی ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

"میری جان آکاش جی......! میرے من کے دیوتا......! ناگ راجہ کی وجہ سے اولی نگر کی کٹھنائیاں بہت آسان ہوں گی...... اگر کسی وجہ سے میرے جیون نے تمہارا ساتھ نہ دیا تو میں تمہاری آتما کو پکارتی رہوں گی...... اگر میرے بھاگ تمہاری سیوا نہیں تو میں تمہیں وچن دیتی ہوں کہ تم اگلے جنم میں بھی اپنی امرتا رانی کو انتظار کرتا پاؤ گے...... میرا عشق تم پر نچھاور ہو جائے گا...... آج ہی کی طرح......"

امرتا رانی کے اس جذبہ عشق نے اس کے من میں امرت بھر دیا تھا...... وہ ایک لمحے کے لئے یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا یہ جذبہ عشق ہوتا کیا ہے......؟ انسان اور حیوان اور سوزی جانور میں بھی اس طرح محسوس کیا جاتا اور جنم لیتا ہے جیسے انسانوں میں جن میں جذبات اور احساسات بھی ہوتے ہیں...... امرتا رانی کے من میں اس کے لئے عشق کی جو مشعل فروزاں تھی اس کی تپش نے اسے جیسے پگھلا کے رکھ دیا تھا...... اس کا وجود عجیب سے احساسات اور جذبات سے معمور ہو رہا تھا۔

لیکن اس نے سوچا اور اس بات کو محسوس کیا اس کے وجود میں عشق کی وہ مشعل روشن نہیں ہے جو امرتا رانی کے دل میں ہے...... وہ تو اس کے لئے ایک کھلونا تھی جس سے کھیلتے ہوئے اس نے جسمانی آسودگیوں اور لذتوں کے سوا کوئی قلبی لگاؤ محسوس نہیں کیا تھا...... وہ ایک مہربان اور فیاض ساتھی تھی...... وہ نیلم سے جو محبت کرتا تھا وہ اسے تقسیم کر کے امرتا رانی پر نچھاور کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ کیا تھا...... لیکن امرتا رانی کے اس جذبہ عشق نے اس کے دل کے ساز کو چھیڑا تو اس کے جذبات میں ایک طوفان نے جنم لے لیا۔ پھر اس نے امرتا رانی کو اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں جکڑ لیا اور اس کے چہرے پر جذباتی انداز سے جھک گیا۔

"میرے دیوتا...... میری جان......! میرے عشق......!" امرتا رانی کی آواز جذبات میں ڈوب رہی تھی...... میں تمہاری باندی ہوں...... اگر اولی نگر میں تم پر کوئی بپتا آن پڑی تو میری آشاؤں کے دیپ بجھنے لگیں گے...... میری آتما کی ٹھنڈک بکھر جائے گی...... مجھے بھینچ لو...... تاکہ ہم دونوں ایک شریر میں بن جائیں......" وہ جذبات کی رو میں بہہ رہی تھی...... بے ربط الفاظ اس کے منہ سے ہوا کی طرح نکل رہے تھے۔

"امرتا رانی......! خود کو قابو میں رکھو...... یہ ہوا کی تمہیں جذبات کی رو میں بہا کے لے جا رہی ہے......"

سنگیت نے آگے بڑھ کے امرتا رانی کو آکاش سے جدا کرنے لگی جو آکاش کے جذبات سے کھیلنے لگی تھی۔

معاً آکاش کی نگاہیں سنگیت کے چہرے کی طرف اٹھیں تو اس نے محسوس کیا کہ سنگیت کی بڑی بڑی کول کول آنکھوں کی تہوں میں امرتا رانی کے لئے حسد، رقابت اور ناپسندیدگی کا دبا دبا جذبہ نفرت ابھر آیا تھا، وہ خود بھی اس سپردگی سے پیش آنا چاہتی تھی۔ آکاش نے امرتا رانی پر شباب گداز بدن پر بازوؤں کی گرفت نرم کردی۔

پھر امرتا رانی کسمسا کے آکاش کے جسم سے الگ ہوگئی...... آکاش نے محسوس کیا کہ سنگیت کی یہ دخل اندازی اسے بڑی گراں اور ناگوار لگی ہے...... اس لئے اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

چوں کہ آکاش اس وقت سخت پریشانی میں مبتلا اور متفکر تھا اس لئے ان کی باہمی چپقلش اور رقابت پر

توجہ نہ دے سکا۔ ورنہ وہ سنگیت کو خوش کر دیتا۔۔۔۔۔ سنگیت کا دل توڑنا اسے گوارا نہ تھا۔ وہ بھی تو بلا کی پرکشش اور قیامت خیز تھی۔ سمندر میں تیرتے وقت سنگیت کے جلووں اور عنائیوں نے تڑپایا تو وہ سنگیت کے قرب سے سرفراز بھی ہوا تھا۔

اس لمحہ اس کی ساری توجہ اور قوت فضا میں تیرتے جھولتے ہوئے جل ناگ پر مرکوز تھی۔

پھر اس کے قدم تیزی سے آگے بڑھنے لگے تھے۔۔۔۔۔ جیسے کوئی نادیدہ۔۔۔۔۔ ماورائی اور مقناطیسی قوت اسے جبر و زیادتی سے اس ناگ آشرم کی جانب کھینچ رہی ہے۔۔۔۔۔ جس کے ایک سوراخ میں وہ لمبا اور کینہ پرور اور خبیث جسم کا جل ناگ لہرا لہرا کے گھور رہا تھا۔

اس بے یقینی اور تذبذب کے چند لمحے اور گزرے۔۔۔۔۔ پھر وہ اس ناگ آشرم کے قریب پہنچ گیا۔

امرتا رانی اور سنگیت۔۔۔۔۔ اس کے دائیں اور بائیں جانب تھیں۔۔۔۔۔ اس کے قریب پہنچتے ہی اس جل ناگ نے برق رفتاری سے فضا میں اپنا جسم لہرایا اور اس کا پھنکارتا ہوا پھن اس کے سر پر سے ہوتا ہوا گزر گیا۔۔۔۔۔

اس کے ساتھ ہی پوری کی پوری فضا وحشت کی پھنکاروں سے گونج اٹھی۔ ناگ آشرموں میں چھپے ہوئے تمام جل ناگوں نے ہم آہنگ ہو کے دبی دبی پھنکاریں ماری تھیں۔۔۔۔۔ فرط خوف سے اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔۔۔۔۔ موت اس کے سر پہ گردش کر رہی تھی۔ اجنبی دنیا میں شاید پراسرار قوتوں کے ہاتھوں مارا جانا اس کے مقدر میں لکھا تھا۔

لمحہ بھر توقف کے بعد اس جل ناگ نے دوسری مرتبہ اپنا بدن لہرایا تو پہلے کی نسبت اس میں زیادہ شدت تھی اور پھر اس دفعہ اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ اسے اپنے پھن میں لپیٹ کے زمین سے اٹھا لیا اور پھر اوپر کی طرف اٹھاتا چلا گیا۔۔۔۔۔ وہ نہ تو تڑپ سکا اور نہ ہی مچل سکا۔۔۔۔۔ اس کی چیخ تھی کہ حلق میں دم توڑ گئی۔۔۔۔۔ اس کی ساری قوتیں وحشت اور شاید ان دیکھی پراسرار دوا کی تاثیر کے سبب مفلوج ہو چکی تھیں۔

آہستہ آہستہ اس جل ناگ کا موٹا مگر لچکیلا بدن آشرم کے سوراخ میں بھی اسی طرح اترتا جا رہا تھا جیسے دلدل میں دھنستا جا رہا ہو۔۔۔۔۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ اسے اپنی گرفت میں جکڑے اس کشادہ سوراخ میں گھس جائے گا۔

آخر آکاش کو ناگوں کے پھنکارتے زہریلے اندیشے درست نکلے۔۔۔۔۔ وہ جل ناگ اپنا پچھلا دھڑ اس سوراخ میں داخل کر چکا تھا اور اب اس کی باری تھی۔ اس وقت آکاش کی جو کیفیت تھی بڑی عجیب و غریب اور ابتری تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ زندہ کیوں ہے۔۔۔۔۔؟ کیا وہ واقعی زندہ ہے۔۔۔۔۔؟ کیا زندہ انسان کی ایسی حالت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ وہ اس طرح سے سب کچھ دیکھ اور محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے ہوش و حواس بحال ہوں۔۔۔۔۔ جل ناگوں کی ملی جلی مسرت آمیز پھنکاریں سن رہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن اس کا وجود اس کے بس اور اختیار میں نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ نہ تو اپنے جسم میں اپنی مرضی کے مطابق جنبش دے سکتا تھا اور نہ ہی اس کی قوت گویائی کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کی حالت ایک گونگے کی سی تھی۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ وہ کسی طلسم کے شکنجے میں کسا۔۔۔۔۔ سکڑا سہما ہوا تھا۔ اس موذی جل ناگ کی گرفت نے اسے بری طرح بے بس کر دیا تھا۔

آخر اس کے بدن کو بجلی کا جیسا شدید جھٹکا لگا اور اس نے خود کو اس جل ناگ سمیت زمین سے پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی پر اس ناگ آشرم کے کشادہ سوراخ میں گھستے دیکھا۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حواس پر تاریکیوں کی گہری کہر چھاتی چلی گئی۔۔۔۔۔ اسے جیسے کسی بات کا کوئی ہوش نہیں رہا۔۔۔۔۔ البتہ ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر جیسے بے رحم موت کا غلبہ طاری ہو رہا ہے اور وہ ایک اذیت ناک عذاب سے گزر رہا ہو۔۔۔۔۔ پھر یہ کیفیت بھی اسے بے حس کر گئی۔

وہ کتنی مدت تک اس کیفیت کے عالم میں رہا۔۔۔۔۔ چند گھڑیاں۔۔۔۔۔ ساری رات۔۔۔۔۔ سارا دن۔۔۔۔۔ یا پھر پورا ایک ہفتہ۔۔۔۔۔؟ جب اس کے حواس کا طلسم ٹوٹ کے بکھرا تب اس کی سماعت میں انسانی مخلوق کے ہنسنے بولنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں اس نے کانوں میں سنیں۔۔۔۔۔

اسے اپنی سماعت کا فتور کا دھوکا ہوا...... اسے لگا کہ وہ کوئی سپنا سا دیکھ رہا ہے...... پھر اس نے نشے کی سی حالت میں ...... چشم تصور میں دہشت ناک واقعات لہرانے لگے...... پھر اس نے ہوش میں آتے ہوئے محسوس کیا تو ہڑبڑا کے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھلتے ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ کوئی جاگتے میں کوئی سندر سا سپنا دیکھ رہا ہے۔

اس نے خود کو راجہ اندر کی ایک انوکھی اور حسین سبھا میں پایا۔

مشرقی انداز کی یہ سبھا ایک حقیقت تھی...... اس پر کسی راجہ اندر جیسے دربار کا گمان ہوا تھا۔ ہر طرف خوبرو مرد اور فتنہ خیز دوشیزائیں آب و تاب دکھا رہی تھیں...... موتیوں اور سیپیوں سے سجے اس کشادہ دربار کے آخری سرے پر ایک بلند مخملی مسند بچھی ہوئی تھی جس پر ایک عورت تاج سجائے بیٹھی تھی۔

آکاش مسحور سا ہو کے اندر سبھا کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے اپنے بدن میں چٹکی بھری کہ کہیں یہ سپنا تو نہیں ہے...... لیکن یہ حقیقت تو سپنے سے بھی کہیں سندر تھی......

وہ سحر زدہ سا تھا کہ کسی نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کے سہارا دیا۔ اس نے چونک کے سر گھمایا۔ سنگیت اس کے قریب موجود تھی...... وہ دل میں حیران سا تھا کہ سنگیت اس قدر سراسیمہ کیوں ہے......؟ اس کے چہرے سے وہاں کرب کی گھٹائیں کیوں چھائی ہوئی ہیں اور پھر اس نے سنگیت کے اس بھرے ہونٹوں کو لرزاں دیکھا۔

”سنگیت جانی......! میں کہاں ہوں......؟ امرتا رانی کہاں ہے......؟ وہ نظر کیوں نہیں آ رہی ہے......؟“ آکاش نے حیران ہو کے پوچھا۔

”میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی......؟ مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہے...... یہ سب بھول جاؤ...... بس تم یہ جان لو کہ تم جل کماری کے راج بھون میں موجود ہو...... اور یہ سبھا تمہارے اعزاز میں سجائی ہوئی ہے......“

سنگیت نے رک رک کے بڑے دل گرفتہ انداز میں کہا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہے۔ کسی اور کی ایما پر......

”نیلے ساگروں کے باسی تمہیں آکاش جی...... اولی نگر میں خوش آمدید کہتے ہیں......“ مسند پر براجمان عورت نے جو نہایت حسین تھی اس میں بڑی تمکنت تھی اور اس کی رسیلی آواز جل ترنگ کی سی کھنک تھی......

”آکاش جی......! تم اپنے پہلے جنم میں اس سنسار کے سب سے حسین ترین...... وجیہہ اور بے پناہ کشش کے مالک تھے...... پہلے جنم میں، میں نے تمہاری سندرتا کی بڑی تعریف سنی تھی...... اور آج بھی سنتی آ رہی ہوں...... میں بتا نہیں سکتی تمہیں دیکھنے کے لئے کتنا تجسس اور اشتیاق تھا...... میں تمہیں سپنے میں دیکھتی تھی۔ ایک خیال پیکر تراش کے...... لیکن تم اس سے کہیں سندر ہو...... مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ...... تم بڑے شبھ سے اولی نگر آئے ہو...... کیوں کہ ان دنوں یہاں اگنی دیوتا کے پوتر کنڈ کی پوجا ہونے والی ہے...... تم بھاگ کے اچھے نصیب کے مالک ہو جو ان اگنی پوجا کے تہوار میں شریک ہو کے اپنے دکھوں سے چھٹکارا پا جاؤ گے......“

آکاش نے یہ سب کچھ بڑی خاموشی اور صبر و تحمل سے سنا۔ لیکن اندر سے اس کا دل دہل اٹھا...... وہ خوبرو بلکہ اسے اپنی زندگی سے نجات پا جانے کی جیسے نوید دے رہی تھی...... وہ اپنی موت کا یہ اعلان سن کے لرز اٹھا لیکن وہ اپنی رو میں کہتی جا رہی تھی۔

”آؤ...... میرے چاند جیسے آکاش جی......! یہاں میرے پاس میرے قریب آ جاؤ...... میں تمہیں جی بھر کے دیکھنا اور چھونا چاہتی ہوں...... دیکھو...... تم بھاگ کے کتنے سچے اور انمول ہو کہ راج کماری تمہیں اپنے راج سنگھاسن پر بلا رہی ہے...... آؤ...... میرے قریب آ جاؤ......“

اس نے ہاتھ فضا میں اٹھا کے دلربائی انداز سے اشارہ کیا...... اور وہ اس شیریں سخن حسینہ کے سحر میں جکڑا...... وہ لٹے لٹے ہوئے انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ سنگیت اس کے برابر میں چل رہی تھی...... اس کا قرب بڑا سہارا دے رہا تھا۔ اور اس نے آکاش کا ہاتھ

مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

جب وہ اس وسیع دربار میں مردوں اور نوخیز دوشیزاؤں کے ہجوم سے گزرتا اس مسند نشین دوشیزہ کے قریب پہنچا۔ اس کا وحشی حسن اس قدر پرجلال اور باتمکنت اور رعب دار تھا کہ اس کے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوسکی..... اس کے طول قامت اور تناسب بدن کی دل کشی، گوری گوری رنگت نے خدوخال کے نوکیلے ابھاروں سے مل کے قیامت کا سماں باندھ دیا تھا..... کھلی ہوئی لانبی لانبی سیاہ اور ریشمی زلفیں جسم کے فراز پر زندہ ناگنوں کی طرح بل کھا کھا کے مچل رہی تھیں..... جھیل سی گہرائی لئے نیلی نیلی بڑی بڑی آنکھوں اور پتلے پتلے رسیلے سرخ ہونٹوں کے آتشی خمار سے جنم جنم کی وہ پیاس جھلک رہی تھی جس کی تسکین کی خاطر ایک کمزور و ناتواں عورت پہاڑوں سے ٹکرا سکتی ہے..... اس کے ابھرے ابھرے گلابی رخساروں پر جذبات کی تمازت جو دہک رہی تھی جیسے وہ شعلوں کے کسی الاؤ کے سامنے بیٹھی ہو..... لیکن وہ خود کسی الاؤ سے کم کہاں تھی.....؟

"آجاؤ..... قریب چلے آؤ....." اس نے اپنا عریاں، مرمریں، گداز اور سڈول ہاتھ اٹھایا جو بے نیام خنجروں کی طرح چمک رہے تھے..... پھر اس نے کھنکتی ہوئی پر اثر آواز میں اسے مخاطب کیا۔ "رک کیوں گئے..... میرے من کے دیوتا آکاش جی!..... میں تمہارے قرب کے لئے تڑپ رہی ہوں، کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہورہا ہے.....؟"

پھر آکاش کے قدم آپ ہی آپ اس کی طرف اس طرح اٹھنے لگے جیسے یہ خنجروں کی سی باہیں..... ریشمی سیاہ زلفیں اور ہیجان خیز سراپا بھی اسے پاس آنے کے لئے انجانی دعوت دے رہا ہو..... ایک ایسی مقناطیسی کشش جو اسے کشاں کشاں مسند کے پاس لے گئی۔

پھر وہ اوپر مسند کے پاس پہنچ کے مسند پر جل کماری سے قدرے ہٹ کے اور سکڑ سمٹ کے گٹھری کی مانند بیٹھ گیا۔ لیکن آکاش کی نگاہیں اس کے حسین چہرے پر سے پل بھر کے لئے ہٹ نہ سکی تھیں، جن میں حیرت اور شوق کے ساتھ تجسس بھی تھا..... اس وقت اس کی کیفیت کسی ایسی بودی کی سی تھی جسے خاک پر سے اٹھا کے غیر متوقع اس شاہانہ مسند پر بٹھا دیا گیا ہو۔

"کیا بات ہے میرے پیارے دیوتا..... کیا خفا ہو جو مجھ سے اس قدر دور بیٹھے ہو.....؟" پھر جل کماری نے بڑی محبت سے اس کے اپنے درمیان کا فاصلہ کم کردیا..... وہ اس کے پاس کھسک آئی تھی اور پھر اپنا عریاں مرمریں بازو آکاش کی کمر میں ڈال دیا۔ اس لمحے آکاش کو یوں محسوس ہوا کہ بجلی کا ننگا تار اس کی کمر سے لپٹ گیا ہو..... اس کی نس نس میں حرارت سی بڑھ گئی اور خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔

راج کماری کی اس بے باکانہ حرکت پر آکاش نے بے چینی سے دربار پر نظریں ڈالیں..... پھر وہ جیسے چونک پڑا۔

اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا..... کیا اس نے وہ سپنا دیکھا تھا..... اس سبھا میں اس نے نوخیز دوشیزائیں اور وجیہہ اور دراز قد مردوں کو جذباتی عالم میں دیکھا تھا جو عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے نیاز تھے انہیں جیسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ والہانہ انداز اور خود سپردگی سے پیش آرہے تھے..... لیکن اب وہ بالکل خالی پڑا تھا..... نہ کوئی دوشیزہ تھی اور نہ ہی کوئی مرد..... ایسا لگتا تھا جیسے اس ہال میں کوئی تھا ہی نہیں..... وہاں صرف وہ تھا اور وہ سنگیت تھی۔ جس کی موجودگی کے بارے میں، راج کماری کو علم ہے یا نہیں..... اسے خبر نہیں تھی۔

"اوٹی نگر میں میری آگیا چلتی ہے۔ میرے من کے دیوتا..... میرے صرف ایک اشارے پر میرے جانثار محافظ اپنی جانیں بھینٹ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں..... پر میں تو تمہاری ایک ادنیٰ سی داسی ہوں..... تمہاری من موہنی صورت نے میرے من میں ہل چل سی مچادی ہے..... یوں لگتا ہے جیسے میری آشاؤں کو ہمیشہ سے تمہارے مضبوط شانوں کی تلاش رہی ہے..... تم مجھے وچن دو کہ اب میرے سوا کسی اور سے دل نہ لگاؤ گے.....؟"

یہ کہتے ہوئے جل کماری اس کے بازوؤں میں آ گری اور اپنا وجود اس کے سینے میں جذب کرنے لگی...... وہ بے نیام تلوار کی سی حالت میں تھی...... اس کا خمار سے دہکتا بدن اس کے وجود میں دبے ہوئے لاوے کو بھڑکانے لگا۔ اس کے ہونٹوں میں جو شیرینی تھی وہ اس نے سنگیت اور امرتا یا کسی اور عورت میں محسوس نہیں کی تھی...... اسے توقع نہیں تھی کہ جل کماری اسے غلاظت کے دلدل میں لے گرے گی۔ اب اس کے بس میں نہیں رہا تھا کہ جل کماری سے خود کو بچا سکے...... آخر کو وہ ایک مرد تھا...... مٹی کا تودہ نہیں تھا۔

جل کماری اس کی جھولی میں پکے پھل کی طرح ٹپک پڑی ایک کھلونا بن گئی...... آکاش نے اس بات کی بڑی کوشش کی تھی کہ وہ اپنے آپ کو آلودہ نہ کرے...... لیکن یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔

"راج بھون میں کئی خلوت ایسے ہیں کہ جہاں شیخ کے سب کچھ بھول جاتا ہے......" جل کماری خواب ناک لہجے میں بولی۔ "لیکن میری خلوت گاہ ایسی سندر، رنگین اور دل کش ہے کہ وہاں محبت کے اسرار و رموز آشکارا ہوتے ہیں...... وہ سورگ سے کم نہیں ہے...... تم مجھے گود میں اٹھالو...... ہم وہاں چلتے ہیں؟"

آکاش نے جل کماری کے حکم سے انکار نہیں کیا۔ اس نے جل کماری کو گود میں اٹھالیا تو اس نے آکاش کو ایک سمت اشارہ کیا۔

"اس جانب چلو......" جل کماری کے لہجے میں سرشاری تھی۔ اس کی آنکھوں سے خود سپردگی جھانک رہی تھی۔

"تم آکاش جی...... دنیا کے واحد خوب صورت، وجیہہ اور طاقت ور مرد ہو کہ کسی جنم میں تم سا مرد نہیں پایا...... میں دیوتاؤں کی سوگند کھا کے کہتی ہوں کہ جو ناریاں بھی تمہیں دیکھتی ہوں گی اور اپنے آپ کو تمہارے وجود میں اپنا وجود محسوس کرتی ہوں گی تمہاری حسرت میں ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوں گی۔"

جل کماری خود فراموشی کی حالت میں بولتی رہی......

آکاش کو اس کی گود میں جل کماری پھولوں کی طرح ہلکی معلوم ہوتی تھی...... وہ اسے لے کے راج بھون کی خواب ناک راہ داریوں سے گزرتا ہوا جل کماری کے خلوت کدے کی طرف بڑھتا رہا تھا۔

سنگیت ان تمام لمحات میں اس کے ساتھ ہی رہی تھی...... آکاش نے اس کی بات کو محسوس کیا کہ جل کماری اس کے قرب میں ایسی مگن اور کھوئی ہے کہ اسے سنگیت کے سنگ سنگ کی خبر ہی نہیں ہے اور پھر وہ خود بھی تو جل کماری کے سحر اور قرب میں ایسا کھویا تھا کہ اسے سنگیت کا خیال نہیں آیا...... جذبات کا طوفان جل کماری اور اسے بہا کے لے جا رہا تھا۔ جل کماری جیسی خوب صورت اور پراسرار دوشیزہ کی قربت اسے دیوانہ کیے ہوئے تھی۔ پھر وہ جل کماری کے کدے میں داخل ہوئے۔

جل کماری کی خواب گاہ میں نیم تاریکی سی تھی۔ جل کماری نے غشی کی سی حالت میں آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا...... پھر اس نے مسہری کے سرہانے نیم تاریکی میں سنگیت کو کھڑے دیکھا...... لٹی لٹی اور غم وصدمے اور غصے سے نڈھال...... اس کی آنکھیں نفرت اور غصے سے شعلے برسا رہی تھیں...... لیکن اس کی غزالی آنکھوں میں بے بسی کے دو آنسو لرز رہے تھے......

"آخر جل کماری نے تمہیں جیت کے میرے ارمانوں کا خون کردیا...... کیا تم نے پریم کی ستھاس پالی آکاش......!" سنگیت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو اس کے لہجے کی پشت پر طنز بھرا ہوا تھا۔ "یہ کلنکنی تمہیں چھین کے بھی سکھی نہ رہ سکے گی۔"

آکاش چونک پڑا...... مڑ کے جل کماری کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ تو نڈھال اور بے سدھ پڑی تھی...... پھر اچانک یاد آیا کہ امرتا رانی نے اسے سنگیت کے بارے میں بتایا تھا کہ اس کے سوا کوئی سنگیت کو نہ دیکھ سکے گا اور نہ ہی ان کی بات چیت کوئی دوسرا سن سکے گا...... اس وقت تک تجربے سے صاف ظاہر تھا کہ جل کماری بھی اپنی تمام پراسرار قوتوں کے باوجود سنگیت کی موجودگی کو محسوس نہ کرسکی تھی۔

"سنگیت.....! یہ تم کیسی بات کر رہی ہو.....؟"
اس نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ "کیا یہ پاگل پن کی بات نہیں ہے.....؟"

"تم مجھے دوش دے رہے ہو کہ میں پاگل ہوں..... تمہیں کیا معلوم کہ میری نظروں کے سامنے پریم اور میرے ارمانوں کا خون ہوتا رہا..... کاش.....! تمہیں اندازہ ہوتا کہ مرد ہونے کے ناتے تم میں کتنا ہرجائی پن ہے۔ تم میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو اور پھر مجھے پاگل پن کا طعنہ بھی دے رہے ہو؟" اس کی آواز میں دکھ بھر گیا۔

آکاش نے سنگیت کی بات خاموشی سے سن لی۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ صرف سنگیت کو دیکھ سکتا تھا اور اس کی آواز بھی سن سکتا تھا..... اس نے احتیاطاً پھر ایک بار جل کماری کی طرف دیکھا جو آنکھیں موندے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا..... اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ وہ مدہوش سی تھی۔

اس نے سنگیت کے قریب جا کے اسے بازوؤں کی گرفت میں سینے سے لگا لیا..... اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ چند لمحوں کے لئے اس کے چہرے پر جھک گیا۔ جس سے اس کی ناراضگی، خفگی، شکایت، حسد اور کدورت پیار میں بہہ گئی۔

"امرتا رانی کہاں ہے.....؟" امرتا رانی کا خیال آتے ہی اس نے پوچھا۔

"اس سے پوچھو....." سنگیت کے لہجے میں پیار بھری خفگی سی تھی۔

"نہیں..... تم بتاؤ....." اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور اس کے گال کا بوسہ لیا۔

آکاش کے اس محبت بھرے انداز سے اس کے چہرے پر سرخی سی آ گئی اور اس کی آنکھوں میں جیسے دیئے جل اٹھے تھے۔ وہ بولی تو اس کے لہجے میں ٹھہراؤ سا تھا۔ پھر وہ اس کے گلے میں اپنی مرمریں عریاں بانہیں حمائل کر کے بولی۔

"میں تمہاری سیوک ہوں..... داسی ہوں..... اور رہوں گی..... پہلے تم اپنی جل کماری کی کہانی بھی سن لو..... میں جو کچھ کہوں گی اس سے تم یہ نہ سمجھنا کہ میرے دل میں کوئی کھوٹ ہے.....؟"

سنگیت نے جواب دینے کے بجائے جل کماری کی طرف اشارہ کیا جو مدہوشی سے نکل کے اس کی طرف کروٹ لینے لگی تھی۔ آکاش نے جب اس کے بالوں کو سہلایا تو جل کماری اس کے سینے سے آ لگی۔

"میری جان جل کماری.....! امرتا رانی کہاں ہے.....؟" آکاش نے اسے اپنے سے الگ کیا۔

"کیا میں نے تمہیں خوش نہیں کیا جو اس کی یاد آ رہی ہے؟" جل کماری نے اسے مخمور نگاہوں سے دیکھا۔

"تم نے جس محبت مہربانی اور فیاضی سے دل خوش کیا وہ ناقابل فراموش ہے....." آکاش نے اس کی تعریف کر دی تاکہ اس کا دل خوش ہو جائے۔ "میری جل رانی..... اصل بات یہ ہے کہ وہ میرے ساتھ اولی نگر آئی تھی....." وہ تشویش سے بولا۔

"اس کا بوجھ اور ذمے داری تم پر نہیں تھی..... وہ مرہنہ مندر سے دھتکاری جا چکی تھی..... احمق اور بے وقوف نے عقل سے کام نہیں لیا..... بے وقوفی اور نا سمجھی کے پھیر میں پڑ کے شیو ناگ اور راجہ دیوتا کا بیر لے بیٹھی وہ ہمارے بھی دشمن ہیں اور امرتا رانی..... اولی نگر آ کے ان کے انتقام سے محفوظ رہی تھی..... لیکن اس کی سب سے بڑی کمزوری مرد ہیں..... اس لئے وہ تمہیں یہاں چھوڑ کے اولی نگر سے باہر چلی گئی..... تاکہ اپنے کسی سابقہ پریمی سے مل کے پرانی یادیں تازہ کرے..... لیکن شیو ناگ نے راستے ہی میں اسے دھر لیا..... اب اس سنسار کی کوئی طاقت اسے اولی نگر سے نہیں نکال سکتی....."

"اور....." آکاش کے دل پر ایک چوٹ سی لگی تو اس نے گہرا سانس لیا..... اب اس کی سمجھ میں آیا کہ سنگیت نے اسے یہ قصہ اپنی زبانی کیوں نہیں سنایا..... اس لئے کہ وہ سناتی تو آکاش اسے رقابت اور احسان فراموشی ہی گردانتا..... سچ تو یہ تھا کہ اسے بھی یہ شبہ نہیں

ہوسکتا تھا کہ امرتا رانی اس قدر سیماب صفت ہے......!

"اب اسے تم سدا کے لئے بھول جاؤ میرے آکاش جی......؟" جل کماری جذباتی لہجے میں کہنے لگی۔

"تم میرے عشق کا اندازہ کرو کہ میرا انگ انگ اس میں رچا ہوا ہے...... میں اس سے کہیں زیادہ تمہیں خوش اور سکھی رکھوں گی۔ جس کا تم تصور تک نہیں کرسکتے...... تم نے میری خود سپردگی اور میرا پرشباب بدن کی حشر سامانیاں دیکھی ہیں...... لیکن عشق نہیں دیکھا ہے......؟"

آکاش نے اس بات کو محسوس کرلیا تھا کہ جل کماری کے راجن بھون میں وقت کا کوئی پیمانہ نہیں ہے...... دن اور رات کا ازلی تصور سندر کی ان گہرائیوں سے مفقود ہوچکا تھا۔ بس یہ احساس تھا کہ وقت گزرتا جارہا ہے......

یہ ایک واضح حقیقت تھی کہ اسے امرتا رانی سے کوئی دل لگاؤ نہیں تھا...... بس وہ تو حالات اور واقعات کے دھارے میں اس لئے بہتا رہا تھا کہ امرتا رانی کے قرب اور عشق سے فائدہ اٹھا کے نیلم تک پہنچ جائے...... وہ نیلم کی محبت، عشق کسی نوجوان لڑکی اور عورت سے نہیں کرسکتا تھا۔ چاہے وہ کتنی حسین اور پرکشش ہو...... لاکھوں میں ایک ہو۔ امرتا رانی کے متعلق سن کے اسے یقین کرنا پڑا کہ اس کی بے وفائی اس کے سینے میں ایک بے نام سی خلش کا خنجر پیوست ہوگیا جو اسے تکلیف دے رہا تھا اور اسے امرتا رانی کی یاد ستارہی تھی۔

سنگیت نے اس سے درمیان میں کئی بار اس سے بات کرنا اور کہنا چاہا تھا۔ لیکن آکاش نے دانستہ نظر انداز کردیا تھا...... کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ سنگیت امرتا رانی کے دیئے ہوئے زخم کو تازہ کرے گی تاکہ وہ امرتا رانی سے متنفر ہوجائے...... اب امرتا رانی کے اچانک اور غیر متوقع فریب اور شیوناگ کی خون آشام دشمنی کے باعث اسے اونی نگر سے نکلنا ناممکن سا نظر آیا تھا...... اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس کی محبوب اور از عزیز جان نیلم...... اس کے لئے ایک بھولا بسرا خواب بن کے رہ گئی تھی۔

آکاش کے دل پر نیلم سے محرومی کا یہ گھاؤ اتنا کاری تھا کہ وہ ہر وقت جل کماری کے ساتھ رہنے لگا...... وہ اس کے طلسم میں جکڑ کے اور اس کے نشے میں ڈوب کے حقیقتوں کے زہر کی تلخیاں بھول جانا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ جل رانی اس پر اس قدر مہربان اور فیاض تھی کہ اسے کسی اور بات کا خیال آنے نہیں دیتی تھی...... بس ایک بار بھی تو سنگیت کی...... وہ اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ سنگیت اور اس کے درمیان جو تعلقات استوار ہیں وہ جل پری کے علم میں نہ آئے...... ورنہ وہ رقابت کی آگ میں جانے کیا کر بیٹھے۔

وقت تھا کہ یوں ہی گزر گیا...... اسے اندازہ نہ تھا کہ جل کماری اس قدر پرکار عورت ثابت ہوگی...... کیوں کہ اس کی ہر وقت کی قربت کے باوجود وہ نا آسودہ اور تشنہ سا رہتا تھا...... کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس کی جانب سے بے زاری محسوس کرتا۔ چوں کہ وہ سنگیت کو جیسے دانستہ کم وقت دیتا جس پر سنگیت کو دیکھتا جو اس کی بے نیازی پر بپھری رہتی ہے...... اور اس کی آنکھوں میں نفرت اور انتقام کی چنگاریاں بھڑکتی نظر آتیں......

آکاش یہ بات جانتا تھا کہ سنگیت ان دونوں میں سے کسی ایک سے انتقام لینے سے قاصر ہے۔ جل کماری کا خیال کرکے وہ سنگیت سے سردمہری سے پیش آتا تھا۔

وقت جو گزرتا جارہا تھا وہ آکاش کے لئے ایک اذیت ناک عذاب تھا...... ایک روز جل کماری اشنان کرنے باندیوں کے ساتھ جھیل پر گئی تو سنگیت کو اس سے تنہائی میں دوٹوک بات کرنے کا موقع مل گیا۔

"کیا تمہیں جل کماری کی سنائی ہوئی کتھا پر وشواس ہوگیا؟" سنگیت نے اس سے بڑے عجیب لہجے میں سوال کیا تھا۔

"کیا تم کوئی نئی کہانی سنانا چاہتی ہو......؟" آکاش نے حیرت سے چونک کے سوال کیا۔

"سچ ہے کہ عورت کا وار تلوار سے کہیں کاری اور بڑا بھرپور ہوتا ہے......" سنگیت نے جھینپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں ہے...... اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں ہے، پر تم سے اتنی شکایت ہے کہ اس کا جادو چلنے کے بعد تم مجھ سے بہت رکھی انداز سے پیش

آئے ہو جس سے میں خستہ ہو جاتی ہوں...... میں جانتی ہوں کہ تم جل کماری کی وجہ سے مجھے زیادہ وقت دے نہیں پاتے ہو...... وہ بڑی ذلیل اور مکار عورت ہے...... میں خود بھی جل کماری کو نیچا دکھا سکتی ہوں...... مجھ میں اتنی شکتی اب بھی ہے...... چوں کہ میں تمہاری داسی ہو جانے کے کارن اپنی اچھا سے کوئی کام نہیں کر سکتی...... اس کی کتنی شکتی ہے...... یہ تم اس بات سے جان گئے ہو گے کہ اتنے روز بیت جانے پر بھی وہ یہ جان نہیں سکی کہ اس کے راج بھون میں ایک اور ہستی بھی موجود ہے...... تم مجھے ابھی اور اس سے آ گیا دو تو...... میں تمہیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے دکھاؤں......؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟" آکاش نے اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کے اسے قریب کر لیا اور اس نے اس کی تہہ میں پہنچنے کے لئے اس کا گال پیار سے تھپ تھپایا۔ "اب تم کھل کے بات کرو میری جان......! وہ کمینی اس وقت یہاں نہیں ہے...... وہ جھیل پر باندیوں کے ساتھ اشنان کرنے گئی ہوئی ہے......"

"میں ابھی اور اسی وقت پوری کتھا تمہارے علم میں لائے دیتی ہوں......" سنگیت نے اس کے گلے میں اپنی مرمریں، گداز اور سڈول اور عریاں بانہیں حمائل کر دیں...... پھر وہ اس کے چہرے پر جھک گئی...... بڑی دیر تک جھکی رہی کہ معلوم نہیں بعد میں اسے موقع ملے کہ نہیں...... یہاں آنے کے بعد سنگیت کو کبھی اتنا وقت اور اس قدر دیر تک رفاقت نہیں ملی تھی۔ آکاش نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس لئے کہ سنگیت کے رس بھرے ہونٹوں میں حلاوت تھی اور خلوص کی چاشنی اور اپنائیت بھی تھی...... وہ حد سے تجاوز کرنا چاہتا تھا کہ سنگیت نے کہا۔

"میرے من کے دیوتا! دھیرج رکھو...... یہ وقت جذبات کی رو میں بہنے کا نہیں ہے...... میں پوری بات کھل کے بتائے دیتی ہوں، تاکہ تم کسی نتیجے پر پہنچو اور فوری فیصلہ کرو...... جل کماری چوری چوری اور مکاری سے امرتا رانی کا مول چکانے کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہی ہے...... آج بھی وہ کالی راج دھانی کے جزیرے کالی بھون شیو ناگ سے بات کرنے گئی ہوئی ہے......" سنگیت نے پرجوش لہجے میں بتایا۔

"تم ڈرو نہیں...... کسی بات کا خوف نہ کرو...... یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی تو نہیں ہے......؟" آکاش کا تجسس اور اشتیاق دوچند ہو گیا...... سنگیت کی باتوں نے اسے وسوسوں اور اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

"لیکن تمہیں میرے ایک سوال کا پہلے جواب دینا ہوگا......!" سنگیت متذبذب سی ہو کے بولی۔

"کیا......؟" اس نے سنگیت کے ریشمی بالوں کو سہلایا۔ "میں ایک نہیں دس باتوں کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں؟"

"کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ...... عشق کی ہر بات کا کوئی نہ کوئی کارن تو ہوتا ہے نا......؟" وہ تائید طلب لہجے میں بولی۔

"ہاں کیوں نہیں......" آکاش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم میری بات پر بھروسا کرنا...... میں بڑی صاف گوئی سے اور بڑی سچائی سے ایک تلخ حقیقت سے آگاہ کر رہی ہوں۔" سنگیت نے توقف کر کے گہرا سانس لیا تو سانسوں کا زیر و بم سینے میں بے ترتیب ہونے لگا۔

"دراصل یہ سارا چکر امرتا رانی...... جل کماری...... اور شیو ناگ کا ہے...... تم ذرا غور کرو اور تہہ میں پہنچو تو سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا...... میں صرف اور صرف تمہاری خاطر بتا رہی ہوں...... تم خود دیکھ اور بھگت چکے ہو کہ...... شیو ناگ کس قدر ذلیل...... کتنا مکار اور خطرناک بیر ہے...... اور وہ کتنی پراسرار قوتوں کا مالک ہے......"

سنگیت خاموش ہو گئی...... آکاش نے فوراً کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ الجھن میں پڑ گیا تھا۔ پھر وہ اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

"سنگیت جان......! کیا تم بتا سکتی ہو کہ مجھ پر اتنی محبت اور عنایت کس لئے......؟"

"آکاش جی......! سچی بات تو یہ ہے کہ میں تمہیں اپنا دل دے بیٹھی ہوں...... اور تم میرے من کے نہاں خانے

میں بس گئے ہو...... نقش ہو گئے ہو...... اس کا نام پریم ہے...... عشق ہے...... جب دل کسی پر آجاتا ہے تو پھر وہ اپنی زندگی اور جان کی پروا نہیں کرتا......" وہ خاموش ہو گئی۔ جذبات کی گرمی نے نہ صرف اس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا بلکہ اس کا سینہ دھڑکنے لگا تھا۔ پھر وہ چند لمحوں کی اذیت ناک خاموشی کے بعد بولی۔ "میں ایک شرط پر جل کماری کا کھیل بگاڑ دوں گی اور اسے غارت کر دوں گی۔"

"کیا شرط ہے تمہاری......؟" اس نے سنگیت کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اسے قریب کر لیا۔ پھر اس کے ہونٹوں کی مٹھاس کو اپنے لبوں پہ جذب کیا تاکہ سنگیت اور خوش ہو جائے۔ اس نے ایک طرح سے سنگیت کے مکھن لگایا۔ وقت اور حالات اور اس کی نزاکت ایسی تھی...... بعض اوقات گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے...... اب سنگیت اس کے لئے واحد سہارا اور مددگار تھی۔ یوں تو سنگیت ہر لحاظ سے بے پناہ حسین اور ہیجان خیز کشش بھی رکھتی تھی۔ وہ ایک طرح سے اس کی یہ شکایت بھی دور کرنا چاہتا تھا کہ وہ جل کماری پر بہت فیاضی سے زیادہ وقت مہربان ہو رہا اور اس سے بے حد رسمی انداز سے پیش آ رہا تھا۔ اس کی من مانی پر سنگیت بہت خوش ہو گئی تھی۔ "میں تمہاری ہر شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔"

"میری شرط یہ ہے کہ تمہیں مجھے وچن دینا ہوگا کہ امرتا رانی کے زندہ بچ نکلنے کے بعد بھی مجھ سے منہ نہ موڑو گے؟"

یہ بڑی عجیب اور انوکھی قسم کی شرط تھی۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ سنگیت کے دل میں اب امرتا رانی سے حسد اور رقابت نہیں رہی۔ چوں کہ لوہا بہت گرم تھا اس لئے اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

"سنگیت میری جان......! امرتا رانی سے مجھے اتنا لگاؤ نہیں ہے جتنا تم سے ہے...... اس لئے تم سے بے وفائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... امرتا رانی سے مجھے اس لئے دلچسپی ہے کہ اس کی مدد کے بغیر میں اپنی وفیقہ حیات نیلم کو حاصل نہ کر سکوں گا۔"

"بس میری شرط اور میرا مطلب اتنا ہی تھا......" وہ خوش ہو کے اور اس کا ہاتھ تھام کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ ثبت کرتی ہوئی بولی۔ "اب تم میری بات غور سے سنو...... جل کماری کے کرتوت تمہیں یاد ہیں کہ اوٹی نگر پہنچنے کے بعد ایک جل ناگ تمہاری امرتا رانی کی سڈول اور عریاں اور مرمریں پنڈلیوں پر رینگ رہا تھا تو امرتا رانی نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ جل کماری کا اکلوتا بیٹا ہے اور اسے ابھی انسانوں کی شکتی نہیں ملی ہے......؟"

"ہاں یاد ہے......"

"جل کماری اور اس کا اکلوتا بیٹا...... وہ دونوں نرک کے کیڑے ہیں...... اپنی گھناؤنی آشاؤں کی خاطر دوسروں کے من کو روند ڈالتے ہیں...... جل کماری کا بیٹا بڑا موذی اور کینہ پرور سانپ ہے اور برسوں سے امرتا رانی پر مرتا ہے...... اور اسے انسانی روپ بدلنے کی شکتی میں تھوڑے دن باقی ہیں...... اور جل کماری نے تمہیں اپنے سپنوں کا دیوتا چن لیا ہے...... امرتا رانی اوٹی نگر سے کہیں نہیں گئی...... یہ سب جل کماری کے من کا کھوٹ ہے۔ جو سامنے آیا ہے اس نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں...... امرتا رانی کو تم سے الگ کر کے اپنے لڑکے کی قید میں دے دیا ہے...... وہ اس طرح بہت خوش ہے...... کیوں کہ اس طرح وہ سانپ بہت خوش ہے...... وہ دن رات امرتا رانی سے دل بہلاتا اور اس کے وجود پر رینگتا دل بہلاتا ہے اور جل کماری نے امرتا رانی کو سختی سے یہ حکم دے رکھا ہے کہ وہ اس کے بیٹے کی ہر حرکت اور بات مانے گی اور انکار، مزاحمت اور حکم عدولی نہیں کرے گی...... امرتا رانی کے غائب ہونے سے جل کماری کے لئے راستہ صاف ہو گیا ہے...... لیکن جل کماری کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ کسی نہ کسی دن تمہیں امرتا رانی کی قید کا بھانڈا پھوٹ جائے گا...... وہ شیو ناگ سے بات پکی کر کے امرتا رانی کو مربند مندر والوں کے حوالے کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے...... اگر اس نے امرتا رانی کو شیو ناگ کے حوالے کر دیا تو مربند مندر، اوٹی نگر اور جل منڈی والوں کی صدیوں پرانی نفرت اور دشمنی بھی ختم

ہو جائے گی اور پھر تم سدا کے لئے اس کے ہاتھوں کھلونا بن جاؤ گے......"

آکاش نے بڑے تحمل اور صبر سے جل کماری کے اس گھناؤنے کھیل کی تفصیل سنی تو اس کی رگوں میں لہو ابلنے لگا۔ اس نے حیرت، غصے اور صدمے سے سنگیت سے پوچھا۔ "آخر تمہاری ان کالی دھرتیوں میں عشق، جسموں کے حصول کی پراگندگیوں اور سازشوں کے علاوہ کچھ اور ہے؟"

"تم جذبات کی رو میں بہہ کے باتیں نہ کرو۔" سنگیت نے اس کا ایک طویل بوسہ لے کے کہا۔ "اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ایشور اور دیوتاؤں نے منش کو عقل اور بڑی سمجھ بھی دی ہے...... ہم حیوان ہر قسم کی بھوک و ہوس کے غلام ہیں...... پیٹ کی آگ کے علاوہ دوسری ہوس اور بھوک رہ جاتی ہے۔ جو ہر وقت دل و دماغ پر چھائی رہتی ہے۔ اور اس کی خواہش رہتی ہے...... تمہاری دنیا میں بھی دیوتاؤں جیسا کھیل کھیلا جاتا ہے...... پھر حیوان بھی جسمانی خواہش اور بھوک کو مٹاتا رہتا ہے......" تمہاری دنیا کیا حیوانوں اور ہوس کاروں سے بھری ہوئی نہیں ہے۔

"مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے...... آج کے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں...... قانون کے محافظ ہوتے ہوئے بھی وہاں جنگل کا قانون اور رواج ہے......"

آکاش کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ برہمی سے کہنے لگا۔ "یہ جل کماری اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے......؟ میں اسے اس جھوٹ کی ایسی عبرتناک سزا دوں گا چاہے مجھے اس جل منڈل میں ساری زندگی کیوں نہ قید کاٹنا پڑے۔"

"تم عقل کے بجائے جذبات سے کام لے رہے ہو......؟ لیکن تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ تمہاری اس حرکت کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ کیا تم اس طرح اپنے پیروں پر کلہاڑی نہیں مارو گے......؟"

"وہ کیسے......؟" آکاش نے کھولتے ہوئے جذبات پر قابو پاکے پوچھا۔

"وہ اس طرح کہ تم بہت سی جانوں کا خون ناحق اپنے سر لو گے......" وہ خیالی آواز میں کہنے لگی۔ "ایک تو تمہیں انتہائی بے دردی سے مار دیا جائے گا...... تمہاری پتنی جو اوتی نگر میں قید ہے وہ اپنی زندگی اور آبرو بچا کے زندہ نہ لوٹ سکے گی...... اور پھر امرتا رانی کا بھی خون کر دیا جائے گا...... اور نہ جانے اس پھیر میں کتنے اور آکر ختم کر دیے جائیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں جل کماری سے ڈر کے رہ جاؤں؟" آکاش نے جارحانہ لہجے میں کہتے ہوئے سنگیت کو تیز نظروں سے گھورا۔

"نہیں...... نہیں......" سنگیت نے پیار سے اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں۔ "میں اپنے من کے دیوتا کو ڈرانے کیوں لگی...... میری جان میں اس مشکل میں تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں اس لئے تم مجھے آگیا دے دو...... اس لئے بھی دیوتاؤں کی سہاتا میرے سنگ سنگ ہے...... میں جل کماری کو نیچا دکھا کے تمہیں اور امرتا رانی کو یہاں سے نکال لوں گی...... اس سے آگے امرتا رانی اپنی شکتی کے سہارے اوتی نگر اور جل منڈل سے نکال کے لے جائے گی......"

آکاش کے لئے یہ کسی خوش خبری سے کم نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد اس نے سر اٹھا کے پوچھا۔

"امرتا رانی کہاں قید ہے......؟ یہ تم جانتی ہو گی؟ مجھے بھی بتاؤ؟"

"یہ بات تو مجھے خود بھی نہیں معلوم ہے......" سنگیت نے لاعلمی ظاہر کی۔

"پھر امرتا رانی کو جل کماری نے کس قید خانہ میں رکھا ہے تم کیسے اور کہاں سے پتہ چلاؤ گی۔"

"تم آگیا دو تو میں روپ بدل بدل کے جل منڈل کا چکر لگاتی رہوں گی...... مجھے اس جل کماری کے بیٹے جیسا سانپ سے میل جول بڑھانا ہو گا...... اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہو گا تب وہ کہیں یہ راز اگل دے...... میرے ساتھ مل جانے اور اس کی ماں نے جو...... جو ڈر کی ہے اس کا پتہ چل جائے گا...... وہ اپنی ماں سے کم

کمینہ نہیں ہے...... اس کی مکاری کا بدلہ مکاری سے لینا ہوگا...... جب اپنا مطلب نکل جائے گا تب اسے ٹھکانے لگادیں گے......"

"لیکن جل کماری کو تو پتہ چل جائے گا کہ اس کے بیٹے کو کس نے ٹھکانے لگایا...... وہ اپنی ماں کو شاید بتادے کہ وہ امرتا رانی اور تم سے مزے لوٹ رہا ہے۔" آکاش نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

"تم اس کی چنتا نہ کرو۔" سنگیت نے اسے دلاسا دیا۔ "اس لئے کہ مجھے کسی جل ناگ نے دیکھا اور نہ جل کماری نے...... میں نے جب سے یہاں قدم رکھا ہے کسی نے مجھے نہیں دیکھا...... کیوں کہ میں غائب حالت میں رہی ہوں...... صرف تم ہی مجھے دیکھ اور بات کرسکتے ہو اور میری آواز بھی صرف تم ہی سن سکتے ہو۔ میں ایک ایسی دوشیزہ کے روپ میں جاؤں گی کہ وہ امرتا رانی کو بھول کے مجھ پر مرنے گا...... وہ اپنی ماں کو میرے بارے میں یقیناً بتائے گا...... اس کی موت کے بعد اس روپ کی لڑکی کو تلاش کرے گی...... لیکن وہ معلوم نہ کرسکے گی...... ایک تو اس لئے کہ میں اپنے روپ میں آجاؤں گی...... مجھے جل کماری نے کہاں دیکھا ہوا ہے۔"

"جاؤ...... تمہیں کھلی چھوٹ ہے...... لیکن احتیاط کرنا...... کوشش کرنا کہ جلد لوٹ آؤ۔"

سنگیت کے جانے کے بعد آکاش نے گلے میں پڑے منکے کو چھوا اور چوم کے دیکھا...... وہ اس کے گلے میں موجود تھا...... اسے ایک خیال آیا تھا کہ کہیں سنگیت جو اس پر اس قدر فیاضی سے مہربان ہوئی تھی کہیں اس منکے کے حصول کے لئے تو نہیں تھا......؟ کیوں کہ نشاط انگیز لمحات سے فائدہ اٹھا کے اس کے گلے سے نکال لیا ہو...... ویسے منکہ اس کے گلے سے نکالنا آسان اور ممکن نہیں تھا...... ناممکن تھا۔ اس لئے کہ وہ ایک ایسی پتلی مضبوط ڈوری سے بندھا ہوا تھا کہ کوئی اسے الگ نہیں کرسکتا تھا...... اتنی طاقت کسی میں نہیں تھی اور پھر اس کے گلے سے نکالا بھی نہیں جاسکتا تھا...... سادھو منگی بدی نے اس سے کہا تھا کہ...... یہ منکہ تمہیں ہر بلا اور شیطانی قوتوں سے محفوظ رکھے گا۔

آکاش بہت دیر تک خیالات کے گرداب میں پھنسا رہا تھا...... اس کی سوچ، بچار کا تانا بانا اس وقت تک بکھرا رہا جب تک حسین جل کماری بڑے شوخ اور ہوش ربائی میں وہاں پہنچی...... اور اس کے ہونٹوں پر رس بھری مسکراہٹ مچل رہی تھی...... اس کی آنکھوں میں مستی بھری تھی اور خمار کی سرخی بھی تھی...... اس کی سبک خرام سی چال میں ایک عجیب سی بے پروائی تھی جس سے اس کا حسن خطرناک ہوگیا تھا۔

اس انجانی دعوت دیتی ہوئی نشیب و فراز کی دلکشی اور شعلہ بدن ہونے سے بھی اس کے دل میں انجانی خواہش کی بجائے اس کے دل میں نفرت کا جذبہ ابھرا تو وہ دل کی بات زبان پر لائے بغیر نہ رہ سکا۔

"جل کماری......! تم اس وقت بہت خوش دکھائی دے رہی ہو جس سے ایسا لگ رہا ہے کہ تم نے بہت بڑا معرکہ سر کرلیا ہے......؟" آکاش کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

جل کماری نے شاید محسوس کرلیا تھا اس لئے وہ چونکی اور اس نے آکاش کے بشرے کو دیکھا...... آکاش نے چہرے سے ظاہر ہونے نہیں دیا تو وہ دلکش انداز سے مسکرادی۔ پھر وہ اپنی ریشمی سیاہ زلفوں کو پھولوں کی طرح مسلتے ہوئے بولی۔

"میں یوں تو اکثر کھلے سمندر میں جاکے تیرتی نہاتی رہتی ہوں...... لیکن جھیل پر بڑے دنوں کے بعد گئی ہوں...... پورے سمے تمہارا دھیان لگا رہا...... ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے تم بھی میرے ساتھ نہا رہے ہو......؟ گستاخیاں کررہے ہو...... چھیڑ چھاڑ کررہے ہو...... شوخیاں اور حد سے متجاوز کرتا جاتا...... اس سے تم اندازہ اور میرے عشق کو محسوس کرسکتے ہو کہ میں تمہیں اپنے تصور، دل اور وجود سے کتنا قریب محسوس کرتی ہوں...... پل کے لئے بھی تمہیں اپنے خیال، تصور اور من سے نہ جدا کرتی ہوں اور نہ دور رکھتی ہوں......"

آکاش اس کی مکارانہ اور پرفریب باتیں سنتا

دیا...... وہ جان گیا تھا کہ یہ کسی صحرائی لومڑی کی طرح ہے...... عشق کی باتوں کا جال اس پر ڈال رہی ہے تاکہ اس کا اسیر رہے۔ وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم اس خیال سے ہر وقت میرا خیال رکھتی اور سوچتی ہو کہ کہیں میں تمہیں چھوڑ کے کسی اور حسینہ کے قریب میں نہ آجاؤں اور کہیں یہاں سے بھاگ نہ جاؤں......" آکاش نے باغیانہ لہجے میں کہا۔ "کیا میں سچ نہیں کہہ رہا ہوں......؟ شاید تمہیں یہ خوف پریشان کرتا ہے......؟"

"کیا تمہیں میری کسی بات کا یقین نہیں آیا......؟" وہ آکاش کے قریب ہوگئی۔ "کیا تم نے اس بات کو محسوس کیا کہ اس سے میں کیسی حسین اور غضب کی دکھائی دے رہی ہوں اور میرے انگ انگ سے کیسی مستی ابلی پڑ رہی ہے...... اس وقت کیا میں دنیا کی حسین ترین دوشیزہ نظر نہیں آرہی ہوں...... کوئی مجھے عورت اور ایک بچے کی ماں کہہ سکتا ہے...... تم نے پوچھا نہیں کہ کیسے......؟ میرا روپ ایسا کیسے ہوگیا......؟"

"کیسے ہوگیا......؟" آکاش نے پوچھا۔ حالانکہ وہ یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تم اس وقت دنیا کی سب سے بدصورت اور چڑیل سے کہیں مکروہ اور گھناؤنی لگ رہی ہے...... بہتر ہے تم میری نظروں کے سامنے سے دفع ہوجاؤ...... وہ چاہتے ہوئے بھی یہ بات زبان پر نہ لاسکا...... اس لئے کہ بات بگڑ سکتی تھی۔

"جھیل پر نہانے اور تیرنے سے......" جل کماری نے جواب دیا۔ "یہ جھیل ہے عورت اور مرد دونوں کے لئے دوآتشہ ہے...... اس پر ہر ہفتہ مرد، چاہے وہ سو برس کا بوڑھا، کمزور اور ناتواں کیوں نہ ہو نہا اور تیر لے تو سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان بن جاتا ہے...... اس کی توانائی، کمزوری اور کھوئی ہوئی جوانی اور شباب لوٹ آتا ہے...... تم میرے ساتھ کل جھیل کے نہا کے دیکھو...... میں جو کہہ رہی ہوں اس میں تم مبالغہ نہیں پاؤ گے......"

"مجھے نہانے کی کوئی ضرورت نہیں...... اور نہ ہی میں سولہ سترہ برس کا جوان بننے سے کوئی دلچسپی رکھتا ہوں......" آکاش بولا۔

"یہ تم جلی کٹی کیوں سنا رہے ہو......؟ تمہیں تو خوش ہوجانا چاہئے۔"

"اصل میں بات یہ ہے کہ میرے دل میں ایک خوف اور دہشت سی بیٹھی ہوئی ہے......؟"

"کس کی......؟" جل کماری نے سوالیہ نظروں سے دیکھا...... اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"شیوناگ کی......؟"

"شیوناگ......!" اس کا نام سنتے ہی جل کماری کا چہرہ متغیر ہوگیا اور وہ اسے گھور کے اس کے بشرہ کو بھانپ رہی تھی کہ آکاش نے کس لئے بے وقت شیوناگ کا نام لیا۔ "یہ تمہیں اچانک شیوناگ کیوں اور کیسے یاد آگیا اور کس لئے تم اس کا خوف محسوس کررہے ہو......؟"

"میں نے تم سے کہا نا کہ اس کا خوف اور اس کی ہیبت اور دہشت ہر وقت میرے دل و دماغ پر چھائی رہتی ہے......" آکاش نے جواب دیا۔ "مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آس پاس ہی کہیں موجود ہے، اور اس کی بو بھی میرے نتھنوں میں محسوس ہوتی ہے......"

آکاش نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ وہ دوسرے لمحے سنبھل کے کسی نامانوس زبان میں بڑبڑائی لہجے میں بولی...... انداز یہ تھا جیسے وہ کسی کو مدد کے لئے پکار رہی ہو...... ایسی خوفناک آواز کہ اس کی گونج سے آکاش کا جسم کانپ اٹھا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے...... ابھی وہ سنبھلا بھی نہیں تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے والے دروازے سے شیوناگ داخل ہورہا ہے اور اس کے چہرے پر مکروہ فاتحانہ مسکراہٹ چپکی ہوئی ہے۔

"آکاش کو توقع نہیں تھی کہ جل کماری شیوناگ کو طلب کرلے گی...... کیونکہ جل کماری جس حالت میں آئی تھی اور اس کی آنکھوں میں پیاس اور خودسپردگی کی سرخی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس پر مہربان ہونے والی ہے......

آکاش کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے

گئی...... اندھے شیوناگ کے سر پر اگے باریک بار یک زندہ سانپ بڑی بے قراری سے لہرا لہرا کے اس کی جانب گھور رہے تھے۔ ان کی بے قرار زبانیں اس کے بدن کو چاٹ لینے کے لئے بے تاب نظر آتی تھیں...... ان میں سے بہت سارے سانپ ابھی تک زخمی اور نیم مردہ تھے۔ جو مرہٹہ مندر کے ویرانے میں شیوناگ کی عبرت ناک شکست کی یاد دلا رہے تھے...... شیوناگ کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ وہ آکاش سے چند قدم دور ہی رک گیا۔

''تمہیں کس نے بتایا کہ شیوناگ یہاں موجود ہے......؟'' جل کماری آکاش سے مخاطب ہوئی تو اس کا لہجہ زہرناک ہو رہا تھا۔

''میری بھی تو ایک شکتی ہے......؟'' آکاش نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔

ویسے وہ دل میں سخت خوف زدہ اور ہراساں تھا...... رواداری میں کہی ہوئی ایک غلط موقع پر سچ بات نکل آئی تھی کہ اس کے لئے مقابلے پر آ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

وہ گہرے سمندروں کے نیچے ایک پر ہول دنیا میں قید تھا جہاں سے نکلنا اس کے بس سے باہر تھا۔

اس کے روبرو ایک خطرناک دشمن سینہ تانے کھڑا ہوا تھا...... جسے اب اپنی پچھلی ذلت آمیز شکست کے داغ دھونے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا ہوا تھا اور اسی کے پہلو بہ پہلو ایک خوب صورت زہریلی ناگن بڑا اوپری موجود تھی جو اس کی خوب صورتی اس کی طاقت اور اس کے قرب کی پیاسی تھی...... طلب گار...... خواہش مند بھی تھی...... اس کا آزاد بدن اس کی نفرت اور غصے سے کانپ رہا تھا۔

''تیری شکتی......؟'' جل کماری نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تو واقعی شکتی والا ہے تو لے سنبھل...... اگنی ناگ کی سوگند...... میں تیری شکتی کو خاک میں ملانے کے لئے اپنے عشق کی بھی پرواہ نہیں کروں گی۔''

اندھے شیوناگ کے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے ہوتی ابھر آئی تھی...... ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے بینائی نہ ہونے کے باوجود وہ پوری دلچسپی کے ساتھ آکاش اور جل کماری کا ٹکراؤ دیکھ رہا تھا۔

جل کماری نے سخت طیش کے عالم میں اپنے سر سے ایک بال نوچ کے اس کی طرف تیر کی طرح پھینکا...... آکاش کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بال ایک چمکیلا اور نیزہ میں بدل گیا اور نوک کی سمت اس کی پسلیوں کی جانب تیر کی طرح لپکا...... اس کے منہ سے ایک دم سے دل خراش چیخ نکل گئی...... پھر اسے منتر کا خیال آیا تو اس نے ارادی طور پر اپنے گلے میں لٹکا ہوا منکا دائیں ہاتھ میں دبوچ لیا۔

جب وہ چمکیلا اور خونی نیزہ فضا میں اڑتا ہوا شعلہ کی مانند اس کی جانب لپکا تو آکاش نے یقین کر لیا تھا کہ اب وہ موت سے کسی قیمت بچ نہیں سکتا...... لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ نیزہ اس کے سینے سے ایک بالشت کے فاصلے پر رک گیا اور وہ شعلہ کی طرح جل اٹھا اور زمین پر گرا تو راکھ میں تبدیل ہو گیا۔

شیوناگ نے اپنے پرہیبت سر کو یوں حرکت دی جیسے وہ نیزہ جلنے کا راز جان گیا ہو۔ لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ جل کماری نے اپنے وار کا یہ حشر دیکھا تو اس کی حالت ایک نیم پاگل کی سی ہو گئی تھی۔ پھر وہ غضب ناک ہو کے پھنکاری۔

''تو کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو...... تو ایک بات یاد رکھ...... جل منڈل میں جل کماری کے منہ کو آنے والا نشٹ ہو جاتا ہے مورکھ...... اس بار تو کسی قیمت پر ہرگز بچ نہ سکے گا۔''

''لیکن تو میرے ہاتھوں کھلونا بنی رہی......'' آکاش نے بے خوفی سے کہا۔ ''تو نے اپنے آپ کو ایک جوان کی طرح میرے سپرد کر کے دن رات کھلونا بنی رہی...... میں نے تجھے خوب پامال کیا...... تو نے میری ہر بات کے آگے سر تسلیم خم کیا تھا...... اب تو اتنا تو نہ بدل کے مہربان ہونے کے بجائے نفرت، غصے اور حقارت سے پیش آ رہی ہے۔ تجھ جیسی کماری کو زیب نہیں دیتا ہے...... تو آ...... ہم دونوں اتنی دور نکل جائیں کہ واپسی کا

خیال نہ آئے......"

آکاش نے اسے مشتعل کرنے کی غرض سے اور شیوناگ کو منانے اور علم میں لانے کے لئے کہے تھے...... جل کماری کو اس نے شیوناگ کے سامنے ذلیل کیا اور توہین کی تھی...... گو کہ یہ باتیں مبالغہ نہیں تھیں......

جل کماری کے تن بدن میں آگ لگ گئی...... وہ کتیا بن کے اس کے ساتھ پیش آئی اور خوش ہوتی رہی تھی۔ پھر جل کماری نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پوری قوت سے ایک مخصوص انداز سے حرکت دی۔

آکاش نے اپنے عقب کسی بھوکے گھڑیال کی خون خوار گڑگڑاہٹ سنی جس سے زمین ہلنے لگی تھی...... اس نے چونک اور بڑبڑا کے پلٹ کے دیکھا۔ اس کا اندازہ درست نکلا...... ایک دیوقامت گھڑیال رینگنے کے انداز میں پیش قدمی کر رہا تھا...... اس کی جسامت سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک ہی سانس میں آکاش کو ہڑپ کر جائے گا۔

اس کے اور آکاش کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ جسے وہ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ کم کر رہا تھا...... ادھر آکاش پیچھے کھسکتا فاصلہ بڑھا رہا تھا...... اس مرتبہ آکاش خوف زدہ نہیں تھا۔ اسے گھڑیال کی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔

اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی تو اس نے لپک کے جل کماری کو دبوچ کے ڈھال بنا لیا اور بے بس کر دیا...... جل کماری چیخی چلائی۔ "مجھے چھوڑ دو......" وہ بے تحاشا گالیاں بکنے اور کسمسانے لگی تو آکاش کو غصہ آ گیا...... گھڑیال اپنی جگہ رک گیا تھا...... جب شیوناگ نے اسے آکاش کی قید سے رہائی دلانے کے لئے بڑھنا چاہا تو آکاش نے اسے اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ لڑکھڑاتی ہوئی شیوناگ پر جا گری۔

جل کماری کی معاً نظر اس کے سنگار میز کے بڑے آئینے پر پڑی تو اس کا نفرت اور غصے سے برا حال ہونے لگا......

جل کماری ایک طرف سنبھل کے کھڑی نفرت اور غصے سے ہانپ رہی تھی اور اس کا سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا اور بے ترتیب سانسیں قابو میں نہیں آ رہی تھیں اور آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے...... آکاش نے اس کی جو درگت بنائی اور اپنے سارے ارمان پورے کئے وہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا...... اور پھر اس کی ایسی ہتک تھی جس کا وہ تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔

جل کماری نے ہاتھ کے اشارے سے نامانوس زبان میں گھڑیال کو کوئی حکم دیا تھا۔

آکاش کو بھگوان اور منکے پر بڑا یقین اور اعتماد تھا لیکن وہ پھر بھی غیر یقینی حالت کا شکار تھا...... پھر وہ گھڑیال آکاش سے چند قدم پر رک گیا...... یہ دیکھ کے جل کماری زور سے چلائی...... "اس کمینے کو ختم کر دے......"

لیکن وہ گھڑیال ٹس سے مس نہ ہوا...... آکاش نے جو دیکھا اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا...... گھڑیال کی جسامت غیر محسوس انداز سے آہستہ آہستہ کم ہونے لگی تھی۔

جل کماری حیرت اور خوف سے پھٹی پھٹی نظروں سے اس سکڑتے اور سمٹتے گھڑیال کو دیکھنے لگی۔ پھر اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ پھر اس نے اپنی سانسوں پر قابو پا کے جھلائی ہوئی آواز میں آکاش سے بولی۔

"تو بڑا خوش ہو رہا ہے...... لیکن میری یہ بات غور سے سن لے...... تو یہ سمجھ رہا ہے کہ یہاں سے آسانی سے نکل جائے گا...... یہ تیری غلط فہمی ہے...... میرے ایک ذرا سے اشارے کی دیر ہے...... ساگر کا چنگھاڑتا ہوا طوفانی پانی اوپر نگری کی اس خشک گپھا میں بھر آئے گا...... اور تو کتے کی مانند گھٹ کے رہ جائے گا...... میں دیکھتی ہوں تجھے جو اپنی شکتی پر بڑا گھمنڈ ہے وہ تجھے کیسے بچائے گی......؟"

اس وقت گھڑیال سکڑتے سکڑتے نظروں سے بالکل معدوم ہو چکا تھا۔ اور جل کماری اگلا کوئی قدم اٹھانے والی ہی تھی کہ شیوناگ بول پڑا۔

"اس کے پاس ایک سنیاسی کا دیا ہوا منکا ہے...... اس لئے یہ حرام زادہ آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا...... اگر تم مجھے اپنی صلاحیت اور کمال دکھانے کی آگیا دے دو تو شاید میں اس کا بیڑا غرق کر دوں گا۔"

"شیوناگ جی......! اس میں اجازت لینے کی کیا

ضرورت ہے...... اس حرامزادے کو جلا دو...... اس کا چہرہ ایسا مسخ کر دو کہ اس کی ماں بھی اسے پہچان نہ سکے۔ اب مجھے کوئی دکھ نہ ہوگا...... اس نے رات دن میرا جو حشر کیا میں اس کا بھی بدلہ لینا چاہتی ہوں...... اس نے مجھے حیوان سمجھا ہوا تھا۔" جل کماری نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"کیوں اپنا وقت اور اپنا زور غارت کر رہے ہو......؟" آکاش نے طنز کیا۔ "یہ کسی اور پر آزمالینا۔"

"تجھ پر شکتی تو کام نہیں کرے گی...... لیکن میرے بدن میں اتنی شکتی ہے کہ تجھے ایک پل میں نشٹ کر سکتا ہوں...... تو اس دن امرتا رانی کی بروقت مدد سے بال بال بچ گیا تھا۔" اندھا شیوناگ بازو پھیلائے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ پہلے بھی آکاش ایک مرتبہ اس سے زور آزمائی کر کے اس کی بے پناہ جسمانی طاقت کا اندازہ کر چکا تھا۔ شیوناگ اسے باتوں میں الجھا رہا تھا تاکہ اس کی توجہ ہٹا سکے۔

"تیری داسی سنگیت کہاں ہے......" شیوناگ نے سوال کیا۔

"تیری موت کی تلاش میں ہے...... تو اس سے بچ نہ سکے گا......" آکاش اس کے قدموں پر نگاہیں رکھے ہوئے تھا۔

شیوناگ قہقہہ مار کے بڑے زور سے ہنسا...... دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے اس کی سمت برق سرعت سے لپکا۔

لیکن آکاش ہمت حوصلے اور بے خوفی سے کھڑا رہا...... جیسے ہی شیوناگ اس کے قریب پہنچا۔ آکاش نے فوراً ہی جھکائی دے دی...... اس کی ٹانگیں آکاش کی پشت سے ٹکرائیں تو وہ منہ کے بل گر پڑا۔

آکاش کا سب سے پہلا نشانہ وہ باریک باریک سانپ تھے جو شیوناگ کے سر پر کلبلا رہے تھے...... وہ جانتا تھا کہ چونکہ اس کے پاس منکا ہے اس لئے سانپوں کا زہر اس پر بے اثر ہو کے رہ جائے گا۔

اس لئے اس نے شیوناگ پر مسلط ہو کے اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں سے ان سانپوں کو نوچنا شروع کیا۔

شیوناگ کے لئے تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی تھی...... وہ بری طرح بلبلا اٹھا تھا۔

اس کے سر پر اگے ہوئے سانپ آکاش کی وحشیانہ نوچ کھسوٹ سے بوکھلاہٹ کے دہشت زدہ آوازوں میں پھنکارنے لگے تھے۔ لگتا تھا کہ بس اب وہ کسی سے دم توڑنے والے ہیں۔

جل کماری ایک طرف...... ایک گوشہ میں کھڑی آکاش اور شیوناگ کو برسرِ پیکار دیکھ رہی تھی...... ان دونوں کے درمیان بڑی خوفناک جدوجہد جنگ ہو رہی تھی۔

اسے یقین نہیں آیا تھا کہ آکاش...... شیوناگ پر بھاری پڑ جائے گا...... اس کا غیض وغضب سے برا حال ہو رہا تھا...... اس پر ایک ہیجان سا طاری ہو گیا تھا...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کس طرح شیوناگ کی مدد کرے......؟

جل کماری کو ایک خطرہ سا محسوس ہونے لگا آکاش سے...... آکاش اگر فتحیاب ہو گیا تو پھر آکاش اسے اپنا غلام بنا لے گا...... اس کی حکومت ختم کر کے اس سے دل بہلاتا کھلونے کی طرح کھیلتا رہے گا...... اور پھر اسے پچھتاوا سا ہونے لگا کہ اس نے شیوناگ کو طلب کر کے کتنی بڑی غلطی کی...... وہ کچھ دن اور آکاش کی رفاقت میں دن رات رنگین کرتی...... اسے اندازہ نہ تھا کہ آکاش شیوناگ پر بھاری پڑے گا...... اب اسے آکاش جیسا مرد کہاں ملے گا......؟

چند ثانیوں تک شیوناگ...... آکاش کے حملوں سے بچنے اور سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا تھا اور پھر اس پر نقاہت طاری ہونے لگی...... اس کے سر کے بیشتر سانپ آکاش کے ہاتھوں شدید زخمی ہو چکے تھے...... شیوناگ کو غیر متوقع بے بس دیکھ کے آکاش کا حوصلہ بڑھ گیا......

پھر اس نے ساری طاقت یکجان کر کے شیوناگ کے داہنے جبڑے پر ایک بھرپور گھونسہ رسید کیا۔

آکاش کا یہ وار شیوناگ کے لئے پریشانی کا سبب بن گیا۔

(جاری ہے)

حقیقت منتظر

عامر ملک۔ راولپنڈی

دو پیالیوں میں سے ایک میں زہرا بھرا تھا، پینے والے دونوں ہی حیران پریشان شش و پنج میں تھے کیونکہ ایک کی جان جانی تھی مگر یہ کیا ایک نے دونوں پیالیوں کے مشروب کو پی لیا کہ پھر اچانک.....

دل کے چور کو پکڑنا آسان ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہوتا ہے۔ اس کے مصداق حقیقی کہانی

انسان فطری طور پر انتہا پسند واقع ہوا ہے۔ خوش گمانی کی کیفیت طاری ہو تو کانٹوں کو بھی دامن میں بھر لے۔ نفرت کرنے پر آئے تو پھولوں کو بھی پاؤں تلے روند ڈالے۔ ندیم کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا، وہ میرے قریبی عزیزوں میں سے تھا۔ اس کا باپ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کے ناطے بے حد لاڈلا تھا، وہ مردانہ وجاہت میں ثانی نہ رکھتا تھا۔ وجاہت عطا کرنے میں قدرت نے فیاضی سے کام لیا تھا، لڑکیاں اس پر مرتی تھیں مگر وہ کسی کو کم ہی لفٹ کراتا تھا، اس طرح میں بھی کسی سے کم نہیں تھی۔

میرے حسن لازوال کی ہر کوئی تعریف کرتا تھا، زندگی اور قسمت نے میری راہوں میں پھول بچھا رکھے تھے۔ ابا جان سرکاری آفیسر تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی گھر میں خوشحالی تو ہری ہری سوجھتی ہے، میں بھی خواب

ں کی دنیا میں اب بھی میرے خوابوں اور خیالوں کا محور ندیم تھا۔ میں اسے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتی تھی، ندیم بھی میری چاہت سے بے خبر نہ تھا۔ مگر وہ مجھ سے بے رخی برتتا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ ہمارے خاندان میں لڑکیاں زیادہ اور لڑکے کم تھے۔ اس لئے ہر خاندان ندیم کو داماد بنانے کا خواہش مند تھا اس کا اندازہ ندیم کو بھی تھا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ برادری کی کسی بھی لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔ اس لئے اب برادری والوں نے ندیم کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔

جبکہ میں نے اپنے آپ سے عہد کرلیا تھا کہ میں ندیم کو رام کرکے ہی دم لوں گی۔ میں جانتی تھی کہ ندیم کا کئی لڑکیوں کے ساتھ افیئر چل رہا ہے مگر وہ ان میں سے کسی کے بارے میں بھی سنجیدہ نہ تھا۔ برادری کے لڑکے مجھے پسند کرتے تھے مگر میرے دل و دماغ پر ندیم کا بھوت سوار تھا۔ میں دن رات سوتے جاگتے اس کے سپنے دیکھتی تھی۔

ایک بار اتفاق سے تنہائی میں میرا اور ندیم کا سامنا ہوا تو میں نے اپنا حال دل کہنا چاہا تو اس نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔

"بس نیلم! بس...... میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو لیکن سوری...... میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا...... برادری کی لڑکیاں تو مجھے زہر لگتی ہیں۔"

اس کا کورا سا جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اسی روز میں نے عہد کرلیا اور دل میں کہا۔

"ندیم! میں تجھے پیروں پر گرا کر ہی دم لوں گی۔"

☆......☆......☆

روپا میری کلاس فیلو تھی۔ وہ ہندو تھی، اس کا تعلق غریب خاندان سے تھا شکل و صورت بھی کوئی خاص نہ تھی۔ وہ دوستیاں پالنے میں ماہر تھی۔ میرے ساتھ بھی اس کے اچھے مراسم تھے لیکن پڑھائی کے معاملے میں وہ زیرو تھی کوٹہ سسٹم نہ ہوتا تو اسے کالج میں داخلہ بھی نہ ملتا۔ روپا کی ماں جادو ٹونے کا کام کرتی تھی۔ روپا نے کالج کی کئی لڑکیوں کا کام کرایا اور ان کا ایسا رام کیا کہ وہ اپنے ذاتی مسائل خاص کر عشق و محبت میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس کی ماں کے پاس جانے لگیں اسی دوران میں ایک لڑکی پر اس کا الٹا اثر ہوگیا وہ اتنی شدید بیمار ہوئی کہ مرتے مرتے بچی تھی، یہ خبر جب کالج کی پرنسپل تک پہنچی تو انہوں نے روپا کے خلاف ایکشن لے کر اسے کالج سے نکال دیا۔ کچھ عرصہ کالج میں روپا کے قصے سنائی دیتے رہے۔ مگر پھر ہم سب روپا اور اس کی کہانی کو بھول گئے۔

ندیم کی طرف سے مسلسل نظر انداز کئے جانے پر میں اسے حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کرنے لگی۔ تو ایک روز اچانک مجھے روپا کا خیال آیا۔ میں نے روپا اور اس کی ماں سے ملنے کی ٹھان لی اور ایک دن اسے تلاش کرتے ہوئے اس تک جا پہنچی۔ روپا نے مجھے دیکھا تو حیران رہ گئی اس کا گھر شہر سے باہر ایک کچی آبادی میں تھا جہاں ہندوؤں کے کئی اور گھرانے بھی آباد تھے۔ روپا میرے لئے چائے بنالائی، نہ چاہنے کے باوجود میں نے چائے پی اور روپا کو اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ تو وہ کہنے لگی۔

"میں امی سے تمہیں ملواتی ہوں وہی تمہارا یہ مسئلہ حل کریں گی۔"

☆......☆......☆

"بہت ہی مشکل کام ہے۔" روپا کی ماں کہنے لگی۔ "یہ میرے بس کی بات نہیں پر ناممکن بھی نہیں ہے، میں تمہیں ایک جوگن کے پاس لے جاؤں گی وہ تمہارا کام کردے گی۔ مگر اس پر رقم خرچ ہوگی۔"

"میں منہ مانگی رقم دوں گی۔" میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے تم منگل کو میرے پاس آجانا میں تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گی۔ وہ تمہیں ایسا عمل بتائے گی کہ ندیم پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری جھولی میں آن گرے گا۔"

میں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتی تھی مگر ندیم کو حاصل کرنے کی خاطر میں جوگن کے پاس جانے کو تیار ہوگئی اور حسب وعدہ رقم لے کر منگل کے دن کالج

جانے کی بجائے روپا کے گھر پہنچ گئی۔

روپا کی ماں مجھے ساتھ لے کر چل پڑی۔ ہمیں رکشہ پر وہاں جانا پڑا۔ شہر سے باہر کافی دور ایک ویرانے میں پہنچ کر رکشہ چھوڑ دیا۔ اور پیدل چلنا شروع کر دیا۔ وہ علاقہ پہاڑی تھا اور گھنا جنگل تھا وہاں ایک کٹیا سی بنی ہوئی تھی۔ جس کے دروازے پر ایک بوڑھی سی عورت بیٹھی تھی۔ اس کے سر کے بال سفید تھے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور اس کی شکل نہایت ہی بھیانک لگ رہی تھی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی اس کے سامنے مٹی کا ایک بڑا سا پیالہ رکھا تھا۔ جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا، ہم قریب پہنچیں تو ایک ناگوار سی بو میرے نتھنوں میں گھس گئی، ایک لمحہ کو میرا دم گھٹنے لگا ایک عجیب بھیانک اور پراسرار قسم کا ماحول تھا۔ جوگن کا حلیہ بھی خوف زدہ کر دینے والا تھا اس کے جسم سے بھی عجیب قسم کی بدبو آ رہی تھی میرا جی چاہنے لگا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ روپا کی ماں کو میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا لہٰذا اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''نیلم! گھبراؤ مت۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرو۔ ورنہ تم اپنی منزل نہ پا سکو گی۔''

روپا کی ماں کی آواز سن کر جوگن نے گردن اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور کرخت لہجے میں بولی۔

''سارنا! کیوں آئی ہو۔؟''

روپا کی ماں زبان سے کچھ نہ بولی اور آگے بڑھ کر جوگن کے پاؤں دبانے لگی۔ پھر اس نے میری طرف اشارہ کر کے بتایا کہ میں اس لڑکی کو لے کر آئی ہوں۔ جوگن نے بغور میرے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''مشکل کام لگتا ہے۔'' پھر جوگن نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ تو میں بھی جا کر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ جوگن کے جسم سے ایک عجیب قسم کی بدبو آ رہی تھی کہ وہاں بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ جوگن نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

''اس ماہ کی آخری اتوار کو آ جانا اور جس کو تم چاہتی ہو۔ اس کی ایک تصویر لیتی آنا۔ تمہیں دو دن اور دو راتیں یہاں گزارنی ہوں گی۔ یہ تمہاری چاہت کا امتحان ہوں گی۔ اگر تم اس امتحان میں کامیاب ہو گئیں تو تمہارا محبوب کچے دھاگے کی طرح تمہاری طرف کھنچا چلا آئے گا اور زندگی بھر تمہارا غلام رہے گا۔''

''یہ تو نہایت ہی مشکل کام ہے۔ مجھے گھر والے اتنے دن گھر سے باہر نہیں رہنے دیں گے۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' روپا کی ماں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر مجھے واپس چلنے کو کہا۔ اس نے مجھے کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ہم وہاں سے پیدل ہی چل پڑیں۔ راستے میں روپا کی ماں نے مجھ سے اپنا معاوضہ وصول کیا اور کہنے لگی۔

''اس ماہ کے آخری اتوار کو صبح صبح تم یہاں آ جانا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ گھر والوں سے کیا بہانہ بناؤ گی یہ تمہارا کام ہے۔ میں بھی دو دن اور راتیں تمہارے ساتھ وہاں گزاروں گی تاکہ تمہیں تسلی اور حوصلہ رہے۔''

میں گھر پہنچی تو شام ڈھل چکی تھی سب گھر والے پریشان تھے میں نے ان سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ''میری ایک کالج کی سہیلی کی شادی ہو رہی ہے آج اس کی شادی کا دن مقرر ہونا تھا۔ اس لئے میں اس کے گھر چلی گئی تھی اب اس ماہ کی آخری اتوار کو اس کی شادی ہے اس موقع پر مجھے وہاں دو دن رہنا پڑے گا۔''

میں نے اس انداز میں جھوٹ بولا کہ گھر والوں نے اسے سچ جان لیا اور مزید کوئی بات نہ کی۔

ندیم کی تصویر حاصل کرنے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی۔ اور پھر میں اس ماہ کے آخری اتوار کا انتظار کرنے لگی۔ خدا خدا کر کے اتوار کا دن آ پہنچا۔ میں صبح صبح گھر سے نکلی اور روپا کے گھر پہنچ گئی۔ روپا کی ماں میری منتظر تھی میں نے اس کو خوش کیا۔ اور وہ مجھے ساتھ لے کر جوگن کی طرف چل پڑی۔ وہاں جوگن ہماری منتظر تھی۔ اس نے مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ یہاں تک شام ہو گئی

اور اندھیرا پھیلنے لگا۔

جنگل سے مختلف قسم کے جانوروں کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں ان آوازوں کو سن کر میرے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ میرا جسم پسینے میں بھیگنے لگا، روپا کی ماں جھونپڑی کے اندر چلی گئی، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری روح میرے جسم سے جدا ہوجائے گی جبکہ جوگن نہایت ہی پرسکون ہوکر منتر پڑھ رہی تھی۔ اس نے کافی دیر بعد آنکھیں کھولیں اور پھر وہ اٹھی اور کٹیا کے اندر چلی گئی کچھ دیر بعد وہ باہر آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک چاقو ایک پیالہ اور ایک دیا تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ "اپنا ہاتھ آگے کرو۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے دایاں ہاتھ آگے کیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر بڑی پھرتی سے میری شہادت کی انگلی پر چاقو سے ایک زخم لگایا۔ اور انگلی پیالے کے اوپر رکھ دی۔ پھر اس نے میرا دوسرا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلی پر بھی ایسا ہی زخم لگایا اور وہ بھی پیالے کے اوپر رکھ دی۔ درد کے مارے میری جان نکلی جارہی تھی مگر مجھے یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا۔ جب پیالے میں کافی خون جمع ہوگیا تو وہ بولی۔ "اب میں آنکھیں بند کرکے جاپ کروں گی تم اتنی دیر میں تھوڑا تھوڑا خون ندیم کی تصویر پر چھڑکتی رہو۔"

میں نے جوگن کے کہنے پر عمل کیا۔ اس نے آنکھیں بند کرکے کچھ پڑھنا شروع کردیا اور میں ندیم کی تصویر نکال کر اس پر خون کے چھینٹے مارنے لگی۔ ندیم کی تصویر میرے خون سے سرخ ہوگئی تھی جب جوگن نے آنکھیں کھولیں تو اس نے تصویر کو دیکھا اور میرے ہاتھ سے لے کر اپنی آنکھوں کے سامنے لاکر کچھ پڑھنے لگی۔ پھر اس نے تصویر میرے حوالے کی اور میری انگلیوں کے زخموں پر راکھ مل دی۔ راکھ ملنے سے خون بند ہوگیا اور میری تکلیف بھی کم ہوگئی۔ پھر وہ مجھے کٹیا کے اندر لے گئی اس نے مجھے کچھ کھانے کو دیا اور پھر وہ کہنے لگی۔

"اب تم نے تمام رات کٹیا کے باہر سامنے والے درخت کے نیچے اس کے تنے کے ساتھ بیٹھ کر اور جاگ کر گزارنی ہے ندیم کا تصور دماغ میں رکھ کر تم نے رات بھر اس کا نام دہرانا ہے۔ یہ عمل کل کی رات بھی کرنا ہوگا۔ اس کے بعد یوں سمجھو تمہارا کام ہوگیا۔"

پوری رات گھنے اور خطرناک جنگل میں گزارنے کا سن کر میں لرز کر رہ گئی۔ "یہ تو بہت مشکل اور خطرناک عمل ہے۔ جنگلی درندے مجھے کھا جائیں گے۔" میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں تمہارے گرد ایسا حصار کھینچ دوں گی کہ چیونٹی بھی تمہارے نزدیک نہیں آئے گی۔ یہ عمل صرف رات ہی کو کیا جاتا ہے دن کو اس کا اثر نہیں ہوتا، میں بھی تو اکیلی ہر رات اس جنگل میں رہتی ہوں۔ میری زندگی کا زیادہ حصہ تو اسی جنگل میں گزرا ہے کوئی جنگلی جانور، پرندہ ادھر نہیں آتا، میں نے کڑی محنت کرکے یہ مقام حاصل کیا ہے، میں اب اپنے عمل سے ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہوں اس لئے تم آنکھیں بند کرکے بے خوف وخطر درخت کے نیچے بیٹھ جاؤ۔"

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ندیم کے تصور میں ڈوب گئی۔ میری زبان اس کے نام کی مالا جپنے لگی، میں بے خطر ہوکر اس کے علاوہ ہر قسم کے احساس سے بے بہرہ ہوگئی حتیٰ کہ جنگلی جانوروں کی آوازیں میرے اس عمل اور دھیان میں رکاوٹ نہ بن رہی تھیں۔ یوں ہی رات گزر گئی۔

مجھے ہوش اس وقت آیا جب روپا کی ماں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا صبح ہوچکی تھی۔ وہ مجھے اٹھا کر کٹیا کے اندر لے گئی، میں نے چائے پی اور سوگئی، میں تمام دن سوتی رہی شام کو آنکھ کھلی اور پھر دوسری رات آگئی۔ میں نے وہ رات بھی پہلی رات کی طرح گزاری۔

اگلی صبح جوگن نے مجھے خود اس حصار سے نکالا اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی کہنے لگی۔

"نیلم! مبارک ہو تمہارا کام ہوگیا۔ اب تم نہیں ندیم تمہارے پیچھے آئے گا۔ وہ یا اس کے گھر والے خود تمہارا رشتہ مانگنے آئیں گے، اب جیت تمہارا مقدر بنے گی۔"

میں مطمئن اور مسرور ہوگئی۔ میں نے روپا کی ماں اور جوگن کا شکریہ ادا کیا، جوگن کے پاؤں چھوئے اسے نذرانہ پیش کیا اور خوشی خوشی گھر لوٹ آگئی۔ گھر پہنچ کر میں نے سکھ کا سانس لیا اور جوگن کے عمل کے نتیجے کا انتظار کرنے لگی، چھ ماہ گزر گئے مگر ندیم کے رویہ میں تبدیلی نہ آئی۔ مجھے جوگن اور روپا کی ماں پر غصہ آنے لگا۔ ایک ہفتہ اور مزید گزرا تو پتہ چلا کہ ندیم بیمار ہوگیا ہے، میں اس کی بیماری کا سن کر پریشان ہوگئی اور اس کی صحت یابی کی دعائیں مانگنے لگی۔ میرا بہت ہی جی چاہتا تھا کہ اس کی تیمارداری کے لئے جاؤں۔ مگر اس کے خشک رویہ کی وجہ سے میں نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ ندیم کافی دن بیمار رہا۔ دو تین دن اسپتال میں بھی گزارے مگر اب وہ ٹھیک تھا۔

☆......☆......☆

ایک روز اچانک ندیم کے والدین میرے گھر آئے۔ وہ ندیم کے لئے میرا رشتہ مانگنے آئے تھے، مجھے یقین ہی نہ آرہا تھا کہ ایسا ہوسکتا ہے مگر وہ حقیقت تھی جوگن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، میں جوگن کے عمل اور قابلیت کی معترف ہوگئی۔ ندیم کے کہنے پر ہی اس کے والدین میرا رشتہ مانگنے آئے تھے، میرے گھر والوں نے میرے پوچھے بغیر ہی ہاں کردی۔ پھر کیا تھا، دونوں طرف شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ میں خوشی سے پاگل ہوئی جارہی تھی کہ جیت میرا مقدر بن گئی ہے میں جوگن کو دعائیں دیتی نہ تھکتی تھی کہ اس نے میرا ارمان پورا کرڈالا، میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔

جلد ہی میری اور ندیم کی شادی ہوگئی۔ ندیم نے مجھے ڈھیروں محبت دی اور میرا بہت خیال رکھا۔ ایک روز میں نے ندیم سے پوچھا۔ ”تم میرے ساتھ شادی کرنے پر کیسے تیار ہوگئے کیونکہ تم تو کہتے تھے کہ برادری کی لڑکیاں مجھے زہر لگتی ہیں۔ میں بھی تو تمہاری برادری کی ہی ہوں۔“

”ہاں...... نیلم! میں نے ایسا ہی کہا تھا...... ایسا ہی سوچا تھا۔“ وہ کہنے لگا۔ ”میں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ میں برادری کی کسی بھی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ مگر اب مجھے خود سمجھ نہیں آرہا ہے کہ میں نے تم سے شادی کیسے کرلی ہے؟ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے تم نے مجھ پر کوئی جادو کرڈالا ہے کیونکہ میں بے اختیار ہوکر تمہاری طرف کھنچا چلا آیا ہوں، میں کئی ماہ سے خوابوں میں تمہاری آواز سنتا تھا کہ تم مجھے پکار رہی ہو اور کہہ رہی ہو۔

”ندیم! تم میرے ہو صرف میرے، مجھے پہچانو، میری طرف آؤ۔“ میں یہ آوازیں سن کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا تو میرا تمام جسم پسینے سے شرابور ہوتا۔ جس سے میں خوف زدہ ہوجاتا اور ایک عجیب سا خوف مجھے اپنے حصار میں لے لیتا۔ اس خوف میں ایک پراسرار کشش تھی جو مجھے تمہاری طرف راغب کرتی تھی میں آنکھیں بند کرتا تو تم میرے سامنے کھڑی ہوتی۔ اسی خوف نے مجھے بیمار کرڈالا۔ بیماری کے دوران میری آنکھ لگتی تو میں تمہیں آوازیں دینے لگتا گھر والوں نے میری زبان سے بار بار تمہارا نام سنا تو وہ یہ سمجھے کہ شاید میں تمہیں چاہتا ہوں اور تم مجھے ٹھکرا رہی ہو اور بیماری کی وجہ بھی یہی ہے کہ بے ہوشی کے عالم میں میرے لبوں سے تمہارا نام ہی نکلتا ہے میں جب بہتر ہوا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہاری شادی نیلم سے کردیں تو میں نے ہاں کردی، یوں میرا اور تمہارا رشتہ طے ہوگیا اور پھر شادی ہوگئی اس کے بعد میں نے ایسا خواب نہیں دیکھا۔“

ندیم نے جو کچھ بتایا وہ سچ ہی تو تھا، وہ جادو ہی کے ذریعے میرے قابو میں آیا تھا مگر میں نے اسے اس بارے میں کچھ نہ بتایا۔ ”میں نے تمہیں کیسے حاصل کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں ندیم! میں نے اپنی محبت کا جادو تم پر کیا تھا، یہ اسی جادو کا اثر ہے کہ آج تم میرے ہو۔ میں نے راتوں کو جاگ جاگ کر تمہارے ملن کی دعائیں مانگی تھیں اور پروردگار نے میری دعائیں سن لیں اور تم میرے ہوگئے ہو۔

ندیم نے اس سلسلہ میں مزید کوئی بات نہ کی۔ یوں ہماری زندگی گزرنے لگی، میں ندیم کو پاکر بہت مسرور تھی لیکن کبھی کبھی وہ کہیں خیالوں میں کھو جاتا تھا کچھ ہی عرصہ بعد ندیم کے والد کا انتقال ہوگیا اور کاروبار

کا تمام بوجھ ندیم پر آن پڑا۔ ندیم نے کاروبار پر ذمہ داری سے توجہ دینی شروع کر دی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ میرا بھی بے حد خیال رکھتا تھا۔ وہ میری چھوٹی چھوٹی ضرورتوں اور خواہشوں کا احترام کرتا، ہم میں کبھی بھی لڑائی جھگڑا نہ ہوا تھا۔ یوں ہی ایک سال بیت گیا۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ندیم کے رویے میں کچھ تبدیلی آنی شروع ہو گئی اور اب وہ اکثر راتوں کو دیر سے گھر آنے لگا جس کی وجہ سے مجھے کاروباری مصروفیات بتاتا تھا۔ مگر مجھے دال میں کالا نظر آنے لگا۔

میں اس شک میں گھر گئی کہ ندیم کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہے میں رات کو جاگ کر اس کے آنے تک پریشان رہتی وہ آتا تو ہم دونوں مل کر کھانا کھاتے۔ اس کی چاہت میں کمی نہ آئی تھی مگر میں شک کی آگ میں جلنے لگی پھر جب میں نے یہ محسوس کیا کہ ندیم کی چاہت کم ہونے لگی ہے تو میں اس کی ٹوہ لگانے کا ارادہ کر لیا۔

میرا شک صحیح نکلا، ندیم اپنی سیکریٹری شگفتہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا، میں نے شگفتہ کو دیکھا وہ واقعی مجھ سے زیادہ حسین اور پرکشش تھی۔ اس کا حسن قیامت ڈھاتا تھا، ان دونوں کی غیر موجودگی میں، میں ایک دو بار ندیم کے دفتر گئی تو وہاں سے یہ تصدیق ہو گئی کہ ندیم اور شگفتہ کی محبت شدت اختیار کر چکی ہے۔ دفتر کے بزرگ اکاؤنٹنٹ نے مجھ سے کہا کہ میں ندیم کو روکوں ورنہ شگفتہ اسے برباد کر دے گی کیونکہ شگفتہ ندیم سے اس کی دولت سے محبت کرتی ہے ندیم روزانہ ہزاروں روپے بینک سے نکلوا رہا ہے اگر یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تو فرم دیوالیہ ہو جائے گی۔

میں نے اکاؤنٹنٹ کا شکریہ ادا کیا اور گھر لوٹ آئی۔ مگر مجھے ایک پل کو بھی چین نہ تھا لگتا تھا کہ میں جیتی ہوئی بازی ہارنے لگی ہوں۔ کیا جوگن والے عمل کا اثر ختم ہو گیا ہے؟ ندیم کی بے رخی اور راتوں کو دیر سے گھر آنے کی وجہ معلوم ہو گئی تھی۔ جی چاہتا کہ شگفتہ کو گولی مار دوں کیونکہ اس نے میرا چین اور سکون لوٹ لیا تھا۔

اچانک میرا دھیان جوگن کی طرف چلا گیا کہ کیوں نہ جوگن کو کہہ کر شگفتہ کو ندیم کی زندگی سے نکلوا دوں، اب میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔

میں نے کافی رقم پرس میں ڈالی اور روپا کی ماں کو بتائے بغیر جنگل کی طرف روانہ ہو گئی، میں وہاں پہنچی تو جوگن وہاں نہ تھی اس کی کٹیا مسمار ہو چکی تھی اور جوگن کا وہاں نام و نشان نہ تھا۔ میں مایوس ہو کر روپا کی ماں کے پاس آ گئی، میں نے اسے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی جوگن کی عدم موجودگی کا بھی بتایا تو وہ کہنے لگی۔ ”جوگن تو ہندوستان چلی گئی ہے ان لوگوں کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا اب اگر تم چاہو تو میں تمہارے ساتھ ہندوستان کا سفر کر سکتی ہوں یہ تو تم تسلیم کرتی ہو کہ جوگن ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے اب بھی وہ تمہاری مدد کرے گی وہی شگفتہ کو ندیم کی زندگی سے نکال سکتی ہے اب تو اسے تلاش کرنا ہوگا کہ وہ کہاں ٹھکانہ کیے ہوئے ہے۔“

میں اس وقت کوئی فیصلہ نہ کر سکی اور روپا کی ماں کو پھر آنے کا کہہ کر گھر لوٹ آئی۔ رات بھر میں یہ سوچتی رہی کہ میں جوگن کی تلاش میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ بالآخر میں نے جوگن سے ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیا مگر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

اگلی رات جب ندیم حسب معمول دیر سے گھر آیا تو میں پھٹ پڑی۔

ندیم نے تحمل سے میری بات سنی اور کہنے لگا۔ ”نیلم! میں تم سے شادی ہونے سے قبل بھی شگفتہ سے محبت کرتا تھا اب بھی کرتا ہوں میں اس سے شادی کر کے اسے علیحدہ گھر میں رکھوں گا اور تمہارے حق پر ڈاکہ نہ ڈالوں گا۔“

”شگفتہ کی محبت فریب ہے اسے تم سے نہیں تمہاری دولت سے محبت ہے۔“ میں نے دعوے سے کہا۔

”جھوٹ کہہ رہی ہو تم۔ محبت کا تو کوئی پیمانہ ہی نہیں ہوتا۔“ ندیم نے دلیل پیش کی۔

”تم محبت کو ترازو میں تولنے لگے ہو ندیم! تمہاری

بے رخی میری جان لے لے گی۔"

"تم مردی نہیں۔ میری اور شگفتہ کی شادی ہو جانے پر...... ہاں اگر میں نے شگفتہ سے شادی نہ کی تو وہ ضرور مر جائے گی کیونکہ وہ تو رات کو بھی میری تصویر اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی ہے۔"

ندیم کا جواب سن کر میں رونے لگی مگر ندیم نے میری پرواہ نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا۔ تمام رات میں نے انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزار دی، کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ندیم کو کیسے شگفتہ کے جادو سے آزاد کراؤں۔

اگلے روز میری ایک سہیلی مجھ سے ملنے کے لئے آ گئی، میں نے اسے تمام حالات بتائے اور کہا۔ "تم ہی بتاؤ کہ اب میں کیا کروں؟ میں ندیم کو کسی صورت کھونا نہیں چاہتی۔ اگر اس نے شگفتہ سے شادی کر لی تو وہ اسی کا ہو کر رہ جائے گا۔ اور میں اپنی محبت کا بٹوارہ برداشت نہ کر پاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی میں سسک سسک کر دم توڑ دوں گی یا خودکشی کر لوں گی۔"

میری سہیلی نے مجھے تسلی دی اور کہنے لگی۔

"نیلم! تم جادو ٹونے کے چکروں سے نکل آؤ۔ اور کسی اللہ کے نیک بندے کے پاس جاؤ۔ یہ جادوگر اور جوگی لوگ رقم بٹورنے کے لئے ایسے عمل کرتے ہیں اور ان میں بعض اوقات انسان کی جان بھی چلی جاتی ہے۔"

"بتاؤ...... کسی اللہ کے نیک بندے کا اتا پتا۔؟"

"ایک بزرگ کو میں جانتی ہوں۔ وہ اللہ کے برگزیدہ اور نیکوکار بندے ہیں وہ لوگوں کی بے لوث خدمت کرتے ہیں کسی سے کچھ نہیں لیتے ان کے ڈیرے پر لوگوں کا جم غفیر رہتا ہے۔ میں تمہیں ان کے پاس لے چلوں گی۔ امید ہے وہ تمہارے مسئلہ کا حل نکالیں گے۔"

وہاں تو سینکڑوں کی تعداد میں لوگ جمع تھے جن میں غریب بھی تھے اور کاروں والے بھی۔ ان کی نورانی صورت دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ چاند ہوں۔ اور اپنی چاندنی ہر طرف بکھیر رہے ہوں۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد میری باری آئی تو میں نے اپنا دکھڑا ان کو سنایا۔ یہاں تک کہ میرے آنسو نکل آئے۔

انہوں نے مجھے تسلی دی اور کہنے لگے۔ "بیٹا تم کل پھر آنا اور ندیم کے استعمال کی کوئی بھی چیز لیتی آنا جو وہ استعمال کرتا ہو۔ اس کی شرٹ وغیرہ مگر دھلی ہوئی نہ ہو اس کے بعد ہی میں تمہیں کوئی چیز دوں گا۔"

اگلے روز میں ندیم کی ایک شرٹ لے کر وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئی وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے کسی سائل کو نہیں ملتے تھے مگر انہوں نے مجھ پر خاص مہربانی کی اور مجھے اندر بلا لیا۔ وہ اسی وقت ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تھے انہوں نے ندیم کی شرٹ لے لی اور اس پر اپنی تسبیح پھیر کر مجھے لوٹا دی۔ پھر انہوں نے مجھے ایک تعویز لکھ کر دیا اور کہا۔ "میں یہ تعویز ندیم کے تکیہ کے اندر رکھ دوں۔ انہوں نے مجھے ایک اور نصیحت بھی کی اور پھر ایک عمل بتایا اور کہنے لگے۔

"شگفتہ کی محبت میں کھوٹ ہے۔ اس کی حقیقت ندیم پر واضح ہو جائے گی اور وہ اس کی زندگی سے خود ہی نکل جائے گی۔"

ان کا بتایا ہوا عمل نہایت ہی خطرناک تھا۔ مگر میں نے اس کو کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا کہ جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا مجھے بزرگ پر اعتماد تھا کہ جیت یقیناً میری ہو گی۔ میں نے گھر آ کر تعویز ندیم کے تکیہ کے اندر رکھ کر تکیہ سی دیا۔

اگلی صبح جب ندیم دفتر جانے لگا تو میں نے اسے کہا۔

"آج تم شگفتہ کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں اور پرکھنا چاہتی ہوں کہ وہ تم سے کتنی محبت کرتی ہے اگر اس کی محبت سچی ہوئی تو میں تمہیں خوشی سے اس کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دوں گی۔"

ندیم نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "سچ کہہ رہی ہو۔؟"

"ہاں سچ، میں نے کہا۔"

"یقین نہیں آ رہا کہ سورج مغرب سے بھی

طلوع ہوسکتا ہے۔"

"آج طلوع ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں شگفتہ کو ساتھ لیتا آؤں گا۔ مگر وعدہ کرو تم اس سے بدتمیزی نہیں کرو گی۔"

"پکا وعدہ۔" میں نے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔

ندیم چلا گیا تو میں بھی بازار کی طرف نکل گئی اور تھوڑی تلاش کے بعد مطلوبہ چیز خرید لائی۔

☆......☆......☆

ندیم دفتر سے لوٹا تو شگفتہ اس کے ہمراہ تھی۔ اپنی رقیب کو دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر میں نے کمال ضبط سے اس کا استقبال کیا میں نے ندیم اور شگفتہ دونوں کو ڈرائنگ روم میں بیٹھایا اور خود چائے بنانے کے لئے کچن میں آ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد چائے بنا کر واپس ڈرائنگ روم میں آئی تو ٹرالی میں صرف دو پیالیاں تھیں۔

"نیلم! دو پیالیاں کیوں لائی ہو۔ تین لانی تھیں۔" ندیم نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"یہ چائے صرف میں اور شگفتہ پئیں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں۔؟" ندیم چونک کر بولا۔

"آج میری اور شگفتہ کی محبت کا کڑا امتحان ہے ان دونوں پیالیوں میں سے کسی ایک میں زہر ملا ہوا ہے، اتنا تیز زہر جو صرف پانچ منٹ میں انسان کی زندگی ختم کروا دے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

ندیم اور شگفتہ دونوں چونک گئے۔

"نیلم! تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔؟" ندیم غصے سے بولا۔

"نہ تو یہ پاگل پن ہے اور نہ ہی مذاق۔ یہ میری اور شگفتہ کی محبت کا امتحان ہے۔ اس لئے تم بیچ میں مت بولو ندیم۔" میں نے اسی انداز میں کہا اور میں شگفتہ سے مخاطب ہوئی۔

"تم اپنی مرضی سے کوئی بھی پیالی اٹھا لو۔ اس کے بعد دوسری پیالی میں اٹھا لوں گی، ہم دونوں ساتھ ساتھ چائے پئیں گی۔ پھر ہم دونوں میں سے جو بھی ندیم کے مقدر میں ہوئی اسے مل جائے گی۔ یہ میری اور تمہاری محبت کا امتحان ہے کیونکہ میں اپنی محبت میں ہوزہ برداشت نہیں کر سکتی، آج میں نہیں یا تم نہیں۔"

"نیلم! یہ تو سراسر حماقت ہے انسان خواہ مخواہ موت کے منہ میں کیوں جائے۔" شگفتہ خوف زدہ ہو کر بولی۔

"خواہ مخواہ نہیں۔ بلکہ محبت کی خاطر۔ کیا تم ندیم سے محبت نہیں کرتی ہو۔؟ کیا تم اس کو پانے کے لئے اس امتحان سے نہیں گزر سکتیں۔؟" میں نے اسے شرمندہ کرنا چاہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے اور سچ ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں لیکن خودکشی بھی تو نہیں کر سکتی یہ تو پاگل پن والی بات ہو گی۔" وہ دھیمے انداز میں بولی۔

"تو پھر کہو نا کہ تمہیں ندیم سے نہیں اس کی دولت سے محبت ہے۔"

"یہ کیا حماقت ہے نیلم!" ندیم نے جھلا کر کہا۔

"حماقت نہیں۔ حقیقت کہو ندیم! میری اور شگفتہ کی محبت کا فیصلہ ہو چکا، موت کا چانس تو ففٹی ففٹی ہے۔ شگفتہ کی بجائے میں مر سکتی ہوں مگر شگفتہ اس امتحان میں فیل ہو گئی ہے کیونکہ اسے تم سے نہیں تمہاری دولت سے محبت ہے۔ جبکہ میں تم سے اور تمہاری روح سے محبت کرتی ہوں۔ تم کہو تو ندیم میں یہ دونوں پیالیوں کی چائے پی جاتی ہوں۔"

میرا اٹل لہجہ دیکھ کر شگفتہ اٹھی اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔ ندیم نے بھی اسے نہ روکا۔ ندیم اٹھا اور میری طرف بڑھا۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ میں اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ مگر وہ خوشی کے آنسو تھے وہ آنسو جو انسانی احساسات کا عکس ہوتے ہیں، ندیم کا سنگ پا کر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ندیم کی بانہوں میں نہیں۔ رنگ برنگے پھولوں میں گھر گئی ہوں۔
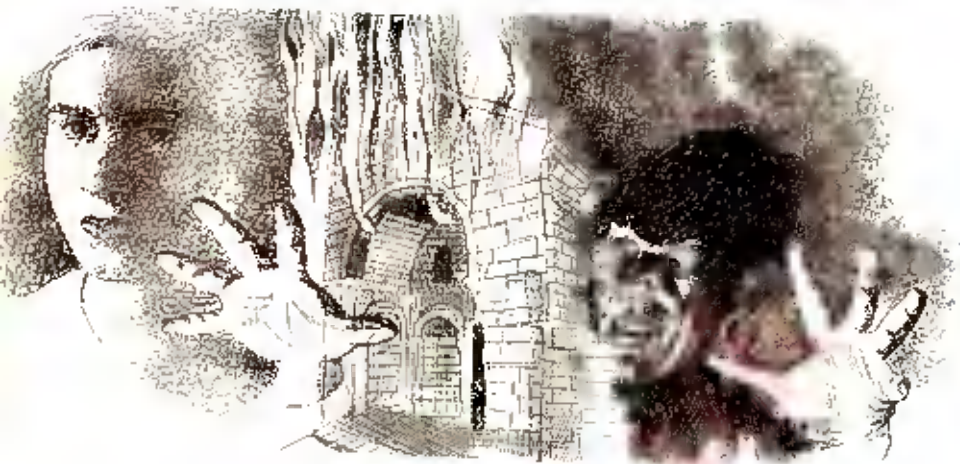
روح کی خواہش

ملک فہیم ارشاد۔ ڈجکوٹ فیصل آباد

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک فلک شگاف نسوانی چیخ نے قرب و جوار کو دہلا کر رکھ دیا، چیخ سن کر علاقے کے لوگ اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے، وہ عجیب خوفناک کان پھاڑ چیخ تھی۔

ایک روح کی لرزہ خیز داستان جسے پڑھ کر یقیناً رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے

انسپکٹر شکور کے دروازے پر زوردار انداز میں دستک ہوئی۔ ''کون ہے بھئی۔'' انسپکٹر نے دروازہ کھولتے ہوئے پہلے احتیاطاً پوچھ لیا۔

''نذیر ہوں انسپکٹر صاحب۔'' باہر سے حوالدار نذیر کی آواز آئی۔

''انسپکٹر نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی گرادی سامنے واقعی حوالدار نذیر کھڑا تھا۔'' خیر تو ہے نذیر ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میں تھانے سے آیا ہوں۔'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''خیر نہیں صاحب چاچا اکبر آیا ہے اور بڑا پریشان ہے کہہ رہا ہے اس کی زمینوں پر کسی کی لاش پڑی ہے۔'' حوالدار نذیر نے وجہ بتائی۔

''اللہ خیر کرے۔'' تم چلو میں وردی پہن کر آتا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا تو حوالدار نذیر اثبات میں

سر ہلا کر واپس چلا گیا۔

انسپکٹر وردی پہننے کے بعد تھانے میں آ گیا۔ اس نے اکبر کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "ہاں تو چاچا کس کی لاش ملی ہے تمہیں۔" انسپکٹر نے گہری نگاہوں سے اکبر کا معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تھانیدار صاحب یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون ہے پر وہ ایک لڑکی کی لاش ہے۔" اکبر نے بتایا۔

"تمہیں وہ لاش کیسے ملی۔؟" انسپکٹر نے کریدتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب میں ڈیرے پر ہی سوتا ہوں صبح ڈیرے پر بندھا کتا مجھے اٹھاتا ہے۔ لیکن آج خلاف معمول اس کے بھونکنے کی آواز سن کر میں جاگ اٹھا۔

"کیوں بھونک رہا ہے تو؟" میری نیند خراب کردی تو نے میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ لیکن تھانیدار صاحب میرا کتا مسلسل بھونکتا رہا، میں اٹھ کر اس کے قریب آیا تو وہ ایک درخت کی طرف دیکھ کر بھونک رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کتا ایویں نہیں بھونک رہا، ادھر درخت کے پاس ضرور کچھ ہے۔ میں ڈیرے کے اندر سے لالٹین اٹھا کر لایا اور کتے کی پیروی میں درخت کے قریب پہنچا تو لالٹین میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی وہاں ایک لاش پڑی ہوئی تھی جس کے چہرے کا برا حال تھا، لیکن میں نے کپڑوں اور جسامت سے اندازہ لگایا کہ وہ لاش لڑکی کی تھی، میں الٹے پیروں تھانے اطلاع دینے کے لئے آ گیا۔" اکبر نے تفصیل سے ساری بات بتاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے چاچا پھر چلتے ہیں۔" انسپکٹر کا چھوٹا سا قافلہ اکبر کی زمینوں کی طرف چل پڑا، انسپکٹر کے ساتھ چار کانسٹیبل تھے جنہوں نے ہاتھوں میں لالٹین پکڑ رکھی تھیں، جلد ہی وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئے، انسپکٹر نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا لاش واقعی لڑکی کی تھی، جس کے چہرے کا برا حال تھا چہرے سے جگہ جگہ گوشت غائب تھا اور خون سے رنگی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں انسپکٹر نے اس لڑکی کی عمر کا اندازہ انیس اور بیس کے قریب لگایا، جسم کے حساب سے وہ گوری چٹی لڑکی تھی، اس کی کلائی میں لال رنگ کی چوڑیاں اور جسم پر بادامی کلر کا سوٹ تھا ظاہری سی بات ہے وہ لڑکی زندگی کی قید سے آزاد تھی۔

اچانک تھوڑی دور لالٹین کی روشنی میں انسپکٹر کی نگاہ کسی چیز پر پڑی انسپکٹر لالٹین کی رہنمائی میں اس چیز کے قریب پہنچا تو وہ کپڑوں کی گٹھڑی تھی۔ انسپکٹر کے دماغ نے اسی وقت اندازوں کی کہانی جوڑی۔ "یہ لڑکی گھر سے بھاگی ہوگی، عاشق زیورات کا بھوکا ہوگا، زیورات چھیننے کے بعد اس نے لڑکی کا خون کر دیا ہوگا۔"

لیکن جیسی لاش کی حالت تھی اس سے تو یہی اندازہ قائم ہوتا تھا کہ یہ کسی انسان کا کام نہیں، انسپکٹر نے اپنا دوسرا خدشہ دور کرنے کے لئے اس گٹھڑی کو کھولا تو اس میں چند سوٹ چند جوڑے اور ایک پوٹلی تھی انسپکٹر نے پوٹلی کھولی تو پوٹلی میں کچھ زیورات موجود تھے۔ یعنی کسی نے زیورات کے حصول کے لئے بھی یہ قتل نہیں کیا تھا انسپکٹر نے لالٹین کی روشنی میں وہاں دیکھا چاچا اکبر کی جوتیوں کے نشان کے علاوہ وہاں بڑے بڑے پاؤں کے اور بھی نشان تھے جو کسی مرد کے ہی ہو سکتے تھے۔

انسپکٹر نے اکبر کے ڈیرے سے چارپائی منگوائی اور لاش کو چارپائی پر رکھ دیا پھر اکبر کی بیل گاڑی پر وہ لاش تھانے میں لے آیا۔

"نذیر صبح کی اذان ہونے والی ہے مولوی صاحب سے کہہ دینا کہ اس لاش کا اعلان بھی کر دیں۔" انسپکٹر نے حوالدار نذیر کو سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا تھانے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

"کالی ہو تم۔" جواں سال احمد نے پندرہ سالہ حمیرا کا دل توڑا۔ "تو کیا ہوا کالے کیا انسان نہیں ہوتے۔" حمیرا نے دکھی دل کے ساتھ کہا۔

"ہوتے ہیں۔" احمد نے اثبات میں سر ہلایا ساتھ ہی وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"جاؤ میں تم سے بات نہیں کرتی۔" حمیرا نے منہ بنایا۔

"لیکن میں تو تم سے بات کروں گا۔" احمد نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تو کالی ہوں۔" حمیرا نے بدستور منہ بناتے ہوئے کہا۔

"کالی تو تم ہو..... لیکن ہو تو میری دوست۔" احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم کالے لوگوں سے دوستی ہی کیوں کرتے ہو اگر وہ تمہیں پسند نہیں تو۔" حمیرا نے بلکتے ہوئے کہا۔

"ارے تم نے رونا شروع کر دیا۔" احمد گھبراتے ہوئے بولا۔ "دیکھو رو مت اگر تم روؤ گی تو تمہاری آنکھوں میں موجود سرمہ تمہارے گالوں پر پھیل جائے گا اور تم مزید کالی لگو گی۔"

حمیرا کو ایک مرتبہ پھر احمد کی زوردار ہنسی سنائی پڑی اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی کلاس روم کی طرف بڑھ گئی اور احمد اسے آوازیں دیتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگا۔

"مہرو۔"

اچانک حمیرا کے شوہر ریاض نے اسے ماضی کی یادوں سے کھینچا۔ ریاض پیار سے حمیرا کو مہرو کہہ کر پکارتا تھا۔ "ہوں۔" وہ چونکی۔

"میں ڈیرے کی طرف جا رہا ہوں۔ آج کام بہت ہے ظہر کی اذان کے وقت کھانا لے آنا، رات کو فصلوں کو پانی بھی دینا ہے اس لئے رات کو دیر ہو جائے گی۔" ریاض ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا، اس نے چارپائی کے پائے پر لٹکے اپنے سفید رومال کو اتارا اور کندھے پر رکھ لیا۔

"ٹھیک ہے۔" حمیرا نے اثبات میں سر ہلایا تو ریاض اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔

حمیرا کا چھوٹا سا مٹی کا گھر تھا جس میں تین کمرے تھے اور ایک چھوٹا سا باتھ روم اس کے بعد چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن میں لکڑی کی چوکی دیوار کے ساتھ پڑی تھی۔ ایک طرف مٹی کا چولہا تھا۔

ریاض کے جانے کے بعد حمیرا نے ایک گہری سانس کھینچی اور اٹھ کر چولہے کے پاس پڑے برتن سمیٹنے لگی برتن دھونے کے بعد وہ لکڑی کی چوکی پر آ کر بیٹھ گئی۔

اس وقت دروازے پر دستک ہوئی اس نے باہر دیکھا تو اس کی ہمسائی ماسی صغراں تھی حمیرا نے اس کے لئے چائے بنائی۔ "ماسی بڑے دنوں بعد چکر لگایا ہے۔" حمیرا نے چائے کی پیالی ماسی صغراں کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں پتر میں اپنے میکے گئی ہوئی تھی بڑے بھائی کی بچی کے دن رکھنے تھے۔" ماسی صغراں نے غیر حاضری کی وجہ بتائی۔

"اور تو سنا تیرا گھر والا ٹھیک ہے ناں۔"

"ہاں ماسی اللہ کا شکر ہے۔" حمیرا نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"تو بھی کبھی اپنے میکے ہو آیا کر جب سے بیاہ کر آئی ہے کبھی کبھار ہی جاتی ہے۔ تیرا دل نہیں کرتا اپنے ماں پیو سے ملنے کو۔" ماسی صغراں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"بس ماسی کیا کروں جب سے ریاض کے ابا کا انتقال ہوا ہے تب سے اسے چھوڑنے کو دل نہیں کرتا اگر میں میکے چلی جاؤں گی تو اس کا خیال کون رکھے گا، وہ تو مجھے کئی بار کہہ چکا ہے لیکن میرا دل نہیں کرتا جانے کو، اماں ابا کے پاس تو بھائی بھابیاں ہیں چھوٹی بہنیں ہیں لیکن ریاض یہاں اکیلا ہے۔" حمیرا نے وجہ بتائی۔

یہ سن کر ماسی صغراں مسکرائی۔ "واری جاؤں اپنے اللہ پر نازوں سے پلی بیٹیاں غیروں کے ہاتھوں دینے کو جی نہیں چاہتا لیکن دینی پڑتی ہے، بیٹیاں گھر چھوٹ جانے سے روتی ہیں لیکن پھر اللہ ان کے شوہروں میں ایسا دل لگا دیتا ہے کہ ان کا اپنے ماں باپ کے گھر جانے کو جی نہیں کرتا، اپنے مجازی خدا کی فکر لگی رہتی ہے، واقعی پتر اللہ کی ہر بات میں حکمت ہے، اب ایسی ہی مثال اور لے لو جب اپنا کوئی عزیز فوت ہوتا ہے تو اسے مٹی کے حوالے کرنے کو دل نہیں کرتا لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کی یادیں بھی ختم ہو جاتی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ صبر دے دیتا ہے، اللہ کی غفور و رحیم ذات کا انداز ہی نرالا ہے۔" ماسی صغراں نے کہا۔

"ہاں ماسی وہ بڑی مہربان ذات ہے۔" حمیرا نے ماسی صغراں کی تائید میں سر ہلایا۔

"پتر تو نے بھلا کچھ سنا۔" ماسی صغراں حمیرا کے تھوڑی قریب ہوئی۔

"کیا ماسی؟" حمیرا حیران ہوئی۔

"رات تھانیدار کو ایک لڑکی کی لاش ملی ہے۔" ماسی دھیمے لہجے میں بولی۔

"لل.....لاش.....؟" حمیرا گھبرائی۔

"ہاں پتر..... ابھی لاش کی شناخت نہیں ہوئی اور پتہ کیوں.....؟" ماسی صغراں نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی۔

"کیوں ماسی۔؟" حمیرا نے پوچھا۔

"لاش کے چہرے کا برا حال تھا، تھانیدار گاؤں سے پتہ کروا رہا ہے..... اور مجھے معلوم ہے وہ کس کی لڑکی ہے؟" ماسی صغراں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ماسی۔؟" حمیرا نے حیرت سے پوچھا۔

"میری ہمسائی ہے نہ شاداں (شاہدہ) اس کی بیٹی ہے رضیہ۔" ماسی صغراں کا لہجہ بدستور دھیما تھا۔

"شاداں کی بیٹی۔" حمیرا نے حیرت کے باعث منہ میں انگلی ڈالی۔

"پتر اس کا اکرم کمہار کے ساتھ چکر چل رہا ہے۔" ماسی صغراں نے بتایا۔ "اچھا۔" حمیرا نے حیرانگی سے لفظ "اچھا" کو ادا کیا۔

"ہاں پتر..... گھڑا لینے کے بہانے کئی دفعہ اس کی دکان پر گئی تھی، میں بھی اس دن اس کی دکان سے گھڑا خریدنے گئی تھی..... "یہ گھڑا کتنے کا ہے؟" رضیہ نے ایک گھڑے کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کے لئے مفت، بلکہ یہ سارے گھڑے آپ کے لئے مفت" اکرم کمہار نے پیار سے کہا۔ "میں اس وقت اپنے لئے کوئی اچھا سا گھڑا ڈھونڈ رہی تھی اکرم کی اس بات پر میں چونکی اور گھوم کر دونوں کی طرف دیکھا رضیہ نے غصے سے آنکھوں کے ذریعے میری طرف اشارہ کیا اکرم کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب ہے آپ چاچے رحمو کی بیٹی ہو اور چاچا رحمو میرے ابے کا بڑا اچھا یار ہے۔"

میں تو گھڑا لے کر واپس آ گئی پر رضیہ اس کی دکان پر کافی دیر بیٹھی رہی۔ اس کے بعد بھی میں نے ان کی ملاقاتیں دیکھیں ایک دن میں کھوہ سے پانی بھرنے گئی تو میں نے دیکھا کھوہ سے تھوڑی دور ایک درخت کے سائے میں دونوں بیٹھے ہوئے تھے تھوڑی دیر بعد اکرم اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ میں ایسا شرمناک منظر دیکھ کر واپس آ گئی، آج صبح جب میں شاداں کے گھر گئی تو وہ رو پیٹ رہی تھی، میں نے شاداں کے شوہر احمد سے پوچھا تو اس نے کہا۔ "شاداں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے رضیہ کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ "اپنے چاچے نور دین کے گھر دوسرے گاؤں گئی ہے۔" پر حمیرا پتر میں نے بھی اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے شاداں کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے وہ بیٹی کے غم سے رو رہی تھی، باقی تھانیدار نے ابھی انہیں تھانے نہیں بلایا سویرے فجر ویلے تھانیدار نے گاؤں کی مسجد میں اعلان کروا دیا ہے کہ اسے ایک نوجوان لڑکی کی لاش ملی ہے جو تھانے میں پڑی ہے ابھی تو پتر سویرا سویرا ہے باقی پتہ چل ہی جائے گا کہ وہ لاش رضیہ بے چاری کی ہی ہے۔" یہاں تک کہہ کر ماسی صغراں گہرے گہرے سانس لینے لگی وہ ایک ہی سانس میں کئی باتیں کر گئی تھی۔

"تو ماسی اکرم کمہار کہاں ہے۔؟" حمیرا نے پوچھا۔

"اس کا تو پتر مجھے معلوم نہیں۔ اب میں اس کے گھر ہی جا رہی ہوں تاکہ معلوم ہو کہ وہ گھر پر ہے کہ نہیں۔" ماسی صغراں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ماسی مجھے بھی بتانا۔" حمیرا بھی ماسی صغراں کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں پتر اکرم کے گھر سے ہونے کے بعد میں تیری طرف ہی آؤں گی۔" ماسی صغراں نے کہا، ماسی صغراں کے جانے کے بعد حمیرا نے لکڑی کی چوکی سے خالی پیالیاں اٹھائیں اور دھونے کے بعد برتنوں کی الماری

میں رکھ دیں حمیرا کی یہ پرانی عادت تھی کہ وہ کوئی بھی برتن زیادہ دیر تک گندا نہیں رہنے دیتی تھی وہ واپس لکڑی کی چوکی پر آ کر بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

ریاض حمیرا کے لئے اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ وہ اس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ حمیرا تو ویسے بھی موم کی گڑیا تھی۔ جلد ہی وہ پگھل گئی اور وہ بھی شادی کے بعد ریاض سے محبت کرنے لگی اس کا سسر نور محمد بھی اچھا آدمی تھا۔ نور محمد اکثر بیمار رہتا تھا۔ ایک دن وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ حمیرا پہلے ہی اپنے ماں باپ کے ہاں کم جاتی تھی کیونکہ جب بھی وہ گاؤں جاتی تھی تو احمد کی یادوں کے زخم تازہ ہو جاتے تھے۔ وہ ریاض کے ساتھ کبھی کبھار صبح اپنے ماں باپ کے گھر جاتی اور شام کو واپس آ جاتی۔ لیکن نور محمد کے مرنے کے بعد اس نے اپنے ماں باپ کے گھر جانے کا سلسلہ ترک کر دیا تھا۔ اب ریاض کی خدمت ہی اس کا نصب العین تھا۔ اس نے کافی کوششیں کی اپنے محبوب احمد کو بھول جائے مگر احمد کی یادیں اس کا پیچھا بھلا کہاں چھوڑنے والی تھیں۔

"اللہ ... کے نام پر کچھ دے دو۔ اچانک ایک فقیر کی صدا نے اسے ماضی کی یادوں سے باہر کھینچا حمیرا چونکی اس نے دیکھا دروازے پر ایک بوڑھا فقیر ہاتھ میں کشکول لئے کھڑا تھا حمیرا نے روٹی اور سالن فقیر کو دے دیا۔ "بیٹی اگر کوئی پرانا کپڑا تن ڈھانپنے کے لئے مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔" فقیر التجائیہ لہجے میں حمیرا سے مخاطب ہوا۔

حمیرا نے دیکھا فقیر کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے ہیں۔ "اچھا بابا تم یہیں رکو میں تمہارے لئے کوئی کپڑا لاتی ہوں۔" اتنا کہہ کر حمیرا واپس اندر آئی اس نے ریاض کا پرانا سوٹ فقیر کو دے دیا۔

حمیرا ایک بات پر حیران تھی اور حیرت دور کرنے کے لئے اس نے فقیر سے پوچھ ہی لیا۔ "بابا مجھے لگتا ہے میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا ہے۔" حمیرا نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا ہم تو گلیوں کے مسافر ہیں ہر گھر کے آگے صدا لگاتے ہیں ہر گھر والا ہمیں پہچانتا ہے۔" بوڑھے فقیر نے مسکراتے ہوئے کہا حمیرا کو فقیر کی ہنسی بڑی بھلی لگی بوڑھے فقیر کے جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کر لیا۔

☆......☆......☆

لاش کی شناخت ہو گئی تھی وہ لڑکی رحمو کی بیٹی رضیہ ہی تھی۔ رضیہ کی ماں شاداں نے رضیہ کے کپڑوں کی گٹھڑی دیکھ کر ہی رونا شروع کر دیا تھا باقی آدھی تصدیق شاداں اور رحمو نے لاش دیکھنے کے بعد کر دی تھی کیونکہ رضیہ انہی کپڑوں میں گھر سے غائب ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنی جوان بیٹی کی لاش پر آنسو بہا رہے تھے انسپکٹر اپنے کمرے میں آ گیا۔ "نذیر جب شاداں اور رحمو فارغ ہو جائیں تو رضیہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے اسپتال بھیج دینا......" انسپکٹر نے حوالدار نذیر کو تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"جی اچھا" حوالدار نذیر نے مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔

شاداں اور رحمو کا رونا کافی دیر جاری رہا جب ان کی حالت کچھ سنبھلی تو انسپکٹر نے دونوں کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ انسپکٹر نے دیکھا دونوں میاں بیوی کی آنکھیں رو رو کر سوجھ گئیں تھیں۔ جوان اولاد کا غم جب بڑھاپے میں ناقابل برداشت ہو جائے تو اس کا درد انسپکٹر اچھی طرح جانتا تھا۔

"تھانیدار صاحب ہماری رضیہ کی لاش کب ملے گی؟ تاکہ ہم اس کے کفن دفن کا بندوبست کر سکیں۔" رحمو نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"لاش تو رحمو شام کو ہی ملے گی کیونکہ اس کا پوسٹ مارٹم کرنا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"تھانیدار صاحب میری بچی کا تو پہلے ہی کسی نے برا حال کر دیا ہے اوپر سے آپ اس کی چیر پھاڑ کر رہے ہیں۔ اللہ کا واسطہ ایسا نہ کریں۔" شاداں نے روتے ہوئے انسپکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"دیکھو شاداں بہن یہ ہمارا کام ہے ہمارا فرض ہے اگر رضیہ کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہ ہوا تو یہ کیسے پتہ چلے گا

کہ رضیہ کا خون کیسے ہوا کس نے ہوا، یہ باتیں پوسٹ مارٹم کے بغیر پتہ ہی نہیں چلیں گی رضیہ کو تو میں واپس نہیں لاسکتا ہاں البتہ اس کے قاتل یا قاتلوں کو سخت سے سخت سزا دلواؤں گا۔'' انسپکٹر پختہ لہجے میں بولا۔

''تھانیدار صاحب گھر میں مہمان لوگ تعزیت کے لئے آئے ہوئے ہیں ہم کیا گھر جاسکتے ہیں۔'' رحمو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے مہمانوں سے زیادہ تمہارے بیانوں کی ضرورت ہے۔'' اس مرتبہ انسپکٹر ذرا سخت لہجے میں بولا اور انسپکٹر کے یکدم بدلتے رویے کو دیکھ کر رحمو اور شاداں سہم گئے۔

''ہاں تو رحمو یہ کس کا کام ہوسکتا ہے۔ تمہیں کسی پر شک ہے۔'' انسپکٹر نے پہلا سوال کیا۔

''نہیں تھانیدار صاحب مجھے کسی پر بھی شک نہیں۔'' رحمو نے نفی میں سر ہلایا۔

''وقوعہ کے روز رضیہ گھر سے کیسے غائب ہوئی؟'' انسپکٹر نے دوسرا سوال کیا۔ ''تھانیدار صاحب ہم تینوں اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے آدھی رات کے بعد میری آنکھ کھلی تو رضیہ اپنی چارپائی پر موجود نہیں تھی میں نے سوچا باتھ روم میں گئی ہوگی لیکن جب کافی دیر گزرنے کے باوجود کوئی بھی باتھ روم سے باہر نہ نکلا تو میں نے اٹھ کر باتھ روم کا دروازہ کھولا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے گھر کے باقی کمروں میں دیکھا تو رضیہ کہیں بھی موجود نہیں تھی میں نے شاداں کو اٹھایا اور ساری صورتحال سے آگاہ کیا تو وہ پریشان ہوگئی۔ تھانیدار صاحب جوان بیٹی کا معاملہ تھا ہم نے پڑوسیوں کو اس وقت جگانا مناسب نہیں سمجھا سوچا صبح تھانے جاکر رپورٹ درج کراؤں گا ساری رات پریشانی میں گزری شاداں تو روتی رہی۔ اچانک شاداں رضیہ کے کمرے میں گئی تو اس نے مجھے آواز دی میں رضیہ کے کمرے میں گیا تو شاداں نے بتایا کہ کمرے میں سے رضیہ کے زیور اور کپڑے بھی غائب ہیں۔ یعنی وہ اپنی مرضی سے اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ میں نے شاداں پر غصہ ہونا شروع کردیا کہ اسے اس بارے میں معلوم ہے شاداں نے قسمیں کھائیں کہ اسے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہم دونوں اسی بحث میں مصروف تھے کہ فجر کی اذانیں ہونے لگیں اذان کے بعد اعلان ہوا کہ تھانے والوں کو ایک لاش ملی ہے مولوی صاحب نے لاش کی جو نشانیاں بتائیں تھیں اس سے ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ لاش رضیہ کی ہی ہے پہلے تو ہم دونوں میاں بیوی میں ہمت نہ ہوئی کہ جاکر لاش دیکھ لیں پھر تھانیدار صاحب ہمیں ہمت کرنا پڑی لاش واقعی ہماری رضیہ کی تھی۔'' اتنا کہہ کر رحمو ایک مرتبہ پھر رونے لگا۔

انسپکٹر نے جائے وقوعہ سے ملنے والی کپڑوں کی گٹھڑی رحمو اور شاداں کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی جسے وہ فوراً پہچان گئے۔ ''رحمو اس گٹھڑی کے ملنے سے ایک بات تو واضح ہے۔'' انسپکٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا تھانیدار صاحب۔؟'' رحمو نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ کم از کم یہ قتل رضیہ کے عاشق نے نہیں کیا؟'' انسپکٹر شکور نے پختہ لہجے میں کہا۔

''وہ کیسے تھانیدار صاحب؟'' رحمو نے بظاہر پوچھا۔

''وہ ایسے کہ رحمو اگر رضیہ کا عاشق اس کا خون کرتا تو یہ گٹھڑی جائے وقوعہ سے نہ ملتی یہ گٹھڑی وہاں سے ملی ہے اس کا مطلب ہے رضیہ کا عاشق اس کا قاتل نہیں ہے۔'' انسپکٹر نے اپنا نقطہ بیان کیا۔

''لیکن تھانیدار صاحب ہوسکتا ہے رضیہ کے قتل کی وجہ زیورات نہ ہوں بلکہ۔'' رحمو نے شاداں کی طرف دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی اور انسپکٹر رحمو کی ادھوری بات کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔

''میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں رحمو۔ پر ایسی کوئی بات نہیں رضیہ کی لاش کی حالت سے بالکل بھی ایسا نہیں لگتا کہ اس کے ساتھ کسی بھی طرح کی زیادتی ہوئی ہو بلکہ مجھے یہ کام کسی انسان کا کم بلکہ.....'' انسپکٹر کہتے کہتے رکا۔

"تو پھر یہ کس کا کام ہے تھانیدار صاحب۔" رحمو نے متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کسی درندے یا حیوان کا کام لگتا ہے۔" انسپکٹر نے بولا۔ تھوڑی بہت پوچھ گچھ کے بعد انسپکٹر نے شاداں اور رحمو کو گھر جانے کی اجازت دیدی پھر انسپکٹر نے نذیر کو اپنے کمرے میں بلوالیا، تھانے میں موجود محلے میں نذیر مقامی تھا۔ "نذیر تمہیں کیا لگتا ہے۔؟" انسپکٹر رحمو اور شاداں کی گفتگو نذیر کو سناتے ہوئے اس کی رائے جاننی چاہی۔

"انسپکٹر صاحب لاش کی حالت سے تو واقعی ایسا ہی لگتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کام نہیں۔ اور اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ مرحوم رضیہ گھر سے کیوں اور کس کے کہنے پر بھاگی تھی تو اس بارے میں تھوڑی بہت معلومات میں حاصل کرسکتا ہوں۔" نذیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے۔؟" انسپکٹر اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"ہمارے گاؤں میں صغراں ماسی ہے۔ جو گاؤں میں چغلی ماسی کے نام سے مشہور ہے وہ ہر گھر کی خبر رکھتی ہے اس سے کوئی نہ کوئی کام کی بات ضرور معلوم ہوگی۔" نذیر نے کہا۔

"تو پھر دیر کس بات کی جلدی سے جاؤ اور ماسی چغلی سے ملو۔" انسپکٹر نے تیز لہجے میں کہا۔

"انسپکٹر صاحب...... وہ...... وہ کچھ پیسے لے گی اگر ماسی چغلی کو کچھ پیسے مل جائیں تو اس کی زبان فرفر چلے گی۔ ورنہ اس کی زبان بار بار اٹکتی رہ گئی۔" نذیر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہاں ضرور۔" اتنا کہہ کر انسپکٹر نے اپنی پینٹ کی جیب سے اپنا پرس نکالنے لگا۔

☆......☆......☆

وہ کئی گھنٹوں سے گھوڑا بھگا رہا تھا لگتا تھا وہ ہر حال میں اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ آخر کار وہ ایک جھونپڑی کے قریب رکا اس نے گھوڑے کو ایک درخت کے ساتھ باندھا اور خود جھونپڑی کا پردہ ہٹا کر جھونپڑی کے اندر داخل ہوگیا اس جھونپڑی میں ایک بوڑھا آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ بوڑھے کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ بوڑھے نے خستہ حال کپڑے پہن رکھے تھے قدموں کی آہٹ پر اس بوڑھے نے اپنی آنکھیں کھولیں نوجوان لڑکے کو دیکھ کر وہ بوڑھا مسکرایا۔ "تو آگئے تم۔" اس بوڑھے نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔" وہ نوجوان مودبانہ لہجے میں بولا ساتھ ہی وہ زمین پر پڑی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ "لڑکی کی لاش نے پورے گاؤں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔"

اس مرتبہ وہ بوڑھا مسکرایا وہ لڑکا خاموش رہا۔ "اچھا کام کیا تم نے۔"

"آج رات مجھے کیا کرنا ہوگا۔" لڑکے نے سنجیدہ لہجے میں میں پوچھا۔

"آج رات۔" بوڑھے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "آج رات تم نے ایک حیران کن کام کرنا ہے۔" بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا ساتھ ہی بوڑھے نے نوجوان کو کچھ بتایا۔ "تم ضرور کامیاب ہوگے وہ تمہیں ضرور ملے گی کیا نام ہے اس کا۔؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"حمیرا......!" نوجوان لڑکے کے منہ سے نکلا۔

"تمہیں آج رات وہ کام ضرور کرنا ہے" بوڑھے نے کہا تو احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔

احمد دراصل حمیرا کا سابقہ عاشق تھا اس کی اور حمیرا کی شادی نہ ہوسکی تھی اور حمیرا کی شادی ریاض نامی شخص سے ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

انسپکٹر شکور کے کمرے میں نذیر داخل ہوا تو انسپکٹر نے دیکھا نذیر کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ "لگتا ہے نذیر کوئی اچھی خبر لائے ہو۔" انسپکٹر نے نذیر کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی انسپکٹر صاحب ماسی چغلی سے ملاقات سود مند رہی۔" نذیر نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"کیا بتایا ماسی چغلی...... میرا مطلب ہے ماسی صغراں نے۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

"انسپکٹر صاحب رضیہ کا واقعی عشق کا چکر تھا وہ

حشمت کمہار کے بیٹے انور کمہار سے محبت کرتی تھی، دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اکثر کئی جگہوں پر ملتے بھی تھے، ماسی چغلی نے انہیں کئی دفعہ پکڑا بھی تھا نذیر نے کہا۔ ”ہوں۔“ انسپکٹر نے گہری سانس کھینچی۔ ”تو انور کمہار کہاں ہے۔؟“

”وہ اپنے گھر میں ہے۔“ نذیر نے کہا۔

”ٹھیک ہے نذیر پھر اسے لے آؤ تا کہ ہم اس کی مہمان نوازی کرسکیں۔“ انسپکٹر نے کہا تو نذیر اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

رضیہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ چکی تھی، انسپکٹر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا مطالعہ شروع کردیا، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بڑی تہلکہ خیز تھی، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق رضیہ کی موت شہ رگ میں گھسنے والی نوکیلی چیز سے ہوئی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ رضیہ کے جسم سے خون کا قطرہ تک نچوڑ لیا گیا تھا انسپکٹر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کی فائل بند کی اور گہری سوچ میں مبتلا ہوگیا۔ رضیہ کی موت ایک حیران کن اور دل دہلا دینے والی تھی۔

تھوڑی دیر میں نذیر انور کمہار کو لے آیا انسپکٹر نے انور کمہار کی عمر کا اندازہ چوبیس پچیس سال کا لگایا، وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا انسپکٹر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا انسپکٹر نے ایک بات محسوس کی کہ انور کمہار کا چہرہ کافی اترا ہوا اور اداس اداس سا تھا۔

”ہاں تو انور کیسے ہو تم؟“ انسپکٹر نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”ج.....جی..... میں ٹھیک ہوں۔“ پہلے تو انور کمہار حیران ہوا پھر اس نے جواب دیا۔

”یہ بتاؤ انور کہ تم نے رضیہ کا قتل کیسے کیا؟“ انسپکٹر ڈائریکٹ اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

”یہ.....یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب۔“ انور گھبراتے ہوئے بولا۔

”دیکھو انور مجھے اپنے مخبر سے پتہ چلا ہے کہ تم اور رضیہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور رضیہ گھر سے باقاعدہ تیاری سے بھاگی تھی تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے سب کچھ سچ سچ بتادو، میں نے تمہاری حالت سے اندازہ لگالیا ہے کہ تم نے کبھی تھانے کی شکل تک نہیں دیکھی لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ تھانے کے ڈرائنگ روم کے قصے تم نے ضرور سنے ہوں گے انہیں تھانے کے ڈرائنگ روم میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ لگے گا اور تم فر فر بولو گے اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے سب کچھ سچ سچ بتادو۔ انسپکٹر شکور نے انور کمہار کو سمجھاتے ہوئے کہا انور کمہار پہلے تو ٹکر ٹکر انسپکٹر شکور کو دیکھتا رہا پھر اس نے رونا شروع کردیا۔ تھانیدار صاحب میں اور رضیہ واقعی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے لیکن رضیہ زندگی کے اس اوکھے (مشکل) سفر میں مجھے اکیلا چھوڑ گئی۔ تھانیدار صاحب ہم نے واقعی بھاگنے کا پروگرام بنایا تھا میں نے رضیہ سے کہا تھا کہ چاچا اکبر کی زمینوں پر ہم دونوں ملیں گے۔ اس دن ساتھ والے گاؤں سے مٹکوں کا آرڈر آیا ہوا تھا ابا مجھے وہاں سے ہلنے نہیں دے رہا تھا۔ مٹکے بنانے کے بعد میں ابا کافی تھک گئے تھے۔ ابا تو سو گیا اور میں تھوڑی دیر بعد گھر سے باہر نکل آیا میں چاچا اکبر کی زمینوں پر پہنچا تو میری تو دنیا ہی اجڑ چکی تھی۔ رضیہ کی لاش وہاں بری حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ میں رضیہ کی لاش پر آنسو بہانے لگا چاچا اکبر کا کتا بار بار بھونک رہا تھا مجھے مجبوراً وہاں سے آنا پڑا۔“ یہاں تک کہہ کر انور کمہار خاموش ہوگیا انسپکٹر شکور نے انور کمہار کی آنکھوں میں جھانکا وہ کسی بھی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔

”تو پھر تم نے مجھے آگاہ کیوں نہیں کیا۔“ انسپکٹر شکور نے گہری نظروں سے اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار صاحب میں گھبرا گیا تھا میں ڈر رہا تھا کہ اگر میں نے آپ کو رضیہ کے قتل کے بارے میں آگاہ کیا تو کہیں آپ مجھے ہی اس کا قاتل نہ سمجھ بیٹھیں۔“ انور کمہار نے وجہ بتائی۔

”ہوں۔“ انسپکٹر شکور نے گہری سانس کھینچی۔

”تو اس معاملے میں تمہیں کسی پر شک۔“

"تھانیدار صاحب مجھے کسی پر شک نہیں۔"

انور کمہار نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہو سکتا ہے۔ تمہارے علاوہ بھی رضیہ کا کوئی عاشق ہو۔" انسپکٹر شکور نے خدشہ ظاہر کیا۔ "اور اسے تم دونوں کی محبت ایک آنکھ نہ بھائی ہو اور اس نے اس دن طیش میں آ کر رضیہ کا خون کر دیا ہو۔"

"جہاں تک میرا خیال ہے تھانیدار صاحب مجھے تو ایسے کسی بھی بندے کے بارے میں معلوم نہیں۔" انور نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے انور اب تم جا سکتے ہو پر مجھے بتائے بنا تم کہیں اور نہیں جا سکتے۔" انسپکٹر نے انور کمہار کو تاکید کی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

احمد نے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں اور گھوڑا رکتے ہی گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اس وقت اس نے منہ پر رومال لپیٹ رکھا تھا سامنے قبرستان تھا احمد نے گھوڑے سے دو بوریاں اور کدال اتاری اور قبرستان کی حدود میں داخل ہو گیا۔ آسمان سے جھانکتے ہوئے چاند کی روشنی میں قبرستان بڑا پراسرار لگ رہا تھا ہر طرف قبریں ہی قبریں تھیں۔ جس میں دنیا سے بے نیاز مردے لیٹے ہوئے تھے۔

احمد کافی دیر چلتا رہا پھر وہ ایک بڑے سے درخت کے قریب رکا درخت کے نیچے دو کچی قبریں تھیں اور ہی تھیں۔

اچانک احمد یکدم گھوما اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی اس کے پیچھے ہو لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا احمد سیدھا ہوا اور ان دونوں قبروں میں سے ایک قبر کو کھودنے لگا۔ وہ اب اردگرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے مکمل قبر کھود ڈالی احمد نے چاند کی اور ٹارچ کی روشنی میں قبر کا منظر دیکھا جو انتہائی خوفناک تھا۔ قبر کے اندر ایک لاش تھی جس پر کیڑے مکوڑوں کا راج تھا۔ لاش پر جگہ جگہ سے گوشت غائب تھا کئی جگہ سے تو خون میں نہائی ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں اب احمد نے

دوسری قبر کھودنا شروع کر دی۔

☆......☆......☆

انسپکٹر شکور تھانے کے کمرے میں بیٹھا گہری سوچوں میں گم تھا کہ نذیر کمرے میں داخل ہوا۔ ”انسپکٹر صاحب باہر گورکن آیا ہے۔“ سلیوٹ کرنے کے بعد نذیر نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔ ”گورکن“ انسپکٹر نے حیرانگی سے لفظ ”گورکن“ دہرایا۔ ”بھیجو اسے“ نذیر اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھوڑی دیر بعد ایک پینتالیس سال کا آدمی اندر داخل ہوا انسپکٹر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں بولو۔ کیسے آنا ہوا؟“ انسپکٹر نے گورکن کے بیٹھنے کے بعد اس کے آنے کی وجہ پوچھی۔

”تھانیدار صاحب رات میرے قبرستان میں عجیب گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ گورکن نے کہا۔ ”تمہارے قبرستان میں۔؟“ انسپکٹر حیران ہوا۔ ”لیکن میں نے تو سنا ہے کہ قبرستان تو مردوں کا ہوتا ہے۔“

”جج......جی وہی تھانیدار صاحب۔“ گورکن نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں تو کیا گڑبڑ ہوئی۔ میرا مطلب ہے مردوں کے قبرستان میں۔“ ”عجیب گڑبڑ ہو گئی۔“ اتنا کہہ کر گورکن ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گیا۔“

”گڑبڑ کیا ہوئی۔؟“ انسپکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔

”رات تھانیدار صاحب میں اپنے گھر میں سو رہا تھا کہ اچانک مجھے شور کی آواز سنائی دی پہلے تو میں سمجھا کوئی گیدڑ یا کتا ہوگا پر جب میں نے غور کیا تو میں پہچان گیا کہ قبرستان میں کوئی زندہ انسان گھوم رہا ہے۔ تھانیدار صاحب جب میں ست کر کے اپنے گھر سے باہر نکلا تو میرا شک صحیح نکلا چاندنی کی روشنی میں، میں نے دیکھا کوئی نوجوان شخص ہاتھ میں کدال پکڑے ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے دل میں اللہ کو یاد کیا اور دبے قدموں سے اس کا پیچھا کرنے لگا قبرستان میں لگے درخت اس کام میں میری مدد کر رہے تھے۔ پھر وہ جوان ایک بڑے سے درخت کے قریب جھکا اور یکدم اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا شاید اسے میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔

میں بھی تیزی سے ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا کسی کی موجودگی نہ پا کر وہ سیدھا ہوا اور اپنے ساتھ لائی ہوئی کدال سے ایک قبر کھودنے لگا قبر کھودنے کے بعد وہ کافی دیر قبر میں موجود لاش کو گھورتا رہا۔ پھر وہ قبر میں اتر گیا اور قبر میں موجود انسانی اعضاء بوری میں ڈالنے لگا اس کے بعد اس نے دوسری قبر کھودی اور اس میں موجود بھی انسانی اعضاء دوسری بوری میں ڈالے اور قبرستان سے باہر نکل گیا۔ اتنا کہہ کر گورکن خاموش ہو گیا۔

”ہوں۔“ ”تم مجھے اسی وقت اطلاع دینے کیوں نہیں آئے۔“ انسپکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔

”تھانیدار صاحب رات کا دیا تھا ویسے بھی اس کے چہرے پر رومال تھا میں اسے پہچان بھی نہ سکا سوچا آپ آرام کر رہے ہوں گے اس لئے اب آپ کے پاس آ گیا ہوں۔“ گورکن نے سمجھاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے تم مجھے وہ قبریں دکھاؤ۔“ تھانیدار نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”چلئے صاحب۔“ گورکن اٹھ کھڑا ہوا جلد ہی وہ اس جگہ پہنچے دونوں قبروں کی مٹی اب برابر تھی یعنی وہ جو کوئی بھی تھا اپنا کام کر کے چلا گیا تھا لیکن قبر کی مٹی سے صاف لگ رہا تھا۔ کہ اس قبر کو کھودا گیا تھا۔

”کھودو ان قبروں کو۔“ انسپکٹر نے کہا تو گورکن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان قبروں کو کھودنا شروع کر دیا۔

انسپکٹر کے ساتھ حوالدار نذیر کے علاوہ دو کانسٹیبل اور بھی تھے، گورکن نے قبریں کھودیں تو اس میں واقعی انسانی اعضاء موجود نہیں تھے۔ ”اچھا تم بتا سکتے ہو یہ دونوں قبریں کس کی ہیں۔“ انسپکٹر نے گورکن سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں تھانیدار صاحب۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہیں تو ہر قبر کی پہچان ہونی چاہئے۔“ تھانیدار نے حیرت سے پوچھا۔

"تھانیدار صاحب بات دراصل یہ ہے کہ کچھ دن پہلے میں شہر گیا ہوا تھا واپس آیا تو یہ قبریں نئی بنی ہوئی تھیں، میں بڑا حیران ہوا تھا گاؤں سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اس دوران گاؤں میں کوئی مرا بھی نہیں، گورکن نے حیران کن بات بتائی۔

"ہوں۔" اور انسپکٹر نے گہری سانس کھینچی پھر وہ حوالدار نذیر کی طرف ہوا اور اسے کچھ ہدایات دینے لگا۔

☆......☆......☆

ریاض نے مٹکے سے پانی کا ڈول بھرا اور چارپائی پر آکر بیٹھ گیا حمیرا پہلے سے ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی، چارپائی ایک درخت کے نیچے رکھی ہوئی تھی پاس ہی بھینسیں چارہ کھا رہی تھیں۔ حمیرا رومال سے روٹیاں نکالنے لگی۔ "پہلے پانی دو۔" ریاض نے ہاتھوں میں روٹی پکڑتے ہوئے کہا۔ حمیرا نے ڈول سے گلاس میں پانی ڈالا اور پھر ریاض کی طرف بڑھا دیا۔ ریاض نے ہاتھ بڑھا کر گلاس پکڑا پانی کا گھونٹ لے کر کلی کی اور پھر باقی پانی پی گیا۔ "کیا پکا ہے آج۔؟" ریاض نے سالن کا ڈبہ کھولتے ہوئے گنگناتے ہوئے کہا۔ ڈبے میں آلو گوشت تھا۔ "چل حمیرا تو بھی کھا۔"

"جی اچھا۔" حمیرا نے کہا اور اس نے بھی رومال سے ایک روٹی نکال لی۔ "تو اپنے اماں ابا کے گھر ہو آ کافی دن ہو چکے ہیں تجھے۔" ریاض نے روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرا نہیں دل کرتا......" حمیرا نے ناک کے نتھنوں کو اوپر کی جانب کھینچا۔

"کیوں۔؟ اکثر سنا ہے کہ بیٹیوں کا تو دل سسرال میں نہیں لگتا۔" ریاض نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں......" حمیرا نے کہا...... "میرا دل آپ کے ساتھ لگتا ہے۔"

"ریاض رضیہ کے قاتل کا کچھ پتہ چلا۔؟" حمیرا نے پوچھا۔

"نہیں ابھی تک تو یہی پتہ چلا ہے اور سنا ہے تھانیدار صاحب نے انور کمہار کو تھانے بلوایا تھا۔" ریاض نے کہا۔

"اچھا فیر۔" حمیرا نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب نے اسے چھوڑ دیا تھا اس چغلی نے پورے پنڈ میں گھما دیا ہے کہ انور کمہار اور رضیہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔" ریاض نے کہا۔

"تھانیدار صاحب کی ابھی خاص محنت نظر نہیں آرہی۔"

"یہ پولیس والے ہوتے ہی ایسے ہیں اگر انور کمہار نے اس کا قتل کیا ہوتا تو تھانیدار اسے یوں نہ چھوڑتا۔" ریاض نے کہا۔

"یہ تو رب ہی جانے کہ اس کا قاتل کون ہے۔؟" حمیرا نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا دونوں روٹی کھا چکے تھے تو حمیرا ڈبے کر رومال میں باندھنے لگی۔ "چل ٹھیک ہے مہرو تو گھر جا میں شام کو جلدی آجاؤں گا۔" ریاض نے کہا تو حمیرا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی چلتے چلتے وہ ایک طرف بنی پگڈنڈی پر چلنے لگی۔

اچانک حمیرا کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پیچھے پیچھے آرہا ہو وہ یکدم گھومی لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ چل پڑی جلد ہی وہی احساس اسے دوبارہ محسوس ہوا اس مرتبہ بھی اپنا خدشہ دور کرنے کے لئے واپس گھومی تو اس کے دل نے زوروں سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ پیچھے ایک آدمی کھڑا تھا جس نے چہرے پر رومال لپیٹ رکھا تھا۔ "کک...... کک...... کون ہو تم؟" حمیرا نے ہکلاتے ہوئے پوچھا لیکن اس آدمی نے جواب دینے کی بجائے تیزی سے آگے بڑھ کر حمیرا کی ناک پر رومال رکھ دیا ایک عجیب سی بو نے حمیرا کے احساسات منجمد کر دیئے وہ لہرا کر زمین پر جا گرتی اس سے پہلے اس آدمی نے آگے بڑھ کر حمیرا کو اپنی بانہوں میں تھام لیا۔

☆......☆......☆

دستک بڑے زوروں کی تھی جس نے انسپکٹر کو گہری نیند سے جگا دیا تھا۔ پہلے تو انسپکٹر حیرانگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر دستک کی آواز سے وہ سمجھ گیا کہ وہ کسی وجہ

سے جاگا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھا اس دوران کی دستک دوبارہ سے بڑی دی جاچکی تھی۔ انسپکٹر نے اپنی چپل پہنیں اور اٹھ کر دروازے کے قریب آیا۔ ”کون ہے بھئی...؟“ انسپکٹر نے احتیاطاً پوچھا۔

”انسپکٹر.....صاحب دروازہ کھولئے۔“ دوسری طرف سے ایک خوبصورت نسوانی آواز سنائی دی انسپکٹر نے آگے بڑھ کر کنڈی گرادی اور دروازہ کھولا تو انسپکٹر کی دل کی دھڑکنوں نے دھڑکنے کی رفتار تیز کردی سامنے ایک خوبصورت دوشیزہ کھڑی تھی جو کافی گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔

”انسپکٹر صاحب..... ادھر..... ادھر نہر کے کنارے۔“ وہ لڑکی ہکلاتے ہوئے بولی۔ گھبراہٹ کے باعث لڑکی سے بولا نہیں جارہا تھا۔

”کیا ہوا نہر کے کنارے...؟“ انسپکٹر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ.....وہ نہر کے کنارے دو بندے ایک لڑکے اور لڑکی کو بڑی بے دردی سے قتل کررہے ہیں۔“ لڑکی نے عجیب خبر سنائی۔

”کک.....کیا...؟“ انسپکٹر کا انداز چلانے والا تھا۔

”جلدی چلئے صاحب۔“ اس لڑکی نے تیز لہجے میں کہا۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ انسپکٹر نے کہا اور تیزی سے اندر کی طرف بھاگا اس نے اپنا سروس ریوالور اٹھایا اور باہر کی طرف بھاگا۔ وہ دروازے پر آیا تو حیران رہ گیا باہر وہ لڑکی غائب تھی۔ ”شاید نہر کی طرف چلی گئی ہے۔“ انسپکٹر بڑبڑایا اور نہر کی طرف جانے والے راستے کی طرف بھاگا وہ نہر کے کنارے پہنچا تو اس نے ایک حیران کن منظر دیکھا نہر کے کنارے ایک بوڑھا ہاتھ میں لالٹین لئے کھڑا تھا اور ایک نوجوان لڑکا کدال سے زمین کھود رہا تھا۔ پاس ہی ایک بوری پڑی ہوئی تھی۔

”ہینڈز اپ۔“ انسپکٹر نے اونچی آواز میں کہا تو اس لڑکے کے چلتے ہاتھ رک گئے جبکہ لالٹین والے بوڑھے نے حیرانگی سے گھوم کر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بوڑھا اور نوجوان سلاخوں کے پیچھے تھے۔ ”تم دونوں وہاں کیا کررہے تھے...؟“ انسپکٹر نے ان دونوں کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”انسپکٹر صاحب ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ یہ سوال آپ بعد میں بھی پوچھ سکتے ہیں۔“ بوڑھے نے انسپکٹر سے کہا۔

”انسپکٹر صاحب جو پوچھ رہے ہیں اس کا جواب دو.....سمجھے۔“ نذیر آگے بڑھتے ہوئے غصے سے بولا۔

”باباجی ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب......آپ یہ پوچھ گچھ بعد میں بھی کرسکتے ہیں، اگر آج ہم نے اپنا کام نہ کیا تو گاؤں میں لاشوں کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔“ نوجوان نے کہا۔

انسپکٹر نوجوان کی اس بات پر چونکا۔ ”کیا مطلب...؟“ انسپکٹر نے حیرانگی سے پوچھا۔

”جی تھانیدار صاحب اگر آج ہم نے وہ عمل نہ کیا تو آہستہ آہستہ یہ گاؤں ویران ہوجائے گا۔“ نوجوان نے کہا۔

”میرے پلے تمہاری باتیں نہیں پڑرہیں۔“ انسپکٹر نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

”تھانیدار صاحب میں آپ کو بعد میں سب کچھ سمجھادوں گا۔ پہلے آپ ہمیں اس جگہ جانے دیجئے۔ نہیں تو انسپکٹر صاحب خون نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوجائے گا جسے آپ اور آپ کا عملہ بھی نہیں روک سکے گا۔“ اس نوجوان نے کہا جو کہ احمد تھا۔ انسپکٹر پریشان نگاہوں سے کبھی احمد اور کبھی اس بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

حمیرا کو ہوش آیا تو اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا، ہوش بحال ہونے کے بعد اس نے اردگرد نگاہیں دوڑائیں تو اس نے دیکھا وہ اینٹوں سے بنے ایک کمرے کی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی پورے کمرے میں صرف وہی ایک چارپائی موجود تھی، کمرے کا اکلوتا

دروازہ تھا جو خارجی اور داخلی تھا، حمیرا اپنا سر پکڑتے ہوئے اٹھ کر بیٹھی، بیتے لمحات کسی فلم اسکرین کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے، وہ ریاض کو کھانا دینے کے بعد واپس آ رہی تھی کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو، وہ گھومی تو پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہ دوبارہ چل پڑی تھوڑی دیر بعد پھر وہی احساس اس کے من میں جاگا۔ وہ گھومی تو اس مرتبہ خوف کے باعث اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ سامنے ایک شخص منہ پر رومال لپیٹے کھڑا تھا حمیرا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو حمیرا کو عجیب سی شناسائی محسوس ہوئی، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اس آدمی نے آگے بڑھ کر حمیرا کی ناک پر رومال رکھ دیا۔ تو اس کی آنکھوں کے سامنے یکدم دھندی چھا گئی اب ہوش آیا تو وہ اس کمرے میں موجود تھی۔ "کک......کک......کہیں۔" وہ حمیرا "اس کا مطلب۔" وہ کہتے کہتے ایک مرتبہ پھر رکی احمد یادوں کا سلسلہ ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں کے آگے چھا گیا وہ سمجھ گئی تھی کہ احمد نے ہی اس کو اغوا کیا ہے، اسی وقت باہر کنڈی گرنے کی آواز سنائی دی۔

حمیرا اس طرف متوجہ ہوئی دروازہ کھولنے والی ہستی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی دروازہ کھولنے والا اس کا شوہر ریاض تھا وہ دوڑ کر ریاض کے گلے لگ گئی۔ "شکر ہے اللہ کا تم یہاں آگئے۔" وہ سسکتے ہوئی بولی۔

"اس سے پہلے کہ کوئی یہاں آجائے یہاں سے جلدی چلو حمیرا۔" ریاض نے اسے اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا وہ دونوں اس چھوٹے سے مکان سے باہر آئے، مکان گاؤں کی حدود سے کافی دور تھا جلد ہی وہ دونوں گاؤں کی حدود میں پہنچے۔ "لیکن تم یہاں تک کیسے پہنچے؟" حمیرا نے پوچھا۔

ماسی چنگلی میرا مطلب ہے ماسی صغراں نے بتایا تھا کہ وہ اپنے بھائی سے ملنے کے بعد واپس آ رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ اچانک ایک نقاب پوش نے تمہارے چہرے پر رومال رکھ دیا اور پھر اس نے تمہیں گنے کے کماد میں چھپالیا۔ وہ میرے پاس آئی اور ساری صورتحال سے آگاہ کیا میں الٹے پیروں اس طرف دوڑا تب تک وہ تمہیں گھوڑے پر لاد چکا تھا۔ میں اس کے پیچھے یہاں تک آ گیا اس کے جانے کے بعد میں اندر آیا اور تمہیں یہاں لے آیا۔" ریاض نے تفصیلاً ساری بات بتا دی۔

وہ دونوں اب اپنے گھر کے قریب آ چکے تھے وہ اپنے گھر میں داخل ہوئے تو حمیرا کی نظر سامنے دیوار کے ساتھ لگی بوری پر پڑی برآمدے میں عجیب قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ "یہ بوری کس کی ہے اور اس میں کیا ہے۔؟" حمیرا نے اس بوری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جیسے جیسے وہ بوری کے قریب ہوتی جا رہی تھی بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ "حمیرا۔" اچانک ریاض کی آواز حمیرا کے کانوں میں پڑی تو حمیرا یکدم گھومی تو اس نے دیکھا ریاض زمین پر پڑا ابری طرح تڑپ رہا تھا۔

"رر ریاض کیا ہوا ہے تمہیں۔؟" حمیرا چیختے ہوئے زمین پر تڑپتے ریاض کی طرف بڑھی۔

"مم......مم......حمیرا......وہ......وہ مجھے مار ڈالے گا۔" ریاض تڑپتے ہوئے بولا، اس نے اپنی گردن پکڑی ہوئی تھی۔

"کک......کک......کون اتنا کہہ کر ریاض ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور حمیرا حیرت سے اسکا منہ تکنے لگی۔"

"یہ......یہ کیا؟" حمیرا نے بدستور حیرانگی سے پوچھا۔

"میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہیں مجھ سے پیار ہے کہ نہیں۔" ریاض نے مسکراتے ہوئے کہا، ساتھ ہی اس نے حیران کھڑی حمیرا کو گلے سے لگا لیا۔ "یہ......یہ کیسا مذاق تھا۔" حمیرا نے منہ بنایا۔ "اگر میری جان نکل جاتی تو۔"

"تمہاری جان ہی تو نکالنی ہے۔" ریاض نے حمیرا کو مضبوطی سے بھینچتے ہوئے کہا حمیرا کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"رر......ریاض۔" حمیرا بمشکل بولی۔

"حمیرا کو چھوڑ دو۔" اچانک ایک آواز گونجی تو ریاض نے حمیرا کو چھوڑا اور گھوم کر پیچھے دیکھا، پیچھے احمد

انسپکٹر شکور بوڑھا اور چار کانسٹیبل کھڑے تھے۔ ریاض نے جیسے ہی حمیرا کو چھوڑا وہ بری طرح کھانسنے لگی اگر ریاض اسے ایک سیکنڈ کے لئے بھی نہ چھوڑتا تو شاید وہ مر ہی جاتی۔

انسپکٹر نے اپنا ریوالور اور کانسٹیبلوں نے اپنی بندوقوں کا رخ ریاض کی طرف کر دیا تھا، ریاض نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”یہ بندوقیں اور پستول میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں تھانیدار صاحب۔“

”کیوں کیا تم کوئی بھوت ہو؟“ انسپکٹر غصے سے بولا۔

”بالکل۔“ ریاض نے کہتے ہوئے ایک مرتبہ پھر قہقہہ لگایا۔

”تو اس کا علاج میرے پاس ہے۔“

اس مرتبہ وہ بڈھا بولا ساتھ ہی اس نے کچھ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں کو ریاض کی طرف کیا تو ریاض چیختا ہوا پیچھے جا گرا۔

حمیرا حیرت سے کھڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی، وہ یکدم آگے بڑھی اور بولی۔ ”یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ میرے ریاض کو کیوں مار رہے ہو...؟“

”ہٹ جاؤ حمیرا یہ تمہارا ریاض نہیں ہے بلکہ۔“ احمد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ یکدم زمین پر پڑا ریاض اٹھا اور اس نے حمیرا کی گردن کو پکڑ لیا۔

”خبردار اگر کسی نے دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔“ ریاض سفاک لہجے میں بولا۔

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو ریاض۔“ حمیرا نے حیرت کے باعث کہا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں اگر اس بوڑھے نے مجھ پر دوبارہ حملہ کیا تو میں واقعی تمہاری گردن توڑ دوں گا۔“ ریاض غصے سے گرجا۔

”رک جاؤ احمد۔“ ریاض نے آگے بڑھتے ہوئے احمد کو بدستور سفاک لہجے میں کہا۔ ”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ تمہاری بچپن کی محبت ہے اور اسی کے لئے تم اس گاؤں میں آئے ہو اگر تم نے ایک قدم بھی مزید آگے بڑھایا تو تمہاری محبت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ادھوری رہ جائے گی۔

”میں اگر تم پر حملہ کروں تم تب بھی اس کو مار دو گے اور اگر نہ کروں تب بھی مار دو گے، میں تمہارے مقصد سے بخوبی آگاہ ہوں۔“ اتنا کہہ کر احمد نے برق رفتاری سے ہاتھ میں پکڑا چاقو پھینکا، چاقو حیرت انگیز طور پر سیدھا ریاض کی پیشانی میں جا گھسا ریاض نے ایک زوردار چیخ ماری اور زمین پر جا گرا اس وقت وہاں موجود سب لوگوں نے ایک حیران کن منظر دیکھا ریاض کے جسم سے ایک ہیولہ نکلا اور ہوا میں کھڑا ہو گیا۔ ”حرام زادو تم لوگوں نے میرا سارا کام خراب کر دیا میں تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ہیولہ کے منہ سے غضب ناک آواز نکلی۔

وہاں کھڑے کانسٹیبلز یکدم چیخنے لگے انہوں نے اپنی بندوقیں پھینکیں اور تیزی سے اپنی شرٹس اتار دیں۔ ان کی حالت دیکھ کر حمیرا کی چیخ نکل گئی کانسٹیبلوں کے بدن لہولہان تھے اور وہ چاروں کانسٹیبلز زمین پر گرنے کے بعد بری طرح تڑپنے لگے جلد ہی وہ ٹھنڈے ہو گئے۔

”حرام زادے۔“ اور انسپکٹر غصے سے گرجا اور اپنے ریوالور کا رخ اس کی طرف کر کے فائر کرنے شروع کر دیئے۔ فضا اس ہیولے کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔ ”تمہاری یہ گولیاں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں اور تم لوگوں نے میرے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا اب میں تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ہیولہ بولا۔

اچانک وہاں کھڑے بوڑھے نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ہیولہ کی طرف کیا وہ کافی دیر سے منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا ایک آگ کا شعلہ سا تھا جو یکدم ہیولہ کی طرف بڑھا اور فضا خوف ناک چیخوں سے گونج اٹھی، وہ ہیولہ یکدم غائب ہو گیا تھا۔

”بابا جی کہاں گئی یہ روح احمد نے بوڑھے سے پوچھا۔

”جہاں اسے جانا چاہئے تھا اس کا کام اب تمام ہو چکا ہے۔“ اور بوڑھے نے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب آپ ان لاشوں کو اٹھوانے کا بندوبست کریں، میں تب تک

ریاض کی لاش کو قبرستان میں دفن کر کے آتا ہوں۔" احمد نے انسپکٹر سے کہا تو انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور حمیرا کے گھر سے باہر نکل گیا۔

حمیرا ریاض کے زمین پر پڑے بے جان جسم پر آنسو بہا رہی تھی احمد ریاض کے جسم کی طرف بڑھا تو حمیرا نے اس پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی اور ذلیل انسان آخر کار تم نے اپنا کہا سچ کر ہی ڈالا اور تم نے کہا تھا کہ تم مجھے کسی بھی طرح حاصل کر لو گے...... تم نے میرے ریاض کو مار ڈالا...... مار ڈالا میرے ریاض کو...... حمیرا نے روتے ہوئے کہا۔

احمد نے اپنے گالوں پر برستے حمیرا کے ہاتھوں کو روکا۔ "حمیرا ہوش کرو یہ جسم ضرور ریاض کا تھا مگر روح...... روح کسی اور کی تھی۔" احمد نے عجیب بات کہی۔

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" حمیرا حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

"سچ کہہ رہا ہوں میں اتنا خود غرض نہیں ہوں میں کہ صرف اپنے مطلب کے لئے تمہارا گھر اجاڑ دوں...... اس دن میں نے ضرور کہا تھا کہ میں تمہیں کسی بھی طرح حاصل کر لوں گا لیکن جب میں تمہارے گھر سے باہر نکل آیا تو میں مسجد میں آ کر بیٹھ گیا اور رونے لگا تبھی مسجد کے امام صاحب میرے قریب آئے۔" "کیا ہوا احمد بیٹا۔" مسجد کے امام صاحب نے پوچھا۔

"کچھ نہیں امام صاحب اور میں زبردستی مسکرا دیا۔"

"مسجد میں بیٹھ کر جھوٹ نہیں بولتے۔" امام صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سچ...... جی۔" میں بوکھلا سا گیا۔

"چلو بتاؤ کیا بات ہے...... کبھی کبھی درد بانٹنے سے کم ہوتا ہے۔" امام صاحب کے الفاظ میں نجانے کیا جادو تھا کہ میں نے ساری بات انہیں بتا دی۔

"دیکھو احمد بیٹا پیار، عشق، اور محبت جیسی چیزیں صرف اور صرف اللہ کے لئے ہیں اور محبت کرنی صرف اللہ سے چاہئے کیونکہ وہ اپنے بندے سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے اور بیٹا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اپنے ماں باپ کی فرماں برداری کرو کیونکہ ماں باپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاد کو عظیم تحفہ ملا ہوتا ہے اور اگر تم اپنی ماں باپ کی حکم عدولی کر کے کل آنے والی بارات میں بکھیڑا ڈالو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہوں گے...... بس بیٹا پانچ وقت کی نماز پڑھو صراط مستقیم پر چلو اور ماں باپ کی خدمت کرو انشاء اللہ اس دنیا میں کامیاب ہو گے اور دوسری دنیا میں بھی رجاؤ اٹھو اور اپنے ماں باپ سے ملو ان سے معافی مانگو اللہ سب کچھ بہتر کرے گا۔" اتنا کہہ کر امام صاحب اٹھ کھڑے ہوئے امام صاحب کے الفاظوں نے میری کایا ہی پلٹ دی میں گھر واپس آ گیا اور اپنے باپ کے پاؤں پکڑ کر رو رو کر معافی مانگی، میں نے کبھی اپنے باپ سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی، لیکن کبھی کبھی انسان بہت بڑی غلطی کر بیٹھتا ہے میرا باپ بے چارہ مجھ سے گلے ملتے ہوئے مجھ سے معافیاں مانگنے لگا اور کہنے لگا بیٹا مجھے معاف کر دینا زندگی میں پہلی بار میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا۔"

ابا نے مجھے گلے لگا لیا اور ہم دونوں کے آنسو نکل پڑے ان آنسوؤں میں میری ماں جنہیں بھی شریک تھیں اس رات سے میری زندگی بدل گئی اللہ کی عبادت میرا نصب العین بن گیا لوگوں کی مدد کرنا اور غریبوں کا ساتھ دینا تمہاری یادوں کا جال کبھی کبھی میری آنکھوں کے سامنے لہراتا لیکن اس پر اللہ کی محبت غالب آ جاتی۔

ایک دن امام صاحب نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ "بیٹا مجھے بڑی خوشی ہے کہ تو ہر وقت اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے لیکن بیٹا اللہ تعالیٰ کی ذات بھی بڑی غفور و رحیم ہے جب کوئی اس کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو وہ اس پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے اور تم بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہو کیونکہ تم نے اللہ کی راہ خالص نیت سے پکڑی ہے اور جب کوئی اللہ کی راہ خلوص نیت سے اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ہر خواہش کا خیال رکھتے ہیں تم ابھی سکندر آباد کی طرف نکل پڑو وہاں تمہیں فقیر اللہ یار ملیں گے وہ تمہیں سب کچھ سمجھا دیں گے۔"

میں سکندر آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں ان سے ملا تو انہوں نے مجھے فقیر کے بھیس میں تمہارے گھر بھیجا اور کہا کہ وہاں سے مردانہ کپڑوں کا جوڑا کسی بھی طرح لے کر آنا ہے...... یاد ہے تمہیں وہ فقیر جس نے تمہارے گھر پر صدا دی تھی۔" اتنا کہہ کر احمد رکا اور حمیرا کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگا۔"

"تو وہ فقیر تم تھے۔" حمیرا نے حیرت سے کہا۔

"ہاں وہ میں ہی تھا۔ میں نے جب کپڑوں کا جوڑا فقیر اللہ یار کو لا کر دیا تو انہوں نے کہا۔" احمد میرا شک صحیح نکلا۔"

"کیسا شک بابا جی۔؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی کہ اس گھر میں رہنے والے شخص کا جسم مردہ ہے۔" بابا جی نے ریاض کے کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" حیرت کے باعث میرے منہ سے نکلا۔

"احمد اس لڑکی کا شوہر زندہ نہیں بلکہ اس کے جسم میں ایک روح سمائی ہوئی ہے" اللہ یار نے عجیب بات بتائی۔

"روح۔" حیرت کے باعث میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں اور مجھے لگتا ہے اس لڑکی کی جان کو بھی خطرہ ہے۔" بابا جی نے کہا۔ "نن...... نن...... نہیں یہ نہیں ہو سکتا...... تڑپتے ہوئے میں نے کہا، کافی عرصے سے دل میں چھپی محبت نے سر ابھارا۔"

"لیکن ہمیں اس لڑکی کو بچانا ہے تم ایسا کرو شام کے وقت قبرستان میں جاؤ وہاں ایک بڑے سے درخت کے نیچے نئی قبروں میں سے ہڈیاں نکال کر بوریوں میں بھر کر یہاں لے آؤ، مجھے ان ہڈیوں سے ساری کہانی کا پتہ چل جائے گا۔" بابا جی نے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں ان ہڈیوں کو لے آیا بابا جی نے خاص عمل کے ذریعے ساری کہانی کا پتہ چلایا وہ دو میاں بیوی تھے فراز اور کشور انہوں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی وہ دونوں بھاگ کے ساتھ والے گاؤں کی چوہدری کی پناہ میں آ گئے۔ چوہدری فراز کا یار تھا۔ لیکن اس کا دل کشور پر آ گیا اس نے رات کے وقت اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لئے پہلے فراز کو باندھا اور پھر بے چاری کشور کی عزت کو پامال کر دیا اس کے بعد اس نے دونوں میاں بیوی کو ختم کر دیا۔

چوہدری کے دو خاص ملازموں نے فراز اور کشور کی لاشوں کو سکندر آباد کے قبرستان میں دفنا دیا اب فراز کی روح انتقام کی آگ میں جھلس رہی تھی اس نے اپنے تمام دشمنوں کو دردناک موت دی اور اب وہ جسم حاصل کرنا چاہتا تھا ریاض کا جسم اسے بالکل ٹھیک لگا ریاض کو ختم کرنے کے بعد اس نے اس کا جسم حاصل کر لیا اب وہ اپنی بیوی کو بھی جسم دینا چاہتا تھا اس کے لئے اسے تمہارا جسم بالکل ٹھیک لگا اور وہ تمہارا جسم اسی دن حاصل کر سکتا تھا جس دن چوہدری نے ان کا قتل کیا تھا فراز کی روح خون کی پیاسی بھی تھی اور خون کی پیاس بجھانے کے لئے اس نے گھر سے بھاگی دشمنی کا سارا خون نچوڑ لیا۔

اب ہم ریاض کی روح کو ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے اسی لئے ہم نے عمل کا سوچا۔ عمل کرنے کے بعد ہم نے ریاض کی ہڈیوں کو نہر کے کنارے دفنانا تھا لیکن فراز کی روح نے اپنی طاقتوں کے ذریعے ہمیں ناکام بنا دیا فراز کی روح انسپکٹر کے گھر لڑکی کے روپ میں گئی اور ہمارا سارا کام خراب کر دیا۔ میں نے تمہیں اغوا اس لئے کیا تھا کہ ریاض تمہیں ختم نہ کر دے ہمیں پکڑوانے کے بعد فراز تمہیں اس جگہ سے باہر نکال لایا باقی کی کہانی تم جانتی ہو۔" اتنا کہہ کر احمد خاموش ہو گیا اور حمیرا کی طرف دیکھنے لگا حمیرا روتے ہوئے احمد کے گلے لگ گئی۔

کچھ دنوں بعد حمیرا کے ماں باپ اور احمد کے ماں باپ نے دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔

"قدرت کا اصول بڑا نرالا ہے جسے جو ملنا ہوتا ہے اسے وہ مل کر رہتا ہے۔"

چالاک

ساجد وڑائچ۔ ہندواں سرگودھا

وہ عام سا جانور ہی نہیں بلکہ انسانوں سے کہیں زیادہ عقلمند اور ذی شعور تھا، اس کی ذہانت کے لوگ قائل ہوچکے تھے، بے شمار لوگوں کی خواہش تھی کہ وہ ان کے پاس آئے مگر پھر آخر......

دل کو گدگداتی، عقل کو حیران کرتی اور ہونٹوں پر مسکان بکھیرتی ایک خوبصورت تحریر

''**ٹومی**......ٹومی کہاں ہو تم......؟'' جیک نے اپنے پیارے اور پالتو کتے کو آواز دی۔ اس کی آواز لگانے کی دیر تھی ٹومی اس کے پیروں میں موجود تھا۔

جیک نے پیار سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا وہ مزید لوٹ پوٹ ہونے لگا پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی اس نے جیک کی پینٹ کا پائنچہ پکڑا اور اسے ایک طرف کھینچنے لگا۔

''اوکے......اوکے ٹومی میں سمجھ گیا۔ چھوڑ دو اب۔'' حیرت انگیز طور پر کتے نے فوراً اس کی پینٹ چھوڑ دی اور جیک کے آگے دوڑنے لگا جیک اس کے پیچھے پیچھے تھا کتا دیوار کے پاس پہنچ کر رک گیا اور جیک کی طرف دیکھنے لگا اور ہلکی آواز میں غرانے لگا۔ جیک نے دیوار پر دیکھا وہاں رسی لٹکی ہوئی تھی اور پھولوں کے پودوں کے پاس گوشت کا بڑا ٹکڑا موجود تھا اور جہاں رسی

لگی ہوئی تھی وہاں خون کے چند قطرے بھی موجود تھے جیک کو لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ آ گئی۔

کچھ لوگوں نے یقیناً ٹوبی کو اٹھانے کی کوشش کی ہو گی لیکن ہمیشہ کی طرح وہ ناکام لوٹے ہوں گے۔

پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا بہت سے لوگ ٹوبی کو جیک سے خریدنا چاہتے تھے لیکن جیک اس بارے میں کچھ سننا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ اکثر کچھ لوگوں نے اسے گھر سے اٹھوانے کی کوشش کی۔

لیکن ٹوبی نے ہر بار ان کی ہر کوشش ناکام بنا دی وہ بہت چالاک تھا جیک کو کبھی اس کی حفاظت کی فکر نہیں ہوئی تھی، کیونکہ اسے ٹوبی پر بھروسہ تھا کہ وہ اتنی آسانی سے کسی کے ہاتھ نہیں لگے گا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

رات کو بھی یقیناً اسے کسی نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن ان کے ہاتھ پھر ناکامی کے سوا کچھ نہیں آیا تھا۔ خون کے قطرے اس بات کے گواہ تھے کہ وہ یقیناً زخمی بھی ہوئے ہوں گے وہی تک اٹھانا بھول گئے وہ گوشت میں بے ہوشی کی دوا ملا کر لائے ہوں گے۔ لیکن شاید انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ٹوبی جیک کے علاوہ کسی سے گوشت نہیں کھاتا تھا۔ جیک کو ساری کہانی سمجھ میں آ چکی تھی اس کے لبوں پر جاندار سی مسکراہٹ پھیل گئی وہ نیچے بیٹھ گیا اور پیار سے ٹوبی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

☆......☆......☆

وہ سب چار کی تعداد میں تھے اس سخت گیر آدمی کے آگے یوں سر جھکائے کھڑے تھے جیسے شہنشاہ اکبر کے دربار میں اس کے زیر عتاب درباری...... وہ جھگڑالو بڈھا ان کا باس تھا جو اس وقت ان پر گرجنے برسنے میں مصروف تھا۔

"نکمو...... بدحرامو...... حرام کی روٹیاں توڑ توڑ کر تم سب سست ہو گئے ہو ایک کام کہا تھا تم سے اور وہ بھی تم سے نہ ہو سکا۔ ایک کتے کو اٹھوانا تھا اور تم لوگ یوں دیر کر رہے ہو جیسے میں نے اس ملک کے صدر کو اغوا کرنے کی بات کر دی ہو۔ مفت خورو، کچھ کھایا پیا حلال کر لو۔ اتنا عرصہ میں نے تم لوگوں کو مفت بٹھا کر کھلایا ہے اور بدلے میں اک چھوٹا سا کام کہا وہ تم لوگ وہ بھی نہ کر سکے لعنت ہو مجھ پر...... جو تم لوگوں کو بیٹھا کر کھلایا۔"

"بے شک......" ایک عتاب زدہ جس کا نام جم تھا دل میں بولا۔

"باس وہ دراصل۔" دوسرے عتاب زدہ جسے سب ڈیک کہہ کر پکارتے تھے۔ منمناتے ہوئے بولا لیکن اس کی منمناہٹ کو باس کی دھاڑتی ہوئی آواز نے خاموش کروا دیا۔

"بکواس بند کرو۔ اب تمہارا یہ بہانہ ہو گا کہ وہ کتا بہت چالاک ہے کسی صورت ہاتھ نہیں آتا۔ الٹا تم لوگ دم دبا کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔"

ڈیک نے دل ہی دل میں باس کی قیافہ شناسی کو داد دی اور تم......؟ ایک اور عتاب زدہ کی طرف اشارہ ہوا جو یقیناً ہنری تھا۔ "تم پر تو مجھے پورا بھروسہ تھا کہ تم ہر حال میں اس کتے کو اٹھا کر لے آؤ گے لیکن تمہارے چہرے پر تو سب سے زیادہ پھٹکار برس رہی ہے پاؤں بھی زخمی کروا بیٹھے۔ بدحرام۔" عتاب زدوں کے ہونٹوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ پھیل گئی بدحرام اور باس دونوں کو ان تینوں پر جی بھر کے غصہ آیا۔

"بے شرمو یہ آخری وارننگ ہے تم لوگوں کے لئے اگر اس بار تم لوگ ناکام ہوئے تو اپنا حال دیکھنا اس شہر میں منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی بھیک مانگتے پھرو گے۔ یا شہر کی نالیاں صاف کرتے پھرو گے۔"

یہ اشارہ اس عتاب زدہ کی طرف تھا جس کا نام چارلس تھا لیکن وہ ہرگز شہزادہ چارلس جیسا نہ تھا بلکہ کسی زمانے میں بھیک مانگتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور جیل کی ہوا کھا کے آیا تھا۔

چارلس نے منہ بنایا یہ اس کی چڑ تھی۔ جس سے اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ وہ وہ سب اسے اسی بات سے زچ کرتے تھے۔ اس بار بدحرام یعنی ہنری کا ہلکا سا قہقہہ نکل گیا یقیناً اس کا بدلہ پورا ہوا

جو چارلس نے اسکی بے عزتی پر مسکرا کر کیا تھا۔ باس نے گھور کر ہنری کو دیکھا پھر سر جھٹک دیا۔

"دفع ہو جاؤ سب یہاں سے اور جلد ہی مجھے خوش خبری سناؤ ورنہ عرش سے فرش پر آنے کتنی دیر لگتی ہے بھلا......؟" باس کا اشارہ کس طرف تھا وہ سب اچھی طرح جانتے تھے وہ سب ایک نمبر کے نکمے اور کام چور تھے نہ جانے باس کو ان چھوٹے سے مجرموں میں کیا نظر آیا کہ انہیں اپنے ٹھکانے پر لے آیا ان کو اچھا کھانے پینے کو دیا اور ساتھ میں تھوڑی بہت تربیت بھی۔

وہ تو شاید قسمت مہربان تھی کہ باس نے ایک دو چھوٹی وارداتوں میں انہیں موقع دیا بلکہ آزمایا تو وہ اس میں کامیاب ہوئے اور خوش قسمتی جو ہنری کے نزدیک بدقسمتی ہی تھی ان میں کامیابی میں زیادہ ہاتھ ہنری کا تھا۔ اس لئے باس اس پر زیادہ مہربان رہتا تھا اور بھی جو ناکامی ہوتی تو سارا ملبہ بے چارے ہنری پر گرتا اس لئے وہ بہت عاجز رہتا تھا۔

جیک اس وقت بینک میں موجود تھا ٹونی بھی حسب معمول اس کے ساتھ تھا۔ جیک کو کچھ رقم کی ضرورت تھی اس لئے وہ ادھر آیا تھا لیکن اس کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک آفت آ پڑی۔

اس بینک میں تین ڈاکو گھس آئے وہ مسلح تھے چہروں پر ان کے نقاب تھا لیکن سفاکی ان کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی تمام عملے اور بینک میں موجود عام لوگوں کو ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دیا اور پستول دیکھ کر کوئی انکار کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جیک کے ہاتھ بھی اوپر اٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک ڈاکو بینک کے دروازے پر ایک تمام لوگوں پر نظر رکھے ہوئے تھا اور ان سب کی جیبوں کو چیک کرنے کے بعد مجبوری سے رقم بیگ میں ڈالنے میں مصروف تھا یہ سارا کام صرف پانچ منٹ میں ہوا تھا۔

ٹونی کی توجہ جیک کی طرف تھی۔ جیسے وہ کسی اشارے کا منتظر ہو بینک میں خطرے کے وقت بجایا جانے والا الارم بھی موجود تھا جس کے بجنے سے صرف تین منٹ بعد پولیس آ جاتی لیکن مشکل یہ تھی کہ جہاں اس الارم کا بٹن تھا وہیں پر ایک آدمی کھڑا ہوا تھا اور اس کی ساری توجہ ان پر تھی اس لئے وہ سب ہلنے جلنے سے قاصر تھے اب تک کسی نے کتے پر توجہ نہیں دی تھی۔

جیک نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ اشارہ کیا ٹونی سمجھ چکا تھا وہ غیر محسوس انداز میں کھسکتا ہوا اس بٹن کے قریب پہنچا چونکہ اس ڈاکو کی ساری توجہ پر تمام لوگوں پر تھی اس لئے وہ کتے کو نہ دیکھ سکا۔

ٹونی نے اگلا پیر اٹھایا اور بٹن دبا دیا۔ الارم جھنجھنانے لگا صرف تین منٹ کی بات تھی سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ ڈاکوؤں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے انہیں سمجھ نہیں آئی کے الارم کس نے بجایا جب سمجھ آئی تو دیر ہو چکی تھی پولیس کی گاڑی کا سائرن قریب آ چکا تھا ڈاکو بھاگنے کے چکر میں تھے بدحواسی میں انہیں پستول چلانے کا خیال بھی نہیں آیا شاید انہوں نے یہ سوچا ہوگا کہ پکڑے تو ویسے بھی جانا ہے تو کسی کو گولی مار کر کیس مضبوط کرنے کا کیا فائدہ؟

دو پکڑے گئے تیسرا پچھلے دروازے سے بھاگنے کی چکر میں تھا ٹونی نے لپک کر اس کی ٹانگ دانتوں میں دبالی وہ درد سے چلانے لگا پولیس نے آگے بڑھ کر ہتھکڑی اسے پہنا دی اور ٹونی کو تھپکی دی بعد میں اس کارنامے کا خوب چرچا ہوا۔

ٹی وی اخباروں نے خوب مرچ مسالہ لگا کر خبر چلائی۔ دنوں میں شہرت پورے ملک میں پھیل گئی کئی امیر کبیر لوگوں نے منہ مانگے داموں کتے کو خریدنے کی پیشکش کی لیکن جیک کو یہ کسی صورت گوارہ نہیں تھا کئی لوگوں نے اسے اغوا کرنے کی بھی کوشش کی جن میں وہ کامیاب نہیں ہوئے انہی میں ہنری گروپ بھی تھا۔

☆......☆......☆

چارلس عتاب زدگان اس وقت ایک ریسٹوران میں بیٹھے تھے انہوں نے کونے والی میز منتخب کی تھی کیونکہ انہیں جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے

لئے یہی جگہ ملتی تھی جو برتنے پاس ہی برائیاں کرتے
تھے جبھی چارلس کے بقول ان کا کھانا ہضم ہوتا تھا
اور تپتے دل پر جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑتے تھے۔

وہ سب اس وقت باس کی برائیاں کرنے کے
علاوہ اس منحوس کتے کو کوسنے میں بھی مصروف تھے
جو ہر بار انہیں چکمہ دے جاتا تھا۔

یار ہنری ذرا اس رات کی تفصیل تو بتانا جب اس
منحوس کتے نے تم کو اس بے دردی سے کاٹا اور وہ بھی
جھوک سے...... زیک کے لہجے میں تمسخرانہ ہمدردی تھی
جس کو ہنری نے قطعاً محسوس نہیں کیا اور کئی بار کا دہرایا ہوا
واقعہ پھر سے دہرانے لگا۔

"یار وہ کتا تو مجھ سے بھی بڑھ کے چالاک
نکلا، میں نے تم لوگوں کے کہنے پر اسے بیہوشی ملی دوا والا
گوشت ڈالا اور وہ کم بخت بھاگ کر گوشت کی طرف آیا
اس جگہ کچھ اندھیرا تھا میں سمجھا کہ وہ گوشت کھا رہا ہوگا
جب کچھ دیر تک اس کی آواز نہیں آئی تو میں آہستہ سے
نیچے اترا میں سمجھا وہ یقیناً بے ہوش ہو چکا ہوگا لیکن وہ
منحوس بار اپورڈوں کے پاس ہی چھپ کر میرے نیچے
اترنے کا انتظار کر رہا تھا، گوشت کو اس نے منہ لگانا بھی
گوارہ نہیں کیا، مجھے سمجھنے میں دیر ہوگئی پتہ اس وقت چلا
جب میری پنڈلی اس کے منہ میں تھی کم بخت کے دانت
اتنے تیز تھے کہ مجھے لگا پنڈلی ابھی باقی ٹانگ سے الگ
ہونے ہی والی ہے۔

بڑی مشکل سے رسی کے سہارے دیوار پر چڑھا
اور تم لوگوں تک پہنچا آگے کی کہانی کا تو تم لوگوں کو معلوم
ہے رسی وہیں چھوڑنی پڑی اور سرپٹ بھاگے۔ ہائے کم
بخت...... میری ٹانگ...... درد تو کسی صورت کم نہیں
ہو رہا۔" اس کے پھٹکار زدہ چہرے پر مزید پھٹکار برسنے لگی
تینوں عتاب زدگان جو بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکے
ہوئے تھے بات کے اختتام پر ہنسی فوارے کی مانند ان
کے لبوں سے خارج ہوئی اور ان کے منہ سے نکلنے والے
بارش کے چھینٹے ہنری کے پھٹکار زدہ چہرے کو مزید
منحوس بنا گئے۔ وہ بے چارہ بھی چھپتی نگاہوں سے ان
تینوں ہی کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس کے چہرے کی طرف
دیکھتے ہوئے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

☆......☆......☆

ٹومی کے بھی کارنامے سن کر بہت سے لوگ
اسے حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے ٹومی
باقاعدہ سدھایا ہوا کتا نہیں تھا۔ لیکن جیک نے گھر میں
ہی اسے اتنی تربیت دی تھی کہ وہ بہت سے سدھائے
ہوئے کتوں سے بہتر بات کو سمجھتا تھا۔

ٹومی جیک کو کہاں سے ملا......؟ یہ ایک لمبی کہانی
ہے، ہوا کچھ یوں کہ جیک اپنے دوستوں کے ساتھ شہر سے
کچھ دور جنگل کی سیر کے لئے گیا ہرا بھرا خوبصورت جنگل
اس کو ہشاش بشاش کرنے کے لئے کافی تھا۔ شہروں میں
بھلا ایسے نظارے کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ اتنے حسین
منظر کا دیوانہ ہو رہا تھا۔ گھومتے پھرتے پھل دار درختوں
سے پھل توڑتے کھاتے شام ہونے کے قریب آ گئی۔
جب وہ اپنے دوست کے ساتھ گھر کو لوٹنے لگا تو اس نے
کسی کتے کے غرانے کی آواز سنی۔

پہلے تو وہ سہم گئے کہ کہیں کوئی خوفناک درندہ
ہی موجود نہ ہو۔ لیکن اس کے دوست نے کہا کہ اس
جنگل میں عام جانور کے علاوہ کوئی خطرناک جانور نہیں
پائے جاتے۔

آواز پھر آئی جو کسی کتے سے مشابہ تھی۔

"مجھے لگتا ہے کسی کو ہماری مدد کی ضرورت
ہے۔" یہ جیک تھا اس کے دوست نے اتفاق کیا اور وہ
ان جھاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔ جہاں سے غرانے کی
آوازیں آ رہی تھیں وہ وہاں پہنچے۔

ایک کتیا زخمی نیم مردہ حالت میں آہستہ آہستہ
غرا رہی تھی اور اس کے قریب ایک اس کا پلا دودھ پینے
میں مصروف تھا۔ اس کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ماں
مرنے کے قریب ہے۔

کتیا نے ان کو آتے دیکھ کر سر اٹھایا اور ہلکے سے
غرا کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں شاید انسان
کو دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اس کے بچے کو کچھ

نہیں ہوگا۔"

جیک کو بہت افسوس ہوا اس نے چھوٹے پلے کو اٹھایا حیرت انگیز طور پر صرف ایک ہی پلا موجود تھا باقی پتہ نہیں کہاں تھے شاید ان شکاریوں نے اٹھالیا ہو جنہوں نے اس کتیا کو زخمی کیا تھا کیونکہ اس کے جسم پر گولی کا نشان واضح موجود تھا۔

وہ بہت خوبصورت پلا تھا۔ جیک اسے اپنے ساتھ شہر اپنے گھر لے آیا۔ گھر میں کسی نے بھی اعتراض نہ کیا۔ یہ سال پہلے کی بات تھی۔ جیک کی ساری توجہ اب ٹوبی پر تھی۔ ٹوبی بھی اس سے مانوس تھا کھیل کھیل میں جیک نے ٹوبی کی اچھی خاصی تربیت کروالی تھی۔

آہستہ آہستہ اس کے تمام کارنامے مشہور ہونا شروع ہوگئے۔ وہ ایک نہایت ذہین اور چالاک کتا تھا۔ جو اپنے دشمنوں کو نگنی کا ناچ ناچنے پر مجبور کردیتا تھا۔

باس جس کا اصل نام نام ہیر اللہ تھا اس کو کسی بیرون ملک دوست کو ٹوبی کا پتہ چلا۔ وہ اس دن سے اس کے سر ہوگیا کہ چاہے جتنی قیمت ہوجائے ہر حال میں وہ کتا چاہئے اور اس کے بدلے وہ باس کو بھی بے بہا دولت سے نوازتا۔ اسی لالچ میں باس کب سے ان چاروں کے پیچھے پڑا ہوا تھا لیکن وہ بدقسمتی اس میں کسی طور کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔

باس کا پارہ ان دنوں آسمان کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ماتھا شکنوں سے بھرپور ان چاروں کا دل دہلائے دیتا اور وہ آنے والی مصیبت سے لرزیدہ رہتے تھے۔

جیک نے بھی ٹوبی کے لئے خصوصی حفاظت کا بندوبست نہیں کیا تھا کیونکہ جب بھی کبھی کسی نے اسے اٹھانا چاہا وہ ہمیشہ ناکام ہوجاتا تھا۔ ٹوبی انہیں چکمہ دینے میں کامیاب ہوجاتا تھا اس لئے جیک کو کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔

☆......☆......☆

ان چاروں کے پاس آخری موقع تھا اپنی عزت اور موجودہ حیثیت بچانے کا۔

وہ دن رات اسی سوچ میں مشغول رہتے کہ کیسے اس کتے کو اغوا کیا جائے؟

"کیوں نہ اسے گھر سے اٹھوانے کی بجائے اسے گھر سے باہر کہیں لاکر اٹھایا جائے۔" یہ جم تھا جو کبھی ہی سوچنے کی زحمت گوارا کرتا تھا۔

ہنری نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"تو اسے گھر سے باہر تمہارا باپ لائے گا اور اگر وہ آ بھی جائے تو کیا اسے بھری سڑک سے اغوا کرنا آسان ہوگا۔" جم کا چہرہ ولٹک گیا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ کسی طریقے سے جیک کو اغوا کرتے ہیں کتا خود بخود کچے دھاگے سے بندھا چلا آئے گا کیونکہ وہ جیک سے الگ ہوتا ہی نہیں۔" یہ چارلس تھا جس کا مشورہ سب کو خاصا معقول لگا وہ گردن اکڑائے بیٹھ گیا۔

"اتنی بھی گردن نہ اکڑاؤ۔ ٹوٹ گئی تو پھر یہ اکڑ کسے دکھاؤ گے۔؟" چارلس بے چارہ کھسیا گیا اور بندہ باتہذیب بن کے بیٹھ گیا۔ پھر منصوبہ تشکیل پا گیا۔

جیک کی ہر حرکت پر نظر رکھی جانے لگی اس کے معمولات کو نوٹ کیا جانے لگا۔ جس کے ذریعے یہ بات ان کے علم میں آئی کہ وہ ہر بدھ کی سہ پہر لانگ ڈرائیو پر ضرور جاتا تھا ٹوبی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ سب کچھ طے ہوگیا۔

مومن کی معراج

☆ نماز روح کی غذا ہے
☆ نماز دل کو منور کرتی ہے۔
☆ نماز دماغ کو تراوت بخشتی ہے۔
☆ نماز ذکر اللہ ہے۔
☆ نماز شکرانہ وجود انسانی ہے۔
☆ یہی تو نماز ہے جو جس کے متعلق یوم الحشر میں پہلا سوال ہوگا۔
☆ یہی تو نماز ہے جو نبی کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔
☆ یہی تو نماز ہے جو محافظ عذاب قبر ہے۔
☆ یہی تو نماز ہے جو دین کا ستون ہے۔

(حافظ سلمان۔ کراچی)

بدھ کے دن وہ نسبتاً ایک ویران سڑک پر کھڑے ہوگئے۔ اپنی جیپ کے ساتھ وہ یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ بھی لانگ ڈرائیو کے لئے آئے ہوں اور کچھ دیر سستانے کے لئے رکے ہوں۔ کچھ ہی دور سے انہیں جیک کی گاڑی نظر آگئی وہ چوکنے ہوگئے لیکن بظاہر اپنے آپ میں مگن رہے۔

کچھ دور گاڑی رک گئی ان سب میں تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ کہیں جیک کو ان پر شک تو نہیں ہوگیا لیکن جلد ہی قسمت نے ان کے دروازے پر دستک دی جیک ٹونی کے ساتھ اپنی گاڑی سے اتر کر ان تک آتا دکھائی دیا وہ حیران نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے بہرحال یہ تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جیک خود ان تک چل کے آئے گا۔

"ہیلو......" جیک قریب آیا۔

"ہائے......" وہ سب یک زبان ہوکر بولے۔

"دراصل میری گاڑی میں کچھ خرابی آگئی ہے اگر آپ نے ابھی واپس جانا ہے تو پلیز مجھے بھی لفٹ دے دیں میں شہر سے کسی مکینک کو لے آؤں گا تاکہ وہ میری گاڑی ٹھیک کردے۔"

وہ تو جیسے تیار بیٹھے تھے فوراً ان کو گاڑی میں بٹھالیا اور بیٹھتے ساتھ ہی کلوروفارم سے بھیگا رومال ان کی ناک سے لگ چکا تھا، دونوں بے ہوش ہوگئے وہ چاروں قدرت کی اس فیاضی پر حیران تھے کہاں تو وہ اتنے عرصے سے جتن کر رہے تھے اور کہاں یہ چھت سے ٹپک پڑے تھے، گاڑی کا رخ ان کے ٹھکانے کی جانب تھا جہاں پہلے سے سب کچھ انہوں نے طے کر رکھا تھا۔

گاڑی سے اتار کر انہیں کمرے میں منتقل کرنے کے بعد انہوں نے موج مستی کا سوچا۔ جام پر جام لنڈھاتے وقت انہیں یہ خیال تک نہ آیا کہ وہ باس کو بھی اطلاع دے چکے ہیں اور باس اب کے تب بس پہنچنے ہی والا تھا اور انہیں اتنے خطرناک کام کے بعد یوں مستی کرتے دیکھ کر اس کا غصے سے کیا حال ہوتا۔

جیک کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ٹونی سمیت ایک کمرے میں پایا۔ ذہن سے دھند چھٹی تو اسے خیال آیا کہ وہ کس حالت میں اغوا ہوئے ہیں وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا ٹونی اس کے قریب موجود تھا اور وہ بھی ہوش میں آچکا تھا۔

جیک نے دروازے کی طرف دیکھا حیرت انگیز طور پر دروازہ کھلا ہوا تھا وہ احتیاط سے دروازے تک آیا اور باہر جھانکا کوئی بھی موجود نہیں تھا اس نے ٹونی کو اشارہ کیا وہ بھاگ کر آیا۔

دونوں آہستہ سے باہر نکلے ساتھ والے کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھلا ہوا تھا جیک کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے اس کمرے کو کھولا اور اندر جھانکا۔

وہی چاروں جو انہیں اغوا کرکے لائے تھے شراب کے نشے میں مدہوش تھے۔

جیک کو ایک خیال سوجھا وہ دبے قدموں اندر داخل ہوا اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ ان کے موبائل تک جاتا۔ ہنری نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں پیارے...... ابھی ہم اتنے بھی مدہوش نہیں ہوئے کہ تو جو چاہے کرتا پھرے۔ ابھی تو پولیس کو فون کرنے والا تھا نا......؟"

اس کی آواز نشے سے لڑکھڑا رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے جیک کا ہاتھ اپنی طرف پوری مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

ہنری کی آواز سے وہ تینوں بھی ڈبڈبائی نشے سے سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے۔ ہنری کے ہاتھ پستول آچکا تھا اس لئے جیک نے کسی بھی قسم کی مزاحمت کی کوشش ترک کر دی تھی۔

"ہم ایسے تو تم کو نہیں چھوڑیں گے۔؟ تاوان پیارے......

ابھی ہمیں اپنے گھر کا نمبر دو ورنہ یہ گولی سیدھی تیری کھوپڑی میں سوراخ کردے گی۔ نشے کی زیادتی سے وہ بمشکل الفاظ ادا کر رہا تھا۔

"تمہارا کتا ہمارے باس کے پاس اور تیرے بدلے تاوان ہماری جیب میں...... ہا...... ہاہاہا......" وہ

بھیانک آواز میں ہنسنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس چکر میں اس کی آواز خاصی بے ڈھنگی ہوگئی۔ جیک کو ہنسی روکنا مشکل لگنے لگا۔

"نمبر دو جلدی۔"

جیک کو شرارت سوجھی اس نے گھر کا نمبر لکھوانے کی بجائے قریبی پولیس اسٹیشن کا نمبر لکھوا دیا اور حسب توقع ہنری کو پتہ بھی نہ چلا۔

ہنری نے نمبر ملایا دوسری طرف سے شاید کال اٹینڈ کی گئی تبھی وہ بولا۔

"آپ کا لڑکا ہمارے قبضے میں ہے اگر اس کی خیریت چاہتے ہو تو فوراً اس پتے پر دو لاکھ ڈالرز لے کر پہنچو ورنہ اس کی زندگی کی ہم کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔"

اور اگر پولیس کو بتانے کی کوشش کی تو تمہارے لڑکے کے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ہنری نے اسی جگہ کا پتہ لکھوا کر فون بند کر دیا۔ جیک مطمئن ہوگیا پولیس اب کے تب پہنچنے ہی والی تھی۔

ہنری اور اس کے ساتھی یوں خوش تھے جیسے تاوان کی رقم ان کے ہاتھوں میں آچکی ہو اور ساتھ ساتھ باس سے بھی انعام ملنے کی خوشی تھی۔ جیک اطمینان سے ٹونی سمیت وہیں بیٹھ گیا اب اسے کوئی فکر نہیں تھی۔

وہ سب نشے میں تھے لیکن جیک پر خاصی نظر رکھے ہوئے تھے ابھی انہیں ذہن کے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ پولیس نے ہلہ بول دیا، وہ سب نشے میں اول فول بکنے لگے۔

جیک کو زوروں کی ہنسی آنے لگی ہنری ابھی تک جیک کو دھمکیاں دے رہا تھا کہ اس نے پولیس کو بلانے کی جو غلطی کی ہے اس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑے گا۔

ادھر باس ان چاروں کی اطلاع پر ان کے ٹھکانے کی طرف آیا لیکن اس نے دور ہی سے پولیس کی گاڑی دیکھ لی تھی اس لئے وہ الٹے قدموں واپس ہوگیا۔ اسے شک تو تھا کہ وہ چاروں کوئی گل ضرور کھلائیں گے اب پولیس کی گاڑی دیکھ کر اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔

☆......☆......☆

چھ ماہ جیل کاٹنے کے بعد جب وہ باہر آئے تو سب سے پہلے باس کے پاس پہنچے لیکن باس نے انہیں دھکے دے کر نکال دیا، وہ عرش سے فرش پر تو کب کے آچکے تھے لیکن پتہ انہیں چھ ماہ بعد چلا وہ بے چارے اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔

شام کے سات جیک اپنے دوست کی طرف آیا جب وہ گلی سے گزرنے لگے تو ٹونی نے بھونکنا شروع کر دیا۔

ایسا صرف اس وقت ہوتا تھا جب کوئی خاص بات ہوئی تھی۔ جیک نے ٹونی کو بھونکتے دیکھا تو اس نے حیران ہو کر اس طرف دیکھا وہاں کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا، ہاں ایک آدمی نالیاں ضرور صاف کر رہا تھا لیکن یہ حیرانگی کی بات تو نہیں تھی اس آدمی کی کمر جیک کی طرف تھی اس لئے جیک اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا ٹونی مسلسل بھونکے جا رہا تھا۔

اتنے میں اس آدمی نے اپنا چہرہ جیک کی طرف کیا جیک آنکھیں پھاڑ کے اسے دیکھنے لگا۔

وہ چارلس تھا جو کبھی بھیک مانگنے کے جرم میں جیل کی ہوا کھا کے آیا تھا پھر جیک اور ٹونی کو اغوا کرنے کے جرم میں اور اب......؟

اب وہ نالیاں صاف کر رہا تھا کیونکہ اس کے کرنے کو اب یہ کام تھا جیک کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ چارلس کی، کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی حالت تھی پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے ایک جانب دوڑ لگا دی، وہ خوف زدہ ہوگیا تھا پھر جیل جانے کا سوچ کر۔

"بے چارہ۔" جیک کے منہ سے ہمدردی بھرے الفاظ نکلے اور پھر اسے سرپٹ بھاگتا دیکھ کر اس کے منہ سے قہقہہ نکل گیا۔

موت کا شکار

محمد خالد شاہان۔ صادق آباد

خوفناک، دہشت ناک، وحشت ناک اور تاریک جنگل میں اچانک دلوں کو دہلاتا ایک زوردار دھماکہ ہوا جس سے جنگل کے سارے باسی اپنی اپنی جگہ دل تھام کر لرز گئے اور پھر.....

دلوں کو تھراتی اور آنکھوں کو پتھراتی، سطر سطر اور لفظ لفظ لہولہان، نا قابل یقین حقیقت

دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ جاپان کو رنگون پر حملہ کرنے کی خاطر خواہ سزا مل چکی تھی

میں ان دنوں بطور ریلوے انچارج آیا ہوا تھا۔ جے پور کے شمال میں تقریباً سولہ کلو میٹر دور ایک بڑا ریلوے ٹریک زیر مرمت تھا جو سستی کے قابل افراد کی وجہ سے ایک عرصے سے تعطل کا شکار تھا۔ کام اور ذمے داری کے معاملے میں انگریز واقعی خاصا اصول پرست واقع ہوا ہے اور وہ ایماندار افسروں سے کام لینا بھی جانتا ہے اور مفادات کے حصول میں جے پور کے ایک بڑے ریلوے جنکشن آفس کی پرتعیش رہائشی کالونی سے عارضی طور پر چند ماہرین اور ملازموں کے ساتھ ایک ڈاک بنگلے میں رہائش پذیر ہو گیا۔

جنگلات میں انڈر سیکریٹری شاہد صاحب کے ساتھ میں نے ایک شکاری مہم میں حصہ لیا تھا۔ جنگلات میں ایک آدم خور چیتا نے گارڈز کے علاوہ اطراف میں خاصی دہشت مچا رکھی تھی۔ شاہد صاحب شکار کے رسیا تھے۔ بالخصوص درندوں کے شکار کے لیے تو وہ ہر سے کرے بسنہ دکھائی دیتے تھے اس مہم میں میں نے بھی شوقیہ حصہ لیا۔ اور مجھے کیا معلوم تھا کہ اتفاقاً ہی مجھ سے اتنا بڑا کارنامہ ہو جائے گا جو مجھے باقاعدہ نہیں تو بے قاعدہ ہی سہی۔ مجھے شکاریوں کی فہرست میں شامل کروا دے گا۔

قصہ یوں تھا تارائی ۔ کے جنگلات کے بیچوں بیچ جھیل، کھنڈ کے کنارے ایک خوبصورت بنگلہ تھا جہاں میں انڈر سیکریٹری شاہد صاحب ان کے دوست زاہد اور حیدر صاحب رہائش اختیار کیے ہوئے تھے، یہ خالصتاً شکاری مہم تھی۔

شاہد صاحب کی طرح ان کی بیوی بھی مہم جو خاتون تھیں۔

ان کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ ایک پرکشش اور دبنگ خاتون تھیں

زاہد اور حیدر میرے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ ہم تینوں اکثر چھوٹے موٹے جانوروں کا شکار کرتے رہتے تھے میرے پاس ایک ڈبل بیرل رائفل تھی جس کی ایک نال میں سکہ اور دوسری نال میں چھرے ڈالے جاتے تھے چھروں سے اکثر ہم نے جنگلی مرغوں اور پرندوں کا شکار کیا تھا جب کسی درندے ریچھ یا بجبڑیا وغیرہ سے سامنا ہوتا تو سکے والی بیرل استعمال میں لاتے اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔

سیکریٹری شاہد صاحب شکار کے لیے رسیا تھے۔ تھوڑی بہت میری بھی ان سے شناسائی تھی مگر اس مہم

شناسائی کو پہنچنے کا موقع اب فراہم ہوا تھا۔ حیدر کا ایک دن فون آیا۔

"ارے یار ندیم عباس تیار ہو جاؤ۔ اب ہم جھک ماریں نہیں رہے۔" اس کے لہجے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

"کیا مطلب۔" میں نے قدرے چونک کر کہا۔

"ارے بھئی سب سے پہلے ایک لگژری بوگی بک کرالو۔ پوری کی پوری۔" اپنے سیکریٹری صاحب کے لئے۔ شکاری مہم پر جانا ہے ضلع تارائی، ان کی بیگم بھی ساتھ ہیں میں اور زاہد بھی ہوں گے تمہیں بھی چلنا ہے سمجھے۔" اس کا انداز دوستانہ تھا۔

میں نے فوراً ہی حامی بھر لی۔

اس طرح اب ہم سب تارائی کے گھنے جنگلات کے بیچوں بیچ جھیل.. کھنڈ کے کنارے ایک بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔ یہاں پہلے ہی سے ایک آدم خور شیر نے دہشت مچا رکھی تھی کوئی بھی درندہ آدم خور نہیں ہوتا۔ بھوک کی شدت شکار کی عدم دستیابی پھر عالم غیظ میں جب کسی انسان پر حملہ کر دیتا ہے تو اسے خون انسانی کی لت لگ جاتی ہے۔ آدم خوری کی ایک تیسری وجہ بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ آدم خوری میں شیر عالم غیظ میں پاگل ہو جاتا ہے۔ اور دیوانہ وار سائل پہ حملہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے آدم خور شیر کو ہمالیائی زبان میں گولر کہا جاتا ہے اس قسم کا آدم خور نسبتاً زیادہ خطرناک ہوتا ہے ہمارا واسطہ ایسے ہی ایک گولر آدم خور شیر سے تھا۔

شاہد کے پاس پانچ سو بور کی رائفل تھی اور ہمارے پاس بارہ بور کی ڈبل بیرل ایکسپریس شکاری رائفلیں۔

ایک دن ہم لوگ درخت پر بیس فٹ کی بلندی پر مچان بنا کر بیٹھ گئے تھے۔

یہ آدم خور اب تک گیارہ معصوم لوگ کو اپنا شکار بنا چکا تھا ان میں دو بچے اور تین عورتیں بھی شامل تھیں۔

کوتاہ قصہ۔ مچان سے چند گز کے فاصلے پر زمین میں کھونٹا گاڑ کر ایک بکری چارے کے طور پر باندھی گئی تھی۔ آدم خور کیخلاف ہماری یہ محاذ آرائی کوئی پانچویں بار تھی اور یہاں کسی چھناؤں ہو رہا تھا مگر ہر دفعہ آدم خور ہم سے بچ کر صاف نکلتا رہا تھا اس بار شاہد صاحب نے میرے مشورے کے مطابق اپنے ساتھ زیادہ مزدور نہیں لے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی مسز بھی ساتھ نہ تھیں۔ بس صرف ہم چاروں تھے۔ میں یعنی ندیم عباس، شاہد صاحب، حمید اور زاہد۔

ہم دم سادھے مچان پر بیٹھے چہار اطراف میں نظر دل کی کمندیں ڈالے ہوئے تھے۔

سہ پہر ہو چکی تھی۔ تارائی۔ کے گھنے جنگلات کا یہ دسطی علاقہ چاروں طرف سے گھنے اور جھتنار درختوں قد آدم پودوں اور لمبی لمبی جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ ففا دم بہ خود تھی اتنی گہری خاموشی ہمارے حق میں بہتر تھی مگر اس حق کا ہم صحیح استعمال نہ کر سکے اور جلد بازی کا شکار ہو گئے۔

اچانک نیچے چند گز کے فاصلے پر کھونٹے سے بندھی بکری نے پہلے ہولے ہولے اور پھر بتدریج زور زور سے منمنانا شروع کر دیا۔ ہم چاروں محتاط ہو گئے اور اپنی آنکھ آنکھیں چاروں طرف کا جائزہ لینے میں مرکوز کر دیں۔

بکری نے آدم خور کی صورت میں موت کو اپنی طرف بڑھتا محسوس کر لیا تھا۔ شیر کہیں آس پاس ہی تھا اور غالباً اپنے شکار پر نظریں جمائے کسی بھی سمت سے اچانک جھپٹنے کی تیاری میں تھا۔

یوں تو ہم نے بڑے بڑے ارادے دل میں باندھ رکھے تھے۔ لیکن سچی بات یہ تھی کہ شیر کی اپنی ایک دہشت ہوتی ہے۔ بکری کی روح فرسا بے چینی دیکھ کر خود میرے دل میں مارے انجانے خوف کے دھک دھک ہونے لگی تھی، شاہد صاحب نے اپنی پانچ بور رائفل کو ہلکی آواز کے ساتھ کلک کیا اور پھر دم سادھے چہار اطراف پہ غور تکنے لگے۔ کسی بھی وقت آدم خور بکری پر جھپٹنے والا تھا اور ہمیں اس آدم خور کو دیکھتے ہی تاک کر گولیاں برسانی تھیں بہ صورت دیگر آدم خور غضب ناک ہو کر مچان پر زقند بھر سکتا تھا۔

اگلے ہی لمحے ہمارے بائیں جانب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ابھری اور پھر لگ بھگ چھ فٹ کا ایک

غیر معمولی لمبے اور قوی الجثہ ببر شیر نے بکری کو آ دبوچا۔

ہدف کو چند گز کے فاصلے پر دیکھنے کے جوش اور خوشی کے ملے جلے احساس نے عجلت کے شاخسانے کو جنم دیا اور سب سے پہلے شاہد صاحب نے آدم خور کا نشانہ لیتے ہوئے فائر کر ڈالا۔

ساکت فضاء میں کارتوس کا کان پھاڑ دھماکا ہوا اور نشانہ خطا ہو گیا۔ آدم خور شیر نے شکار چھوڑ کر ایک غضب ناک دھاڑ ماری اور سیدھا مچان کی طرف جست بھری۔ آدم خور کو غضب ناک عالم میں اپنی جانب متوجہ پا کر ہم باقی تینوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ زاہد اور حیدر کے ہاتھوں سے تو بندوقیں چھوٹ کر گر پڑیں لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور تاک کر آدم خور شیر پر تلے اوپر دو فائر جھونک مارے۔ دونوں نشانے پر لگے اور شیر ہمارے مچان سے چند فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر آخری دھاڑ کے ساتھ دھپ سے جھاڑیوں میں گرا۔

شاہد صاحب ہنوز سناٹے کے عالم میں تھے۔ زاہد اور حیدر کے چہروں پر استعجاب انگیز خوشی آثار چھوڑ رہے ہوئے تھی بندوقوں کا دھماکوں سے تارائی کے پورے جنگل کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔ چرند پرند کا احتجاج آمیز شور سا مچ گیا تھا بس قصہ کوتاہ یہی وہ موقع تھا جب میرا شمار شکاریوں میں ہونے لگا تھا۔

☆......☆......☆

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ان دنوں میں بطور ریلوے افسر آیا ہوا تھا اور اپنے مختصر سے عملے کے ساتھ ڈاک بنگلے میں ٹھہرا تھا ریلوے ٹریک کی مرمت کا کام آخری مراحل میں تھا۔

ایک روز فلو کے باعث میں نے سائٹ پر جانے کی بجائے بنگلے میں ہی ذرا دیر آرام کرنے کو ترجیح دی۔ ویسے کام بھی آخری مراحل پر خاصا تسلی بخش انداز میں انجام پذیر تھا اس لئے تھوڑا آرام کرنے کو دل چاہا۔

ماگھ کی بھیگی راتوں والی خوشگوار صبح تھی رات بھر موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی اور اگلے دن تیز دھوپ نکل آتی۔ بلند و بالا اور گھنے درختوں کی ہری بھری شاخیں دھل کر نکھر جاتیں۔

میں اس سے بنگلے کے باغیچے میں کرسی ڈالے موجود تھا ناشتہ میں نے ادھر ہی ایک فولڈنگ ٹیبل پر کیا تھا۔ اب چائے پیتے ہوئے گزشتہ شب کی بارشوں میں بھیگی ہوئی صبح کی تازگی کو اپنے اندر منتقل کر رہا تھا بنگلے کا یہ باغیچہ مختصر ضرور تھا لیکن خوبصورت رنگا رنگ پھولوں اور سرسبز بیلوں سے لدا ہوا تھا۔ فرش گھاس سے مزین تھا پودوں اور گھاس کی نرم و نازک پتیوں پر شبنمی قطرے روپہلے موتیوں کی طرح دمک رہے تھے۔

دور سرسبز ڈھلوانوں والی فلک بوس عمارتوں پر ہرن سانبھر اور ایسے ہی دوسرے چھوٹے بڑے جانور قلانچیں بھرتے نظر آ رہے تھے۔ شمال کی سمت خوش رنگ پرندے محو پرواز تھے تو ایک جانب بلند و بالا بانس دیودار اور تاڑ کے درختوں سے پرے ہمالہ کی ہری بھری وادیوں میں تیتر، بٹیرے اور سرخ کلغیوں والے جنگلی مرغوں کے جھنڈ کے جھنڈ مستی میں مصروف تھے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے رامو میرے سامنے سے ناشتے کے برتن اٹھا کر لے گیا تھا میں اس چہار سو پھیلے حسین مناظر کی دلکشی میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک میرے کانوں سے موٹر گاڑی کے انجن کی گھر گھراتی آواز ٹکرائی۔ میں نے چونک کر لان سے باہر وسیع احاطے کی طرف نظریں گھمائیں تو بے اختیار میرے قدم گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

سامنے پرانے ماڈل کی خاکی ہڈ والی لینڈ کروزر رکی تھی بونٹ کے ساتھ مڈگارڈ پر جھولتے مخصوص مونوگرام والے پھریرے کو دیکھتے ہی میں [illegible] لینڈ کروزر کے چاروں سمتوں والے دروازے کھلے۔

وہ پانچ افراد تھے۔ دو افراد کو دیکھ کر میں چونکنے کے ساتھ ایک غیر متوقع سی خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ دونوں شناسا افراد میرے لنگوٹیے یار زاہد اور حیدر تھے اس سمے وہ دونوں نے کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے۔ دونوں ہی کا قد و قامت ٹھگنا اور گٹھا ہوا تھا البتہ ڈرائیونگ سیٹ اور اس کے ساتھ والی سیٹ سے اترنے والے صاحب ہندو تھے۔

میں نے پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ صاحب موصوف آزاد تھے، آزاد صاحب خاصے لمبے تڑنگے اور اچھی صحت کے مالک تھے، بیوی ان کی دبلی پتلی اور خوبصورت تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر خوش دلی سے ان کا استقبال کرتے ہوئے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

"ندیم عباس، ای این ریلوے۔"

اس کے بعد آزاد صاحب نے خوش دلی سے اپنا تعارف کرایا

زاہد اور حیدر نے کہا۔ "ہمیں معلوم تھا کہ تو ادھر ہی ہے۔"

تیرے کو پریا اڑ دیں گے، زاہد نے خالص کاٹھیاواڑی لہجے میں کہا اور میں بے اختیار مسکرا یا اور یا۔ میں ذرا کم گو واقع ہوا تھا رسمی کلمات کے تبادلے کے دوران ہم اندرال کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔

"شاہان ندیم ہیں ہمارے بہت پرانے دوست ہیں۔" ایک بڑے صوفے پر اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ دھنستے ہوئے حیدر نے آزاد صاحب سے میرا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہی وہ نڈر شکاری ہے جب انہوں نے اپنے سیکریٹری شاہد صاحب کو تارائی کے ایک آدم خور شیر کے خونی پنجوں سے بچایا تھا اور کمال پھرتی سے اس آدم خور شیر کو موقع پر ڈھیر کر دیا تھا۔"

"ویری نائس۔" شاہان کے منہ سے بے اختیار میرے لیے توصیفی کلمات نکلے۔ پھر شاہان صاحب نے اپنے جیب سے سگریٹ نکالی اور اسے سلگایا اور جلدی جلدی سے دو تین کش لگائے۔ پھر وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے پہلو بدل کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"ندیم عباس صاحب، اس سے پہلے آپ نے اور کہاں کہاں شکار کھیلا ہے، میرا مطلب ہے تارائی کے علاوہ؟" ان کا انداز انٹرویو لینے کا سا تھا۔

میں ہولے سے کھنکار کر پر اعتماد لہجے میں بولا اس سے پہلے میں نے بہت سی جگہوں پر شکار کیا ہے اور میرا آدم خور درندوں سے کم ہی واسطہ پڑا ہے میں شوقیہ شکار کھیلتا ہوں۔"

"گڈ" شاہان صاحب نے مخصوص لہجے میں کہتے ہوئے دھواں اگلا اور فضا میں بکھرے کثیف دھوئیں کے مرغولوں میں انہوں نے نظریں گاڑ دیں۔

"جناب یہ چھپا رستم ہے اس نے رحیم آباد کے ساڑھے سات فٹ لمبے آدم خور کو بھی موت کے گھاٹ اتارا تھا، اس کا نشانہ کمال کا ہے۔" اس بار زاہد نے میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور جانے کیوں میری چھٹی حس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کی یہاں اچانک آمد کسی ایسی ہی شکاری مہم کا شاخسانہ ہے۔ جس میں یہ لوگ مجھے بھی شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سوچ کر مجھے انوکھی مسرت کا احساس ہونے لگا۔

"ریئل ندیم عباس صاحب، اس کا مطلب ہے تمہارے بغیر ہماری مہم نامکمل ہوگی۔" شاہان صاحب کی گفتگو سے میرے خوش فہم خیالات کی تصدیق ہوگئی۔ تاہم میں بھی پہلو بچائے رکھتے ہوئے انجان سا بنا رہا۔

"میرا خیال ہے شاہان صاحب، ندیم عباس سے تفصیلی بات کرلینی چاہیے۔"

اچانک زاہد نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف تکتے ہوئے شاہان سے کہا اور انہوں نے جواباً دھیرے سے مسکرا کر اپنا سر اثبات میں ہلا دیا

دیکھو بھئی سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہارا یہاں کام کتنا باقی رہ گیا ہے۔" حیدر نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے میں پہلے آپ لوگوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرلوں پھر تفصیل سے گفتگو ہوگی۔" میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا

شاہان صاحب نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ "نو لیو اٹ۔ ہمارا ملازم شانی ساتھ ہے۔ ہمارے کھانے پینے کا بھی سارا سامان ہے ہمارے پاس۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی مسز کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اسی اثناء میں شانی اور دوسرا مختلف ساز و سامان اٹھائے اندر آ گئے۔

پھر دونوں ملازم ہمارے آگے دگی خاصی چوڑی ٹیبل پر ہلکی پھلکی اشیائے خورو نوش سرو کرنے لگے

حیدر اپنی بات دہرانے کی بجائے مستفسرانہ نظروں سے میری طرف تکنے لگا اور ادھر شاہان صاحب بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تو میں نے ذرا کھنکار کر جواباً کہا۔

"میرا کام اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے تین چار روز میں یہاں سے فارغ ہو جاؤں گا۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ میں ابھی فارغ ہوں اس لیے یہاں نظر آ رہا ہوں ورنہ اس وقت میں سائٹ پر ہوتا۔" میں نے اپنی بات مکمل کی

زاہد داسو سے چائے لیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ندیم! تم اب اپنے آپ فارغ ہی سمجھو، ہم دراصل یہاں سے سولہ کلومیٹر دور شمال کے علاقے میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں وہاں سنا ہے کافی عرصے سے ایک آدم خور شیر نے دہشت پھیلا رکھی ہے اور اب تک اس علاقے اور آس پاس کے علاقے کے کم از کم ڈیڑھ سو معصوم انسانوں کو جان سے مار چکا ہے۔

زاہد اتنا کہہ کر لمحے بھر کو رکا تو یکدم سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں مجھے حیرت تھی کہ خود مجھے یہاں رہتے ہوئے پندرہ سولہ روز ہو چکے تھے میرے کانوں تک اس آدم خور کی شہرت کیوں نہ پہنچی؟

"میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ حیدر نے لقمہ دینا ضروری سمجھا۔" اور تم ندیم عباس، ہماری اس مہم میں ضرور شامل رہو گے بلکہ شامل ہو چکے ہو۔ ہم ابھی اپنی تھکان اتاریں گے پھر ایک دو گھنٹوں بعد تمہارے ساتھ مانگھ پی روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں کے سردار صاحب ہمارے دوپہر کے بھوجن پر ہمارے منتظر ہوں گے۔"

میں نے اس کی بات بغور سنی اور دھیرے سے پرخیال انداز میں اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔

مزید لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ مانگھ پی کے آدم خور سے متعلق اور شکاری رائفلوں کی جانچ پڑتال میں گزر گیا۔ اس دوران میں نے زاہد اور حیدر سے اپنے دل کی الجھن نہ چھپا سکا اور اس خیال کا اظہار کر ہی ڈالا۔ "آخر مجھے ادھر رہتے سر میں دہتے ہوئے اس آدم خور کے بارے میں کیوں کچھ معلوم نہ ہوا!"

آسانی کی وجہ ہے اس کی، حیدر نے کندھے اچکا کر کہا اور اپنی بات مکمل کی۔ "یہ آدم خور پر اسرار سا واقع ہوا ہے۔ جس کے بارے میں ابھی تک یہ ہی نہیں پتہ چل سکا کہ وہ کس نسل کا ہے۔ شیر ہے چیتا ہے یا گلدار۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونکے بنا نہیں رہ سکا لیکن حیدر میری بات سے صرف نظر کرتے ہوئے بدستور اسرار بھرے لہجے میں بتانے لگا۔ "اس آدم خور کو کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔ وہ پراسرار طور پر کسی بھی بھولے بھٹکے شخص کو چپکے سے اٹھا کر لے جاتا ہے اور بدنصیب کی پھر اگلے دن لاش ہی ملتی ہے اور بھی باقیات کی صورت میں۔"

میں یہ تفصیل سن کر متحیر سا رہ گیا۔ مجھے تو جن بھوت والا معاملہ لگتا ہے۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

بہرطور اس پر اسرار آدم خور سے دو دو ہاتھ کرنے کو میرا دل کشاں کشاں اس علاقے میں جانے کو بے چین ہو چلا تھا۔ میں نے داسو کو ضروری ہدایت دیں اور پھر مختصر سا ریڈی میڈ بوریا بستر باندھا اپنی ایکسپریس رائفل ٹکڑوں کی حالت میں بریف کیس میں ڈالی اور عازم ہوا۔

☆......☆......☆

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پورا جنگل جیسے تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اوپر سے بجلی کی گرج چمک سے پورا جنگل گونجتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم سہ پہر تک وہاں پہنچ چکے تھے۔ دوپہر کا کھانا سردار کی حویلی میں ہم نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم ابھی حویلی میں عارضی طور پر رہائش پذیر ہو کر آدم خور کی بیخ کنی کی مہم کا پورے سکون کے ساتھ آغاز کریں مگر ہم نے انتہائی شکریے کے ساتھ ان کی پیشکش قبول کی اور پھر انہوں نے جنگل کے وسط میں بنے ایک شکاری بنگلے کی صفائی کروا کر فی الفور قابل رہائش بنا یا اور اب ہم ایک بڑے ہال کمرے اور دو چھوٹے کمروں کے اس چوکور بنگلے میں موجود تھے۔ سردار صاحب نے اپنے ملازموں کی

ایک کثیر تعداد ہمیں تفویض کرنی چاہی تھی لیکن ہم نے صرف ان کا ایک ملازم بابا کو ساتھ رکھ لیا تھا وہ بھی اس لئے کہ آس پاس کے علاقے کا وہ شناسا تھا

اس سے تو ہم سب ہی تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے شاہان صاحب اپنے کمرے میں جا سوئے تھے۔ زاہد بھی تھکا ہوا تھا۔ اس لیے وہ بھی اپنے کمرے میں پڑا سو رہا تھا۔ دوسرا کمرہ ہم تینوں کا مشترک تھا مگر میں نے اور حیدر نے ہال کمرے میں ہی سونے کو ترجیح دی تھی۔ پتہ نہیں کیوں نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

یہ ہال کمرہ اتنا زیادہ بڑا تو نہ تھا البتہ اس کی چھت خاصی بلند تھی فرش لکڑی کا تھا۔ درحقیقت یہ بنگلہ زمین کی سطح سے کافی بلندی پر تھا۔ اس میں ایک آتش دان بھی تھا جو ظاہر ہے ابھی سرد پڑا تھا کیونکہ سردی کا موسم نہ تھا۔ شمالاً جنوباً جالی دار شیشے کے شٹر والی کھڑکیاں تھیں۔ مغربی سمت میں داخلی دروازہ اور کمرے بنے ہوئے تھے یہ شکاری بنگلہ سردار کی حویلی تھی۔

رسلی جنگلات کا علاقہ ادھر سے ہی شروع ہوتا تھا۔ باہر بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور گھنے چوڑے پتوں والے درختوں پر بارش کی شراٹے دار پھوار جاری تھی کمرے میں ایمرجنسی لائٹ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

میں چارپائی پر کافی دیر تک بے خوابی کے عالم میں کروٹیں بدلنے کے بعد تھک کر اٹھ بیٹھا اور سگریٹ سلگا کر بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ایک دو کش لینے کے دوران دھیرے دھیرے چلتا ہوا کھڑکی کی طرف آیا اور اس کی دیوار گیر چوکھٹ سے ٹیک لگا کر باہر گھنے جنگل میں دور کرجتی چمکتی بجلی اور بارش کو تکنے لگا۔

کھڑکی کے ایئر ٹائٹ شیشے پر بارش کی بوندیں بہت دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ لکیروں کا جال سا تھا جو شیشے پر پھیل گیا تھا۔ جب بجلی چمکتی تو سامنے دور تک پھیلا ہوا جنگل روشن ہو جاتا۔

اچانک بجلی چمکنے کے دوران میری نظر ایک سائے پر پڑی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ انسانی سایہ تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک شکاری رائفل تھی اور اس کا حلیہ بھی کسی شکاری جیسا ہی محسوس ہوا تھا تاہم اس نے پتلون کی جگہ نیکر پہن رکھی تھی میں نے ذرا چونک کر پھر اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر اس بار وہ نظر نہ آیا۔ پھر اچانک جب بجلی چمکی تو مجھے کھڑکی کے شیشے کے ساتھ بالکل چپکا ہوا ایک بدہیبت چہرہ دکھائی دیا اور میرا دل جیسے کسی نے یکدم مٹھی میں جکڑ لیا۔ غیر ارادی طور پر میں کھڑکی سے چند قدم پیچھے کو ہوا اور لڑکھڑا سا گیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سی جیکٹ داڑھی بھنویں اتنی گھنی کہ آنکھوں تک کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ یہی حال بالوں کا تھا جو جناتوں کی طرح چوٹی کی صورت جھول رہے تھے۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ مجھے کسی صورت بھی پانی میں بھیگا ہوا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ باہر بڑی دھواں دھار بارش ہو رہی تھی وہ ہنوز کھڑکی کے شیشے سے چپکا میری طرف گھور رہا تھا۔ بغور دیکھنے پر مجھے اس کے کاندھے سے جھانکتی ہوئی شکاری رائفل کی نال بھی دکھائی دی تھی۔ یہ وہی شکاری تھا جس کی جھلک ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے دیکھی تھی۔

اس لمحے جب دوبارہ بجلی چمکی تو وہ چہرہ غائب ہو چکا تھا۔

پتہ نہیں کون تھا میرے منہ سے بڑبڑاہٹ آمیز جملہ نکلا اور پھر کھڑکی کے قریب آ کر باہر برستے موسم کا نظارہ کرنے لگا اس پراسرار شکاری کے چہرے کے نقوش میرے ذہن میں ثبت ہو چکے تھے پھر اچانک مجھے نیند ستانے لگی اور رات کا وہ پراسرار واقعہ میرے ذہن سے صبح تک محو ہو چکا تھا

☆......☆......☆

اگلے دن ناشتے کے فوراً بعد ہم لوگ آدم خور کی گوشمالی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس ان دیکھے آدم خور نے آس پاس کے علاقے میں کافی دہشت مچا رکھی تھی اور اب تک سو سے زائد معصوم انسانوں کو اپنی مردم خوری کی بھینٹ چڑھا چکا تھا میری جانے کیوں سرشت ایسی تھی کہ مجھے کسی بھی معاملے کا کوئی نہ کوئی پراسرار پہلو کھٹکتا تھا۔ اس سلسلے میں بھی دو پراسرار باتوں نے مجھے کھوا دم

خور میں الجھا سا دیا تھا۔ دوسری رگ پر اسراریت کو ہوا دینے کا باعث بنی تھی۔ اس آدم خور کو آج تک کسی نے دیکھا نہیں تھا اور واقعی یہ ایک حیران کن مسئلہ تھا دوسری بات یہ کہ پر اسرار آدم خور نے اب تک صرف مردوں کو ہی اپنی آتش شکم کا نشانہ بنایا تھا جبکہ ایسے درندے یعنی چیتا شیر گلدار یا تیندوے جب آدم خوری کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ان کی مردم خوری مرد، عورت، حتیٰ کہ بچے بلا تخصیص بھینٹ چڑھنے لگتے ہیں کیونکہ انہیں تو انسانی خون کی لت لگ چکی ہوتی ہے، نا کہ مرد یا عورت کی۔

آدم خور کے ان پر اسرار پہلوؤں پر سوچ و بچار کے دوران مجھے شاہان صاحب اور زاہد پر بھی حیرت تھی کہ انہوں نے آخر ان پہلوؤں کو کیوں نظر انداز کیا تھا تاہم میں نے دوران گفتگو ہی اس بات کا اظہار شاہان صاحب سے کیا۔ اس وقت سہ پہر ہو چلی تھی مگر ہم سب تازہ دم تھے۔ میں نے شاہان صاحب سے جب اس نادیدہ مردم خور کے بارے میں ان دو پر اسرار پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کروائی تو وہ بھیدوں بھری مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے ان میں پائپ دبا کر خصوص لہجے میں بولے

"ڈیئر مدیم عباس، میں خود اس اُدھیڑ بن میں مبتلا ہوں......" لیکن انہوں نے نجانے کیوں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد پر خیال لہجے میں بولے۔ "ویسے آسام کے جنگلوں میں، میں نے ایک ایسا ہی پر اسرار آدم خور شکار کیا تھا۔ وہ آدم خور شیرنی تھی۔ جو صرف بچوں یا عورتوں کا شکار کرتی تھی۔ لیکن اس کی بھی ایک وجہ تھی میں نے شیرنی کو ہلاک کیا تو اس کے اگلے دونوں پنجوں کے ناخن ٹوٹے ہوئے تھے بلکہ اس کے جبڑے کے دو اوپری دانت بھی غائب تھے۔ عورت اور بچے اس کے لیے سہل شکار ہوتے تھے۔ اس میں اس کی معذوری کو دخل تھا مگر جب اس کی دہشت پھیلی تھی تو آس پاس کے بستی والوں نے اپنی آنکھوں سے اس آدم خور شیرنی کو انسانوں پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ مگر اس آدم خور کو تو ابھی تک کوئی انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکی، جبکہ ماکھ بنی کا یہ آدم خور اب تک سو سے زائد معصوم انسانوں کو ہلاک کر چکا ہے۔"

شاہان صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اور پائپ کے گہرے گہرے کش لینے لگے۔ پھر ہماری گفتگو میں حیدر اور زاہد بھی شامل ہو گئے۔ مسز شاہان کو اپنے کمرے میں محدود رہنے کی ہدایت کر دی گئی تھی میں نے اچانک مانا سے پوچھا۔

"مانا یہ بتاؤ اس آدم خور کو کیا واقعی اب تک کسی نے نہیں دیکھا ہے۔"

"نہیں لالہ کسی شخص نے آج تک اس آدم خور کو نہیں دیکھا۔" مانا نے بتایا

"اچھا، یہ بتاؤ۔ آخری بار اس آدم خور نے کس بدنصیب کو نشانہ بنایا اور کب؟" میں نے پوچھا۔

مانا کچھ سوچ کر بولا۔ "ابھی دو دن پہلے کی بات ہے۔ ادھر رمنا گھاٹ پر دلبشماں کا شوہر اس آدم خور کا نشانہ بنا ہے۔"

"تم ہمیں ابھی دلبشماں کے پاس لے چلو۔" میں نے کہا اور وہ فوراً تیار ہو گیا۔ پھر ہم سب اپنی شکاری رائفلوں کے ساتھ مانا کے ساتھ دلبشماں کے گھر کی طرف چل پڑے۔

☆......☆......☆

جنگل بہت گھنا تھا۔ سہ پہر ہوتے ہی رات کا گماں ہونے لگا تھا۔ پرندوں کے چہکار تک معدوم تھی ایک ہول ناک سناٹا تھا۔ جو ہر سو چھایا ہوا تھا۔ جا بجا بانس کے پودے اور چوڑے پتوں والے قد آور درختوں کی بہتات تھی۔ مگر ہم سب اس پر اسرار آدم خور کی سرکوبی کے جوش فراواں میں مبتلا مانا کے پیچھے پیچھے بلا خوف چلے جا رہے تھے۔

دفعتاً میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ پورب کی طرف ساٹھ میٹر کے فاصلے پر مجھے دو گھنی سوئے سے والے جھم جھم اور کہنہ سال برگدوں کے قدرتی سنگم کے عین بلندی پر مچان نما ایک جھونپڑی دکھائی دی تو ایک لمحے کو میرا ذہن چونکا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس عجیب و غریب ساخت کی جھونپڑی کی طرف ضرور دکشاں کشاں

قدم بڑھاتا مگر اس وقت مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی مگر ہم نے چلتے چلتے پھر بھی ماناسے اس ویرانے میں بنی جھونپڑی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

"لالہ جی یہاں رہتا ہے ایک پاگل سا جو کہ خود کو بڑا ماہر شکاری کہتا ہے پر اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں اس کے پاس ایک رائفل ہے، وہ بکنے والی ہے جو اس نے پاگل ہونے کے باوجود اب تک نہیں چلائی۔

میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس مچان نما جھونپڑی سے ایک مجہول سا شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں قدیم ساختہ رائفل دبی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی بری طرح ٹھٹکا۔

یہ وہی پاگل شکاری تھا جسے میں نے گزشتہ دھواں دھار بارش کے شب میں اپنے بنگلے کے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا اور پھر جس طرح اچانک نظر آیا تھا۔ وہ اسی طرح پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا

اب میں ذرا رک کر اس کی طرف بغور دیکھے جا رہا تھا۔ جھکے جھکے کاندھے کھچڑی سے بال اور چہرے پر پراسراریت کے علاوہ اس کی آنکھوں میں عجیب وحشیانہ چمک موجود تھی، جانے کیوں اس کی وضع قطع کو بغور دیکھ کر جسم میں جھرجھری سی پیدا ہو جاتی تھی۔ "چلیں لالہ جی!"

"وہ لوگ آگے نکل گئے ہیں۔" معاماناً نے مجھے ٹھوکا دیا اور میں اس پراسرار اور جنگلی شکاری کی جانب سے نظریں ہٹا کر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک جھونپڑ بستی میں داخل ہو گئے۔ یہ غربت کی ماری بستی معلوم ہو رہی تھی۔ بچے ننگ دھڑنگ ادھر ادھر کھیلتے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔

بہر طور ہم سب رمنا گھاٹ کے قریب واقع بدنصیب رلیشماں کے پاس پہنچے۔ اس بیچاری کی حالت دیکھ کر ہمارا دل بھینچ گیا۔ ہم جھونپڑی کی چوکھٹ پر ہی کھڑے رہ گئے تھے۔ جہاں پردے کے طور پر ایک جھنجھرا ٹاٹ جھول رہا تھا۔

"رلیشماں ذرا باہر آ، صاحب آئے ہیں، کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تم سے۔" اندر سے ایک بچے کو گود میں اٹھائے ہیں پینتیس سالہ گہری رنگت کی ایک عورت برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھیں متورم اور چہرہ گہری اداسی کا غماض تھا۔ اپنی معصومانہ آنکھوں میں حیرت سموئے ہمیں ٹکر ٹکر گھورے جا رہی تھی۔

بدنصیب رلیشماں نے میلے پلو سے اپنا چہرہ پونچھا اور ہماری طرف خاموش نگاہوں سے تکنے لگی تھی، تو میں آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہو کر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

بہن جی، ہمیں آپ کے بچی کا افسوس ہوا۔ جو اللہ کو منظور، ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ ہم اس آدم خور کو ہلاک کرنے ہی اس علاقے میں آئے ہیں۔ کیا تم ہمیں اس واقعہ کی تھوڑی تفصیل بتا سکو گی؟"

اس عورت کی آنکھیں جھلملا سی گئیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا۔ کہ یہ سب بتانے میں اسے گہرے دکھ کی پھر دی گزر دی کوئی تنگی پڑ رہی تھی۔ مگر یہ سب بھی ضروری تھا۔ کم از کم اس آدم خور کا جلد از جلد خاتمہ تو ممکن ہو سکتا تھا تاکہ وہ پھر سب کو اپنے خونی پنجوں کا نشانہ نہ بنا سکے۔

"جی میں گھاٹ پر کپڑے دھو رہی تھی۔" اس نے فسردہ سے انداز میں بتانا شروع کیا، میرا اپنی جنگل میں سرادر صاحب کی بھیڑیں چرانے گیا ہوا تھا۔ وہیں اس آدم خور نے حملہ کر کے بے چی کو۔" اتنا بتاتے ہوئے اس بیچاری کا جی بھر آیا اور وہ پلو منہ میں دبا کر سسکنے لگی۔

"اس آدم خور کو کسی نے دیکھا بھی تھا۔" میں نے ذرا دیر بعد پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔

"میرے بچی کی ادھڑی ہوئی لاش دیکھی تھی۔ پورے گاؤں کے سبھی لوگوں نے یہی کہا کہ میرا بچی اس آدم خور کے خونی پنجوں کا شکار ہوا ہے۔"

"لیکن آس پاس کسی نے اس آدم خور کے پنجوں کے نشان تو دیکھنے کی کوشش کی ہوگی؟" اس بار زاہد نے بدنصیب عورت سے پوچھا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی کہ اچانک پورے گاؤں میں "آدم خور آیا، آدم خور آیا" کا شور مچ گیا۔

"اس شور پر ہم سب بری طرح ٹھٹک گئے۔"

دلبشماں بیچاری دہشت زدہ ہوکر اپنے بچوں کو مرغی کی طرح اپنے پروں میں چھپا کر جھونپڑی کے اندر بھاگ گئی۔

ہم سب ہونقوں کی طرح ہکا بکا ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ پوری آبادی میں ایک غدر سا مچ گیا۔ ایسی بھگدڑ مچ گئی تھی کہ ہر کوئی دہشت زدہ ہوکر اپنے ٹھکانوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

شاہان صاحب، زاہد اور حیدر کے چہروں پر ایک کی چوکنا پن امڈ آیا تھا۔

مگر بے چارہ ماما اس افتاد نا گہانی پر سراسیمہ ہونے لگا تھا مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیسا آدم خور تھا جو یوں روندتا ہوا آبادی میں گھس آیا تھا۔ آثار تو یہی بتا رہے تھے جیسے یہ آدم خور کسی بھیانک بلا کی طرح یہاں آن وارد ہوا تھا۔ بالآخر میں نے ذرا ہمت کرکے قریب سے دوڑتے ہوئے ایک دہشت زدہ شخص کو روکتے ہوئے پوچھا۔

”اے بھائی! کچھ تو بتاؤ، وہ آدم خور ہے کدھر؟“ ہم اسے ابھی ہلاک کر ڈالیں گے۔“

میری بات سن کر اس نے بمشکل ہانپتے ہوئے بتایا کہ ”جنگل کی سمت آدم خور کی جھلک نظر آئی ہے جہاں اس نے ایک آتوائی شخص کا نرخرہ دبوچ لیا ہے بس پھر کیا تھا۔“

ہم سب اپنی اپنی شکاری رائفل اٹھا کر مذکورہ سمت کی طرف دوڑے۔ آدم خور کو دیکھنے کے جوش سے میرے دل و دماغ میں عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی تھی کیونکہ اس آدم خور کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ آدم خور ایک شخص کو بھنبھوڑ کر شکم سیری میں مصروف تھا۔

ہم طوفانی رفتار سے رائفلیں اٹھائے اس مقام کی طرف دوڑ پڑے۔ میرے دل میں اس پراسرار آدم خور کو ہلاک کرنے سے کہیں زیادہ اسے دیکھنے کی خواہش شدت سے ابھری تھی۔

اس پراسرار آدم خور کو نابود کرنے کا سب سے زیادہ جوش شاہان صاحب میں اور دیکھنے کا اشتیاق مجھ میں پایا جاتا تھا۔ وہی سب سے آگے دوڑے تھے۔ اس کے بعد میں تھا اور میرے پیچھے زاہد اور حیدر، وہ بے چارہ ماما تو خوف سے پہلے ہی کہیں شک گیا تھا۔ جائے وقوعہ تک پہنچنے میں بمشکل چند دو منٹ لگے تھے وہ جگہ ایک پہاڑی چشمے کے قریب تھی۔ یہاں قد آدم خودرو جھاڑیوں کے علاوہ خیلا اور ساز کے درختوں کی بہتات تھی۔ میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور دل بے ترتیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ یہی حالت باقی تینوں کی بھی تھی۔ وہاں پہنچ کر ہم چاروں رک گئے تھے اور چوکنا نظروں سے بہتے چشمے کے قدرتی موڑ کی طرف بغور دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے، فضا میں سوائے بہتے چشمے کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ مذکورہ سمت ہمیں کچھ نظر نہیں آیا تو ہم سب جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک کر چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ہمیں آدم خور اپنے شکار سمیت کہیں دکھائی نہیں دیا۔

”کسی نے ہمارے ساتھ کھلواڑ تو نہیں کیا۔“

یہ زاہد تھا۔ اس کی سرگوشی میں دبی ہوئی آواز چند قدم آگے متلاشی نظر دوڑاتے ہوئے شاہان صاحب نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ میں نے اپنی رائفل چوکنا انداز میں سنبھال رکھی تھی اچانک میں نے کرنل شاہان صاحب کو قدرے ٹھٹکتے ہوئے دیکھا، وہ بار بار ہماری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے ہوئے ہمیں ذرا بھی آواز نہ پیدا کرنے کی مسلسل تلقین کر رہے تھے۔

چند لمحوں بعد کرنل شاہان ہمیں اپنی جگہ پر رکے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود آگے سرک گئے۔

”یہ کدھر کو ہولیا!“ اس بار حیدر بھی چپ نہ رہ سکا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تو میں نے جل کر کہا۔

”مجھے کیا معلوم“

لگتا ہے انہوں نے آدم خور کی سانسوں کی بازگشت سن لی ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر میرے جی میں آیا اور میں بھی کرنل شاہان کے عقب میں بڑھنے لگا، میرے پیچھے زاہد اور حیدر نے بھی قدم آگے بڑھا دیے۔

میری چوکنا اور متلاشی نظریں اس سمت میں جم کر رہ گئیں جدھر قد آدم جھاڑیوں کے جھنڈ بکھرے ہوئے

تھے میں نے ٹھٹکتے ہوئے انداز میں آگے بڑھتے ہوئے شاہان صاحب کے متعلق سوچا۔ جو ہمیں یہ بتائے بغیر خاموشی سے نامعلوم مقام کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ”آخر ایسا کیا محسوس ہوا تھا۔“

ابھی میں گھنے جھنڈ سے ذرا فاصلے پر ہی تھا کہ معاً میرے قدم ایک عجیب سی آواز پر رک گئے۔ پہلے تو اس آواز پر ہی میری روح فنا ہوگئی تھی کیونکہ ایک عجیب سی آواز تھی۔

کیونکہ شروع میں یہ آواز ایسی محسوس ہوئی تھی جیسے کوئی خشک پتوں پر چل رہا ہو۔ چرمراتے پتوں کی ہلکی سرسراہٹ آمیز آواز سے میں نے یہی سمجھا تھا کہیں پر اسرار آدم خور میری گھات میں تو نہیں آرہا تھا مگر پھر دوسرے لمحے جب ذرا ٹھہر کر میں نے شکارانہ یکسوئی کے ساتھ اس ہلکی ہلکی ابھرنے والی آواز پر کان دھرے تو مجھے اپنے اس خوفناک خدشے کو رد کرنا پڑا کیونکہ کوئی درندہ میری گھات میں بیٹھا تھا۔

یہ آواز ایک مخصوص تواتر کے ساتھ ابھر رہی تھی۔

غور سے آواز سننے پر ایسا لگا جیسے کوئی درندہ اپنا شکار اپنے آہنی جبڑوں تلے دبا کر کچ کچاتے ہوئے چبا رہا ہو۔

غالباً یہی وہ آواز تھی جسے محسوس کرتے ہوئے شاہان صاحب اپنا نام روشن کرنے کی نیت سے آگے بڑھے تھے۔ ان کی خواہش یقیناً اس طرح ہوگی کہ وہ اس پراسرار ان دیکھے آدم خور کو تن تنہا خود ہلاک کریں۔ مگر یہ خواہش انہیں مہنگی پڑی۔

کیونکہ اسی لمحے اچانک گوشت چبانے کی آتی ہوئی متواتر آواز یک دم رک گئی۔ اور ایک ہلکی سی غراہٹ ابھری تو میری ٹھٹکی ہوئی نظریں ادھر ہی جمی ہوئی تھیں۔ میں اس کشمکش میں مبتلا تھا۔

کہ آگے بڑھوں یا راستہ بدلنے کی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے پیش قدمی کروں۔

اچانک، گولی چلنے کی کان پھاڑ آواز سنائی دی تو میں ٹھٹک کر ذرا جھک گیا۔

میرے عقب میں زاہد اور حیدر تھے۔ جو زمین پر لیٹ گئے تھے۔ تاہم انہوں نے کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اپنی رائفلیں ضرور تان رکھی تھیں۔ اور انہیں ایک دم ریڈی حالت میں کر دیا تھا۔

یہ کرنل شاہان کی پانچ سو بور کا بھاری بھرکم فائر تھا جس کی گولی ایک اچھے خاصے ہاتھی کی کھوپڑی چٹخا دینے کے لئے کافی تھی۔ فائر کے گونج دار دھماکے سے پورا جنگل چھوٹے موٹے چرند پرند کی شور آمیز چہکار سے گونج اٹھا تھا۔

مگر فائر کے اگلے ہی لمحے میرے کانوں سے ایک دھاڑ کی آواز ٹکرائی، اس دھاڑ میں مجھے کسی قسم کی کربناکی کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا تھا ایک ہولناک تصور سے میں کانپ رہا تھا۔

کیا، کرنل کا نشانہ خطا ہوگیا تھا۔ نشانہ خطا جانے کا مطلب شکاری کی واضح موت تھی۔ اس مخدوش صورتحال کے زیر اثر اچانک میں نے اپنے اندر ایک انوکھا جذبہ محسوس کیا۔ ویسا ہی جذبہ...... جیسا کچھ عرصہ پہلے شاہد صاحب کو آدم خور کے چنگل سے بچاتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

بس پھر کیا تھا۔ میں نے رائفل تانی اور اندھا دھند دھینگروں کی طرف بڑھا۔

اسی لمحے پھر دھماکہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ایک ہولناک انسانی چیخ سے میں خود دہل کر رہ گیا، یہ چیخ کرنل کی تھی!

☆......☆......☆

اگلے ہی لمحے کچھ ایسی غراہٹ آمیز اور انسانی کراہوں کی ملی جلی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ جیسے کوئی درندہ اور انسان آپس میں گتھم گتھا ہوں، میں نے چھلانگ لگا کر جھاڑیوں کو پار کیا تو سامنے نظر پڑتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

ایک لمبا چوڑا اگلدار جو کرنل کے ساتھ گتھم گتھا تھا اور کرنل کو پھاڑ کھانے کے چکر میں تھا۔ کرنل خود کو اس کے خوفناک دانت، تیز نوکیلے پنجوں سے بچانے کی جان توڑ کوشش میں مصروف تھے۔ اس کوشش میں۔ ان کا

لباس، جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور پھٹے ہوئے گوشوں سے خون کے سرخ سرخ دھبے بھی واضح نظر آ رہے تھے میں بھی جانتا تھا۔ کرنل مزید زیادہ دیر تک اس آدم خور اور غیر معمولی جانور بجسم قوی ہیکل گلدار کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اور جلد ہی اس کی خونخواری کا شکار ہو جائیں گے۔ لیکن یہ صورت حال ایسی تھی کہ پائے رفتن نہ جائے ماندن، والی بات صادق آ رہی تھی۔

ایسے میں اچانک میری چشم تصور میں کرنل کی خوش اور دلکش بیوی کا چہرہ رقصاں ہو گیا اور جو بنگلے میں کرنل کے انتظار میں بیٹھی ہو گی تب پھر اچانک میں نے اللہ جل شانہ کا نام لے کر گلدار کی توجہ ہٹانے کے لیے پہلے ایک ہوائی فائر کیا۔ میری خوش کن امید توقع کے عین مطابق گلدار نے فوراً میری طرف خونخوار آنکھوں سے گھورتے ہوئے دیکھا اور بڑے خوفناک انداز میں غرایا۔ مگر اس نے ابھی تک اپنے اگلے دونوں پنجوں میں کرنل کو دبوچ رکھا تھا۔

کرنل کے حلق سے اب گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہو رہی تھی۔ اس لیے جب گلدار مجھ پر حملہ کرنے نہ کرنے کی کوشش میں مبتلا تھا تو ایسے میں، میں نے اس کی پیٹھ کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ گلدار کی پشت والا حصہ ایسی حالت میں تھا اگر خدانخواستہ میرا نشانہ خطا بھی چلا جاتا تو گولی کرنل کے جسم میں پیوست ہونے کی بجائے زمین میں دھنس جاتی اگرچہ میرے محتاط اندازے کے مطابق نشانہ خطا جانے کا امکان کم ہی تھا میرا اور اس گلدار آدم خور کا درمیانی فاصلہ صرف پندرہ سولہ گز تھا۔

بہر طور میری ایکسپریس رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ گولی خاطر خواہ نشانے پر لگی۔ گولی کھا کر گلدار تیز غراہٹ کے ساتھ اچھلا۔ اس اثناء میں کرنل نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین پر لیٹے لیٹے ہی لوٹ لگائی اور گلدار کے حلقۂ گرفت سے کافی دور نکل گئے۔

گلدار زخمی حالت میں جیسے ہی زمین پر آیا۔ میں نے دوبارہ اس کی پیشانی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ نشانہ محض اس حد تک خطا ہو گیا کہ اس کی پیشانی پر گولی لگنے کے بجائے اگلی دونوں ٹانگوں کے درمیان جا لگی اور

کنواں

ایک کتا کنواں میں گر گیا۔ سب گاؤں والے بھاگے بھاگے ایک سیانے کے پاس گئے اس سے پوچھا کہ کتا کنویں میں گر گیا ہے۔ اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں 100 بالٹی پانی کی نکال دو۔" سب نے مل کر 100 بالٹی پانی کی نکال دی۔ مگر کچھ دنوں بعد پانی میں بدبو آنے لگی تو گاؤں والے دوسرے سیانے کے پاس گئے اس نے بھی کہا۔

"200 بالٹی پانی کی نکال دو۔" انہوں نے 200 بالٹی پانی کی نکال دی۔ مگر بدبو پھر بھی ختم نہ ہوئی۔

پھر گاؤں والے تیسرے سیانے کے پاس گئے اس کو سارا ماجرا سنایا پھر وہ بولا۔

"ارے بیوقوفوں پہلے کتے کو تو کنویں سے باہر نکالو۔"

(سحرش سہیل۔ کراچی)

اس بار وہ کوئی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

مبارک ہو ننھے عباس صاحب بڑا پالا مارا ہے،، میرے عقب سے حیدر اور زاہد نے کھلکھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

مگر میں فوراً کرنل کی طرف بڑھا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے، بلاشبہ وہ بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے بال بال موت کے پنجے سے بچے تھے، انہیں معمولی زخم آئے تھے، میں نے ان کے چہرے پر عجیب سی مایوسی کی جھلک دیکھی۔

☆......☆......☆

"کیسے ہیں کرنل صاحب زیادہ گھائل تو نہیں ہوئے؟" میں نے قریب پہنچ کر ازراہ ہمدردی پوچھا تو وہ چہرے پر ممنونیت کے آثار ظاری کرتے ہوئے بولے۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اگر تم نہیں آتے تو آج اس گلدار نے میرا کام تمام کر دیا ہوتا۔"

"زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے سر۔" اویدوالا

ہی کسی انسان کو دوسرے کے لئے نجات کا وسیلہ بناتا ہے۔" میں نے کسر نفسی سے کہا۔ تاہم میں نے محسوس کیا ان کے چہرے پر کسی تکلیف کے آثار کی بجائے عجیب سی تھی۔

میرا رواں رواں خوشی سے جھوم رہا تھا کہ میں نے اتنے بڑے آدم خور کا بالآخر خاتمہ کر ڈالا تھا جس نے پورے علاقے میں ایک عرصے سے وحشت مچا رکھی تھی لیکن مجھے حیرت ہوئی تھی کہ زاہد اور حیدر کی طرح کرنل نے مجھے اب تک میرے ہاتھوں آدم خور کے ہلاک ہونے کی مبارکباد نہیں دی تھی۔ کیا وہ اتنا ہی تنگ نظر تھے اور جلن ہو رہی تھی کہ یہ آدم خور ان کے ہاتھوں کی بجائے میرے ہاتھوں انجام کو پہنچا میں نے سوچا۔

اگلے ہی لمحے کرنل نے متاسفانہ لہجے میں کہا

"ویری بیڈ۔ آدم خور نکل گیا"

کرنل کی بات سن کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ زاہد اور حیدر نے بھی کرنل کی بات پر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ پھر زاہد سے نہ رہا گیا اور وہ گلدار کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا

"کرنل صاحب۔ آدم خور کو تو اپنے ندیم صاحب نے ختم کر ڈالا۔ آپ اب کس آدم خور کی بات کر رہے ہیں؟"

اس کی بات سن کر کرنل کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ پھیل گئی۔ "اصل آدم خور نکل بھاگا ہے۔" کرنل نے بڑے سکون کے ساتھ کہا۔ "میں نے پہلے اس پر ہی گولی چلائی تھی مگر اس سے پہلے جانے یہ کم بخت گلدار کدھر سے آن ٹپکا۔"

"مگر کرنل صاحب۔ اس کا ثبوت کیا ہے کہ اصل آدم خور وہی تھا۔ جو آپ کی پہلی گولی کا نشانہ بنے بغیر بھاگ نکلا اور یہ گلدار۔" میں نے سوالیہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔ حقیقت یہ تھی کہ کرنل کی بات نے مجھے مایوس کر ڈالا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ تمہیں اس کا ثبوت دیتا ہوں ندیم عباس۔" کرنل نے پر اعتماد لہجے میں کہا اور پھر اپنے زخموں پر ہاتھ رکھتے ہوئے چند قدم بڑھ کر تاڑ کے جھنڈ کے پاس پہنچے تو ایک دم میں دہل کر رہ گیا۔ سامنے جھاڑیوں میں کسی بدنصیب انسان کی آدھ کھائی لاش کی جھلک نظر آئی۔ میں ناک پر رومال رکھ کر آگے بڑھا۔ پھر جھک کر آدم خور کے پیروں کے نشانات کے ساتھ چند قدم آگے بڑھا اور پھر ایک طویل گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کرنل نے غلط نہیں کہا تھا

بہر طور ہم نے کرنل کی زخمی حالت کے پیش نظر آدم خور کا تعاقب ملتوی کر دیا اور واپس بنگلے میں آ گئے۔

کرنل اب روبہ صحت تھے۔ انہوں نے میرے استفسار پر بتایا تھا کہ "وہ اس پراسرار آدم خور کی جھلک دیکھ چکے تھے۔ وہ ایک انتہائی خوفناک سیاہ رنگ کا شیر تھا۔"

جس کی چمکدار آنکھوں میں بلا کی درندگی اور جسم میں عجیب پراسراریت محسوس ہوتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل تب بھی اس پراسرار وحشت ناک آدم خور کو دیکھے بغیر ماننے نہیں رہا تھا۔

یہ دو دن بعد کا ذکر ہے۔

موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی مگر اس کا زور جلد ہی ٹوٹ گیا۔ جنگل کے سارے درخت دھل کر نکھر گئے تھے۔ سرخ اور منقش کلغیوں والے جنگلی مرغوں کی ککڑوں کوں کی آواز سے جنگل میں خوش الحانی سی بکھری ہوئی تھی اس دن ہم نے آدم خور کی سرکوبی کے لئے اپنی مہم کا ارادہ ترک کر ڈالا اور بنگلے میں ہی محبوس ہو کر رہ گئے۔

رات کے بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ رات کا کھانا اکٹھے کھانے کے بعد گھنٹہ بھر باتیں کرنے اور چائے پیتے رہنے کے بعد کرنل اپنا پائپ سلگاتے ہوئے گڈ نائٹ کہہ کر اپنی بیگم کے ساتھ بیڈ روم میں چلے گئے۔

پھر زاہد اور حیدر بھی جمائیاں لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ناچار میں بھی اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

نیند میری آنکھوں سے ابھی کوسوں دور تھی۔ میں بیڈ پر اپنے دونوں ہاتھوں کا سرہانہ بنائے نیم دراز تھا۔ میری نظروں کے عین سامنے کھڑکی تھی۔ جو باہر جنگل میں کھلتی تھی۔ اس پر باہر سے آہنی گرل اور اندر شیشے لگے

ہوئے تھے یہ علاقہ بادلی تھا۔ ہر سے آسمان پر بادل چھائے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ چودھویں کا پورا چاند بھی بدلیوں کے پیچھے ایک ذرا سی روشنی کی جھلک دکھا کر دوبارہ چھپ جاتا۔

میں آج والے واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ پراسرار آدم خود ہمارے ہاتھوں صاف بچ نکلا تھا مزید برآں کر کرنل بھی خطرناک درندے گلدار کے خونی پنجوں سے بال بال بچے تھے۔ تاہم ہماری یہ کامیابی کیا کم تھی کہ اب وہ پراسرار آدم خود ہماری نظروں میں غلطاں تھا کہ اچانک میں نے غیر ارادی طور پر کھڑکی سے باہر تاریکی میں ایک سایہ دیکھا۔ یہ کسی انسان کا سایہ تھا۔ میں چونک کر اٹھا۔ کھڑکی تک آیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑکی کا ایک پٹ کھولا۔ ذرا باہر سر نکالا۔ مرطوب ہوا کا ٹھنڈا دینے والا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تو نجانے کیوں مجھے جھرجھری سی آگئی۔

یہ سایہ اب بھی مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے خدوخال کچھ واضح ہونے لگے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت پورا چاند بادل کے ایک ٹکڑے سے جھانکا تھا۔

☆......☆......☆

میں اسے پہچان کر بری طرح ٹھٹکا تھا۔ وہ پراسرار اور مجہول سا جنگلی شکاری تھا۔ سر اور داڑھی کے بال کھچڑی، پرانا خاکی نیکر اور اسی رنگ کی قمیض پہنے، گھٹنی سفید بندوق تھی۔ وہ اب بنگلے کے بیرونی دروازے پر کھڑا دستک دینے کے لئے پر تول رہا تھا۔ میرے جی میں جانے کیا آئی کہ میں جلدی سے اپنے کمرے سے نکلا بیرونی دروازہ کھولنے کے لئے لپکا۔ تاکہ اس جنگلی بڈھے شکاری کو نہ صرف قریب سے دیکھوں۔ بلکہ اس کے آنے کا مقصد بھی دریافت کروں۔ یہ سوچ کر میں نے جلدی سے بے آواز انداز میں دروازہ کھول دیا۔

اگلے ہی لمحے سامنے نظر پڑتے ہی میں نے اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ ایک عجیب خوف کی لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ کافی دیر تک سامنے اندھیروں میں آنکھیں پھاڑے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے اب شاید حیرت کا سامنا تھا۔

''کدھر گیا یہ؟'' میں نے حیرت سے زیر لب خود کلامی کی۔ مجھے کمرے سے بیرونی دروازے تک آنے میں مشکل سے دس سیکنڈ بھی نہیں لگے ہوں گے، اتنے کم وقفے میں یہ بوڑھا جنگلی کدھر چلا گیا تھا۔

اس واقعہ نے میری رگ تجسس کو اور مہمیز کیا اور میں اسے تلاش کرنے کا پکا تہیہ کر کے باہر نکلا۔ اگلے آٹھ دس سیکنڈ میں بنگلے سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے ٹارچ اور اپنی ایکسپریس رائفل اٹھالی تھی۔ باہر نکل کر میں نے دائیں بائیں تاریکی میں ٹارچ روشن کر کے اس کے دائرے کو چاروں طرف حرکت دی اور دور نزدیک، مگر سوائے گھنے چھتنار درختوں اور قدآدم خودرو جھاڑیوں کے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ البتہ ان جھاڑیوں میں چھوٹے موٹے ڈرے سہمے جانوروں کی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی ہوئی ضرور دکھائی دی تھیں، میں نے بے اختیار نیچے دیکھا تو جیسے میری دلی مراد بر آئی۔

زمین پر پراسرار شکاری کے بڑے بڑے جوتوں کے نشانات موجود تھے۔ اب میرے وہم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اس جنگلی شکاری کے اچانک نظر آکر غائب ہونے پر تھوڑی دیر پہلے میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا پراسرار شکاری تھوڑی دیر پہلے ادھر موجود تھا اور بیرونی دروازے تک بھی آیا تھا مگر پھر اچانک ہی ایک دم کہاں غائب ہو گیا تھا؟ یہ وہ پراسرار سوال تھا جو میرے اندر کی ہیبت ناک کو ہی نہیں بلکہ میرے فطری تجسس کو بھی بڑھانے کا باعث بن رہا تھا، بہر طور میں نے قدموں کے نشانات کے ذریعے اس شکاری کا تعاقب کرنے کے ارادے سے قدم آگے بڑھادیئے۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔

پورا جنگل جیسے بھیدوں بھری خاموشی میں غرق تھا، رات کے اس آخری پہر میں، میرا یوں ایک پراسرار شخص کا تعاقب کرنا یقیناً خطرے سے خالی نہ تھا۔ یہ جنگل ہر قسم کے درندوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہی نہیں یہاں تک کہ زہریلے سانپوں کے علاوہ بعض چھوٹے چھوٹے موٹے

کیڑوں اور حشرات الارض بھی کم خطرناک نہ تھے، اگر
چہ میں نے پیروں میں لانگ بوٹ چڑھا رکھے تھے لیکن
پھر بھی مجھے ان سب کا خطرہ تھا۔ مگر میں بھی ہٹ کا پکا تھا
اس پراسرار شکاری کا سراغ لگانا چاہتا تھا لہٰذا قدموں کے
نشانات پر ٹارچ کی روشنی کے زریعے آگے بڑھنے لگا۔

اس وقت مجھے شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب
میں نے دیکھا کہ پیروں کے نشانات بنگلے کے چاروں طر
ف دو چکر مکمل کرنے کے بعد اندر تاریک جنگل کی طرف
ہو لئے تھے جس کا مطلب تھا اس پراسرار شکاری نے بنگلے
کے گرد دو مرتبہ چکر لگایا تھا۔ اور پھر خاموشی سے چلا گیا تھا۔

میں دل مضبوط کرکے ہیبت ناک گھنے تاریک
جنگل میں داخل ہو چکا تھا۔ کافی دور چلتے رہنے کے بعد
اچانک مجھے سامنے مدہم روشنی میں اس بوڑھے شکاری کی
پراسرار آماجگاہ دکھائی دی۔ جو برگد کے دو فین گھنے اور
وسیع درختوں کے قدرتی طلاب سے بنے خاصے وسیع جھنڈ
پر مچان نما جھونپڑی بنی ہوئی تھی، آسمان پر اب آوارہ
بادلوں کے ٹکڑے دھیرے دھیرے سرکنے لگے تھے اور
آسمان قدرے صاف اور روشن نظر آنے لگا تھا۔ پورن
ماشی کے پورے چاند کی روشنی جنگل کے گھنے پیڑوں
سے چھن کر برسات کی طرح اس جھونپڑی پر پڑ رہی تھی
میں قریب پہنچ کر ایک درخت کے تنے کی آڑ میں دبک
کر کھڑا ہو گیا اور سامنے نظریں جما دیں۔ سرکنڈوں کی یہ
عجیب وضع کی جھونپڑی ویران تھی۔ صرف ایک شاخ سے
بندھی ہوئی رسی کی سیڑھیاں نیچے جھول رہی تھیں۔

اچانک میں نے کہیں قریب ہی ایک غراہٹ سنی
۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا کہ میری نظر لگ بھگ
چھ فٹ۔ کے ایک سیاہ شیر پر پڑی، وہ ڈھائی فٹ کے قر
یب چوڑا تھا اور اس کا سارا جسم کوے کی طرح سیاہ تھا۔ یہ
چیتا اور شیر کی بیچ کی نسل کا بڑا خطرناک اور خونخوار درندہ
تھا اس کی آنکھوں میں غضب ناک چمک تھی اس کا رخ
جھونپڑی کی طرف تھا۔

وہ درندہ میری طرف متوجہ نہ تھا۔ لیکن اس کی
ہیبت ناک وحشت اس قدر مجھ پر طاری ہونے لگی کہ میر
ی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں اور پورے
وجود میں سنسنی سی لرزش طاری ہوتی تھی۔ تاہم اس
درندے کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلا تھا۔ وہ پر
اسرار آدم خور کالا شیر تھا۔ جس نے آس پاس کی آبادی
میں دہشت مچا رکھی تھی اور نجانے کتنے ہی معصوم انسانوں
کو اپنی بھوک کی بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ میں اسے کبھی دیکھ
تو نہ سکا البتہ آج کرنل نے اسے دیکھا تھا اور مجھے آگاہ کیا
تھا ممکن ہے اس نسل کے اور بھی شیر یہاں موجود ہوں۔

بہرطور اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ وہی آدم خور تھا یا کوئی
دوسرا عام درندہ تھا میں نے سوچا جھونپڑی میں موجود اس
بوڑھے شکاری کو ہڑپ نہ کر جائے اگرچہ مجھے اس کا علم نہ
تھا کہ وہ شکاری اوپر موجود بھی تھا یا نہیں پھر ٹھیک اسی
وقت میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا، کیونکہ اگلے ہی
لمحے اس کالے شیر نے ایک جست بھری اور جنگلی بلی کی
طرح اوپر چڑھ گیا۔ میں دل میں یہی دعا مانگنے لگا کہ خدا
کرے وہ شکاری اوپر جھونپڑی میں موجود نہ ہو، ورنہ وہ
اس آدم خور کا آسانی سے شکار ہو سکتا تھا اور میرے دل
میں بھی جوش کی تمتماہٹ ابھرنے لگی اور میں نے آؤ
دیکھا نہ تاؤ، اپنی ایکسپریس رائفل سنبھالی اور درخت کی
اوٹ سے نکل کر جھونپڑی کی طرف دوڑا، میں نے سر اٹھا
کر دیکھا، وہ کالا شیر اب جھونپڑی کے اندر گھس گیا تھا مگر
میں ناامید نہ تھا اور میں نے کالے شیر کو بھگانے کی خاطر
ایکسپریس کے ہوا میں زوردار فائر کر ڈالے۔

رات کے سناٹے میں پورے جنگل کی گہری
سکوت پر جیسے خنجر چل گیا۔

مگر دوسرے ہی لمحے میرے سر پر حیرتوں کے
پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

دھماکوں کی آوازیں سن کر اچانک جھونپڑی کے
اندر سے وہ بوڑھا مجہول شکاری نکلا تھا اور خاصے غصے کے
سا انداز میں اطراف میں نظر دوڑا رہا تھا۔ اس کی حرکات و
سکنات سے کچھ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کے آرام
میں خلل پڑا ہو، میں اچنبھے کی سی حالت میں اس کی طرف
تکے جا رہا تھا اور ورطہ حیرت میں بتلا تھا کہ یہ بوڑھا تو

اتنے آرام سے کھڑا نظر آرہا ہے جیسے اسے معلوم نہیں کہ اس جھونپڑی کے اندر ایک خطرناک آدم خور آ گیا تھا اشنائے راہ اس کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ وہ برہمی کے انداز میں اوپر سے ہی چلایا۔

"اے کون ہو تم۔ یہ فائر کیوں کیا تم نے؟؟" اس کے ہاتھ میں سکے والی قدیم ساختہ بندوق بھی نظر آرہی تھی

مجھے اس کے لہجے پر غصہ آیا مگر قدرے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ "میں نے ابھی ابھی ایک کالا شیر تمہاری جھونپڑی میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ یہ وہی آدم خور ہے جس نے اب تک تین سو سے زیادہ معصوم انسانوں کو ہڑپ کرلیا ہے۔"

میری بات سن کر وہ قدرے ٹھٹکا پھر عجیب بے ہنگم انداز میں قہقہہ بلند کیا اور قدرے مذاق اڑانے والے انداز میں چلا کر بولا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں زندہ و سلامت تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔"

"نہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے تمہاری جھونپڑی کے اندر داخل ہوتے دیکھا ہے۔" میں نے پریقین لہجے میں کہا۔ "اچھا اچھا، میں ابھی اندر دیکھ لیتا ہوں، ویسے تمہارا بہت بہت شکریہ۔" اس نے کہا۔

اس نے اپنا ایک ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور اندر چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ برآمد ہوا۔ میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوتی جارہی تھیں اور میں کشمکش و پیچ اور حیرت میں مبتلا تھا کہ آخر وہ آدم خور خطرناک شیر کدھر چلا گیا۔

"یہاں میرے سوا اور کوئی نہیں ہے تم جاؤ۔ ویسے تمہارا ایک بار پھر شکریہ۔" اس بوڑھے نے اس اپنی جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا اور دوبارہ اندر چلا گیا میں چند لمحے تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑا رہنے کے بعد واپس بنگلے کی طرف ہولیا۔

یہ کیسا معمہ تھا اپنے بنگلے میں پہنچ کر جب میں بیڈ پر دراز ہوا تو میرا پورا وجود مجسم سوالیہ نشان تھا۔

میں کیسے اس بات کو جھٹلا سکتا تھا جبکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس آدم خور کو جھونپڑی کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کہیں یہ بوڑھا جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا۔

ایکا یکی میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا کہ "وہ آدم خور اس جنگلی بوڑھے کا پالتو ہوگا۔"

اگلے دن ناشتے کی میز پر میں نے جب اپنے تینوں ساتھی کرنل شاہان، زاہد اور حیدر کو شب گزشتہ سے متعلق اپنی پراسرار مہم کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا تو کرنل شاہان بری طرح چونکے تھے جبکہ میری کہانی پر زاہد نے فوراً اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے ہو نہ ہو، اس آدم خور درندے کا اس بوڑھے سے ضرور کوئی تعلق ہے۔ سب نے زاہد کی بات سے اتفاق کیا مگر کرنل کے چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس لغو بات پر بالکل یقین نہ ہو حقیقت بھی یہی نظر آرہی تھی ایک درندہ اور وہ بھی جسے انسانی خون کی عادت پڑ چکی ہو۔ بھلا کہاں ایک انسان کا دوست یا پالتو ہوسکتا ہے۔ کرنل نے اگلے ہی لمحے فوراً زاہد اور حیدر کی مضحکہ خیز باتوں کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ "نو، نیور، خواہ مخواہ سیدھے سادھے واقعے کو پراسرار بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ رات کے وقت ایسے ماحول میں ندیم عباس کو ضرور وہم ہوا ہے۔"

"نہیں شاہان صاحب۔" میں نے فوراً کرنل کی بات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس واقعے کا بالکل اس طرح ہی یقین ہے جس طرح ہر رات کے بعد صبح کا یقین، میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس آدم خور کو اس بوڑھے کی جھونپڑی کی طرف زقند بھرتے اور اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔" میری پریقین گفتگو پل بھر کو سب کے چہروں پر خاموشی چھا گئی۔ اور پھر دوبارہ اس موضوع پر گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کرنل زاہد اور حیدر اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے، ناشتے کے بعد ہم نے پھر جنگل کا قصد کیا۔ اس بار ہم نے اپنی اس شکاری مہم کو حتمی نتیجے پر پہنچانا تھا اس لئے کیمپنگ کا سامان بھی ہم نے لے لیا تھا۔ دو ملازم جن

میں ایک ماتا بھی تھا کے ہمراہ جانب مہم روانہ ہوئے۔

ہم نے سب سے پہلے اس آدم خور کے تعاقب میں بوڑھے شکاری کے برگد والی جھونپڑی اور آس پاس کے علاقے کی طرف رخ کیا۔ اس بار جانے کیوں ہمارے چہروں پر غیر معمولی خاموشی اور سناٹا کی کیفیات طاری تھیں۔ دل میں نجانے کیسی بے چینی نے گھر کیا ہوا تھا۔ ایک نامعلوم سا خوف دل و دماغ میں کچھ اس طور طاری تھا جیسے آج کوئی بہت بڑا واقعہ پیش آنے والا تھا۔ یہ شاید اس لئے تھا کہ ہم نے آج اپنی مہم کو آخری شکل دینے کا تہیہ کر رکھا تھا جب تک اس آدم خور کو نابود نہ کر ڈالیں۔ واپس نہیں لوٹیں گے۔ موسم خوشگوار تھا مارچ کی دھوپ چھن کر درختوں سے کرنوں کی صورت جھاڑیوں اور جنگلی پودوں پر روشنی بکھیر رہی تھی ہمارا رخ برگد والی جھونپڑی کی طرف تھا۔ آج ہمارا ارادہ اس پر اسرار شکاری سے تفصیلی بات کرنے کا تھا جس کا ذمہ ظاہر ہے مجھے ہی سونپا گیا تھا۔

ہم جھونپڑی کے قریب پہنچ کر اوپر تکنے لگے۔ وہاں آس پاس ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ اوپر جھونپڑی میں وہ بوڑھا موجود بھی تھا یا نہیں۔ بالآخر اسے پکارنے کا فریضہ ماتا نے سرانجام دیا اور آگے چند قدم بڑھا کر اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بناتے ہوئے اس نے آواز لگائی۔

"بابا جی۔" دو تین بار پکارنے کے باوجود جھونپڑی میں سناٹا طاری رہا تو ہم بھی سمجھے کہ وہاں کوئی نہیں۔ لہٰذا ہم ناکام واپس پلٹ کر آگے ہو لئے۔ ابھی ہم بمشکل چند فرلانگ ہی چلے ہوں گے کہ اچانک ہمارے عقب سے غراہٹ سی ابھری۔ ہمارے قدم ٹھٹک کر رک گئے اور دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ ہمارے پلٹنے سے سرسراہٹ ابھر رہی تھی جس سمت میں ابھی تک ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی دبے پاؤں خشک پتوں پر چلتا ہوا ہمارے تعاقب میں آ رہا ہو۔ یہ وہی راستہ تھا جو اس بوڑھے کی برگد والی جھونپڑی کی طرف جاتا تھا ہم چاروں ٹھٹک کر رک چکے تھے۔ پھر فوراً ہی ممکنہ خطرے کے پیش نظر ہم نے اپنی اپنی رائفلوں کے سیفٹی کیچ چڑھائے اور انہیں ایک دم ریڈی پوزیشن میں لے آئے۔ ابھی ہمیں ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک قریب ہی جھاڑیوں سے آدم خور سیاہ شیر نمودار ہوا۔

ایک لمحے کو تو ہم اس کی دہشت سے بت بنے رہ گئے مگر دوسرے ہی لمحے کرنل اور میں نے اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے رائفل والا ہاتھ بلند کیا۔ اسی لمحے سیاہ آدم خور نے زاہد پر جھپٹنے کے لئے چھلانگ لگائی اور ٹھیک اسی وقت میری اور کرنل کی شکاری رائفلوں نے دو شعلے اگلے۔ فضا میں دو دھماکے ہوئے۔ مگر ہمیں آدم خور کی دھاڑ کی بجائے ایک لرزہ خیز انسانی چیخ سنائی دی۔ یہ زاہد کی چیخ تھی۔ جس کا مطلب تھا ہمارے نشانے خطا گئے تھے مگر آدم خور کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔

اس نے زاہد کا نرخرہ اپنے دانتوں تلے بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ حیدر اپنی جگہ گنگ ہو کر رہ گیا۔ باقی دو ملازم درندے کی دہشت سے زمین پر بیٹھ گئے تھے جبکہ ادھر میں نے اور کرنل نے آن واحد میں اپنی رائفلیں ایک بار پھر سیدھی کیں۔

اسی دوران وہ آدم خور غراتا ہوا میری طرف پلٹا، اس نے مجھ پر جست لگائی۔

میں نے اس کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ گولی آدم خور کے کہیں لگی تھی۔ جس کا ثبوت اس کے جست بھرنے کے دوران ہی فضا میں سنائی دینے والی خوفناک دھاڑ تھی۔

میں بھی فائر کرتے ہی خود کو شیر کے خونی جبڑوں سے بچانے کے لئے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

آدم خور اپنی ہی جھونک میں دل ہلا دینے والی دھاڑ مارتا ہوا میرے سر کے اوپر سے گزرتا چلا گیا اور پھر دوبارہ نمودار نہ ہوا۔ میں عالم جنون میں اٹھا، کرنل اور حیدر گھاس پر زخمی پڑے کراہتے ہوئے زاہد کو سنبھالنے کے لئے لپکے۔ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آدم خور کے تعاقب میں چلا۔ میرا رخ ان گھنی جھاڑیوں کی طرف تھا جدھر وہ آدم خور غائب ہوا تھا۔

میرے پیچھے بے چارے زاہد کا کیا حشر ہوا اس کا مجھے اندازہ تھا۔ اسے سنبھالنے کے لئے کرنل اور حیدر کافی

تھے میں رنج کے احساس کو دباتے ہوئے ایک جوش کی کیفیت لئے بجلی کی سرعت کے ساتھ آدم خور کے پیچھے بھاگا تھا اور آج کسی بھی صورت میں اس موذی کا قلع قمع کرنے کا میں اپنے دل میں پکا عزم کر چکا تھا۔ لہٰذا میرے قدم کشاں کشاں اس آدم خور کے نشانات پر آگے ہی آگے بڑھتے جارہے تھے۔ گھاس اور جنگلی پودوں پر تازہ گاڑھے خون کے نشانات بھی کہیں کہیں مجھے نظر آنے لگے تھے۔

جانے کیوں مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ اس آدم خور نے برگد والی جھونپڑی کی طرف رخ کیا ہوگا۔ مجھے ایسا لگتا تھا اس پراسرار بوڑھے شکاری کا تعلق اس شیر سے تھا۔ وہ مجھے اس کا پالتو جانور ہی محسوس ہوتا تھا مگر اس میں ایک ابہام بھی تھا کہ بھلا ایک ایسا درندہ جسے انسانی خون کی چاٹ لگ چکی ہو وہ بھلا کیونکر انسان کا پالتو جانور ہو سکتا تھا۔

تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے میں یہ سب سوچ رہا تھا اور میرے دل کی دھڑکنیں کنپٹیوں میں گونجتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھولی ہوئی سانس اور چہرے پر جوش آمیز تمتماہٹ لئے جب میں اس برگد والی جھونپڑی کے قریب پہنچا تو قدرے ٹھٹک کر رک گیا۔ اس آدم خور شیر کے پیروں اور اس کے زخم سے ٹپکنے والے خون کے قطروں کے نشانات سامنے جھونپڑی والے درخت کی طرف جا کر معدوم ہو رہے تھے۔ ایکا ایکی میرے پورے وجود میں اب جوش کے ساتھ نامعلوم خوف کی سی لہر دوڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا وہ آدم خور اوپر جھونپڑی کے اندر موجود تھا، آج میں نے اس پراسراریت کا پردہ چاک کرنے کا پکا تہیہ کر رکھا تھا، اسی لئے میں نے خاموشی سے درخت پر چڑھنے کا ارادہ کیا اور رائفل کو کاندھے پر لٹکا کر ابھی اوپر چڑھنے کے لئے برگد کے موٹے تنے کو چھوا ہی تھا کہ دفعتاً ایک آواز پر میں ٹھٹک کر اپنی جگہ پر جم گیا اور آواز کی سمت سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ آواز اس پراسرار بوڑھے شکاری کی تھی جو نجانے کس وقت اچانک جھونپڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

”اے کیا چاہتے ہو۔ تم کیوں اوپر آ رہے ہو؟“

اس کی بات سن کر مجھے اس بوڑھے کی مکاری پر غصہ تو بہت آیا اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ ایک ایسے خطرناک آدم خور کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھا جس نے کئی معصوم افراد کو موت کے گھاٹ اتار رکھا تھا۔ دوسرے اس بار اس آدم خور کی زد میں میرا دوست زاہد بھی آ گیا تھا۔ اب جانے اس بے چارے کا کیا حال تھا۔

میں نے اس مکار بوڑھے کی طرف دیکھا تاکہ اسے سخت جواب سے نوازوں لیکن جیسے ہی میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو بری طرح چونک گیا۔ میں نے دیکھا اس کا ایک کندھا بری طرح زخمی تھا اور وہاں سے مسلسل خون ٹپک رہا تھا جسے روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اس پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا زخم تازہ تھا۔

اچانک ایک سنسنی خیز تصور سے میں سرتاپا لرز اٹھا تاہم میں نے جلد اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا اور درشت لہجے میں اس سے بولا۔ ”وہ تمہارا پالتو شیر میرے دوست کو زخمی کر کے یہاں آیا ہے میں اسے ہر قیمت پر ہلاک کر دوں گا۔ تم نیچے اترو۔“ میری بات پر اس بوڑھے شکاری کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا اس کے جھریوں زدہ چہرے پر بڑی سنسنی خیز بات کی ”جاؤ یہاں سے، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے بھلا ایک آدم خور چیتے کا یہاں کیا کام؟“

”میں سمجھ گیا کہ یہ بوڑھا میرے ساتھ مکر کر رہا ہے۔“ میں نے غصے سے دھاڑ کر کہا۔

”بڈھے۔ میں اس بار تیرے جھانسے میں نہیں آؤں گا، تجھے اپنی جھونپڑی کی تلاشی دینا ہوگی۔“

”اچھا..... اچھا..... آجاؤ پھر اوپر.....“ اس بار وہ بیزاری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

مجھے یقین تھا کہ اس کا وہ پالتو آدم خور اوپر ہی موجود ہوگا اس بار میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جھونپڑی کی تلاشی لے کر ہی رہوں گا۔ حالانکہ پہلے ہی بوڑھے کی بات پر اعتبار کر کے لوٹ گیا تھا بہرطور میں اوپر چڑھا اور مچان نما تختے پر بوڑھے کے بالمقابل کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں بغور جھانکنے لگا۔ مجھے جانے کیوں اس کی

آنکھوں میں عجیب سا جالا نظر آیا۔ ایک عجیب سی حیوانی چمک ہویدا تھی۔ وہ اس کی گدلی گدلی آنکھوں سے میں اپنی رائفل تانے جھونپڑی کے اندر گھس گیا اندر سوائے کاٹھ کباڑ کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ بستر کے طور پر استعمال ہونے والے ایک کونے میں صرف گھاس تھی۔

مجھے شدید حیرت کا سامنا ہوا۔ ''آخر کہاں گیا آدم خور شیر۔'' جبکہ میں نے اسے دوسری بار اپنی آنکھوں سے اس جھونپڑی کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا میں باہر نکلا تو جنگلی بوڑھا پُراسرار نظروں سے میرے چہرے کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں خاموشی سے درخت سے نیچے اتر آیا اور وہاں سے کسی خیال کے تحت ایک قریبی جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اب میں یہاں سے باآسانی جھونپڑی پر نظر رکھے ہوئے تھا بوڑھا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آسمان پر اچانک ہی کالے کالے بادل نمودار ہونے لگے تھے۔ ماحول سہ پہر میں بھی ہلکی ہلکی تاریکی میں ڈوبنے لگا میں ابھی تک جھونپڑی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آج میں ہر صورت اس پُراسرار ڈرامے سے پردہ اٹھانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ جانے کیوں ایسا کچھ یقین سا تھا کہ وہی آدم خور سیاہ اپنی آئندہ کسی کارروائی کے لئے دوبارہ اس جھونپڑی کے اندر سے ہی نکلے گا۔

تب پھر اچانک میں بری طرح ٹھٹکا۔ میرا دل ایک دم جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ خونی اور پُراسرار آدم خور شیر جھونپڑی سے برآمد ہوا۔ میں نے دیکھا اس کا کندھا ابھی تک زخمی تھا سو۔ ایک لمحے کو جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی رائفل سے اس خونی آدم خور کا نشانہ لیا اور سانس روک کر لبلبی دبا دی۔ پرسکون فضا میں گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ کالا شیر جھونپڑی کے تختے پر کھڑے کھڑے ایک دھاڑ مار کر زور سے فضا میں اچھلا اور نیچے آ رہا۔ میں اب جوش کے مارے جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ آدم خور شیر گھاس پر پڑا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے ذرا قریب آ کر نشانہ لیا اور دوسری گولی بھی اس کے ہولے ہولے سانس لیتے سیاہ وجود

میں اتار دی آدم خور شیر ختم ہو چکا۔

میں نے جھونپڑی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کہ ابھی وہ پُراسرار بوڑھا غصے سے لال پیلا ہو کر باہر نکلے گا مگر ایسا نہ ہوا..... میں یہی سمجھا شاید وہ اندر چھپا ہوا ہے، میرا سامنا کرنے سے کترا رہا۔

ہو بہر طور میں اپنی فتح پر نازاں واپس ہوا۔ ادھر کرنل شاہان اور حیدر زخمی زاہد کو اٹھا کر گاؤں کے وید کے پاس علاج کے لئے لے گئے تھے۔ زاہد کی زندگی بچ گئی تھی وہ سب لوگ میرا کارنامہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ کرنل اور حیدر میرے ساتھ چل کر اس مردہ آدم خور کو دیکھنے آئے اور پھر ملازموں کے ذریعے کرنل نے اس آدم خور کو گاؤں والوں کے دیدار کے لئے اسے اٹھوا کر گاؤں بھجوا دیا۔

☆......☆......☆

''یار ندیم..... وہ بوڑھا شکاری کدھر گیا؟''

یہ اس سے اگلے روز کا ذکر تھا جب ہم واپسی کے لئے سامان پیک کر رہے تھے تو حیدر نے عجیب سے لہجے میں پوچھا تو میں نے مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔

''کہاں جا سکتا ہے وہ بڈھا اپنی برگد والی جھونپڑی میں بیٹھا سوگ منا رہا ہوگا۔ اپنے پالتو جانور کی موت کا۔''

''مگر یار یہی تو حیرانی کی بات ہے کہ اب وہ بوڑھا ادھر نہیں ہے۔ بابا اور دوسرے ملازموں کو میں نے خاص طور پر ہدایت دی تھی کہ اس بڈھے کو تلاش کریں تاکہ اس کو گرفتار کیا جا سکے'' اس بار میرے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

تب پھر حیدر بھیدوں بھری خاموشی کے بعد عجیب سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں آتا۔ مگر شاید تم میری بات کا یقین کر لو۔''

''ہاں، ہاں کہو؟''

''وہ بوڑھا کسی خاص شکتی کا مالک تھا..... مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے آدم خور وہ پُراسرار بوڑھا خود ہی تھا۔''

حیدر کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا..... اور حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

خوشبو کا راز

طارق محمود۔ اٹک

ویران اجاڑ کھنڈر میں اچانک روشنی کا جھماکہ ہوا جس سے سارا کھنڈر جکا چوند ہوگیا اور وہاں پر موجود لوگوں کی آنکھیں چندھیاگئیں اور پھر جب روشنی چھٹی تو لوگوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔

ایک حقیقت پسند روح کی دیدہ دلیری جس نے لوگوں کو انگشت بدنداں کردیا تھا

میرا نام سلطان ہے میں حساس اور نرم دل رکھنے والا ڈاکٹر ہوں، اپنے پیشے سے محبت کرتا ہوں اور غریبوں کا خیال رکھتا ہوں اسی لئے جب ہمارے ادارے میں ایک دور دراز سرحدی گاؤں کے لئے پوسٹنگ آئی تو میں نے خوشی سے اپنا نام آگے دیا ساتھ کے کئی ڈاکٹر میری طرف ایسی نظر سے دیکھتے تھے جیسے کہ میں پاگل ہوگیا ہوں لیکن میں مطمئن تھا کیوں کہ میں نے ڈاکٹری کا شعبہ خدمت خلق کے لئے ہی چنا تھا۔

وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے قریب ہی انڈیا کی سرحد تھی، اس گاؤں میں ایک چھوٹا سا اسپتال تھا اس گاؤں کے گرد صحرا پھیلا ہوا تھا اور گاؤں کے مکانات ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر تھے میں ہر وقت مریضوں کے لئے مستعد رہتا تھا۔

ایک ماہ ہوگیا تھا مجھے یہاں آئے ہوئے بارڈر

رینجرز فورس کے جوان بھی کسی نہ کسی بیماری کے سلسلہ میں میرے پاس آتے تھے، جن کی میں بہت اچھے طریقہ سے ٹریٹمنٹ کرتا۔ ان کا ایک انسپکٹر میرا بہت اچھا دوست بن گیا اور ہم دونوں دو مرتبہ شکار پر بھی گئے۔

میں باہر ضرور نکلتا تھا لیکن زیادہ دور تک نہیں جاتا تھا کیونکہ میں اس علاقہ سے انجان تھا اور میرے بھٹک جانے کا اندیشہ تھا۔ ایک شام ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور میں انجوائے کرتا ہوا تھوڑی دور صحرا میں نکل گیا، لیکن اندھیرا ہوتے ہی واپسی کا سفر شروع کیا، میں نے راستوں کے تعین میں بہت احتیاط برتی لیکن پھر بھی راستہ گنوا دیا آخر بہت مشکل سے مجھے واپسی کا راستہ ملا اس وقت تک اندھیرا کافی ہوگیا تھا۔ میں واپسی کے لئے تھوڑا ہی چلا تھا کہ میرے پاس سے کوئی ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گیا، میں نے جلدی سے پلٹ کر پیچھے دیکھا لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا بلکہ ہوا کا جھونکا خوشبو لے کر میری ناک سے ٹکرایا اور میں بے خود سا ہوگیا، پھر میں نے بے تاب ہوکر وہ سارا ایریا چھان مارا لیکن مجھے اس خوشبو کے علاوہ کچھ نہ ملا، میں کافی پریشان اور الجھا ہوا واپس اپنے اسپتال آگیا۔

اسپتال چھوٹا سا تھا جس کے تین کمرے تھے دو کمرے اسپتال کے لئے اور ایک میں میری رہائش تھی، میں اپنے کمرے میں لیٹا کافی دیر تک اس خوشبو کے متعلق سوچتا رہا، وہ خوشبو پوری رات میرے حواسوں پر چھائی رہی ایک دفعہ تو ایسا لگا کہ وہ خوشبو والی شخصیت جو کوئی بھی ہے میرے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ ہی کھڑی ہے، یہ احساس ہوتے ہی میں جلدی سے اٹھا اور دبے پاؤں کھڑکی کے پاس پہنچا اور جلدی سے کھڑکی چوپٹ کھول دی، لیکن مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ باہر کوئی نہ تھا۔ وہ رات میری اسی طرح بے سکونی میں گزر گئی۔

صبح اٹھ کر وضو کیا اور نماز ادا کی تو ملازم میرے لئے ناشتہ بنا کر لے آیا۔ حکومت کی طرف سے اس اسپتال میں ایک کمپاؤنڈر اقبال اور ایک ملازم دیگر کاموں کے لئے تھا جس کا نام رحمت تھا۔ رحمت جب مجھے چائے دینے لگا تو اس نے میری طرف غور سے دیکھا، رات کی بے خوابی میری سرخ ہوتی آنکھوں سے صاف نظر آرہی تھی۔ "ڈاکٹر صاحب لگتا ہے رات کو آپ صحیح طریقہ سے نیند نہیں لے سکے ہیں۔"

اس کی بات کے جواب میں، میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ ڈھیٹ سا ہوگیا جس پہ میں مسکرا دیا۔ "بس یار رات کو نیند نہیں آسکی اور کیوں اس کی ابھی تک مجھے خود سمجھ نہیں آئی۔" وہ مزید کچھ بات کئے بغیر ہی کچھ سوچتا ہوا باہر چلا گیا۔

آج میں نے پھر اسی طرف جانے کا پروگرام بنایا تاکہ اس خوشبو کا راز جان سکوں جو کہ اچانک پیدا ہوکر میرے ذہن پہ چھا گئی تھی، لیکن اس دن دوپہر کو ایک لڑکا جھگڑے کے دوران زخمی ہونے والا آگیا، دو پارٹیوں میں خاصی خطرناک لڑائی ہوئی تھی، ان کے ساتھ رینجرز کے جوان اور میرا دوست ولی بھی تھا۔

آٹھ کے قریب آدمی زخمی تھے جن کی میں اور اقبال مرہم پٹی کرتے رہے اور ایک دو ہلکے پھلکے آپریشن بھی کئے لیکن جو زیادہ زخمی تھے ان کو میں نے ڈسٹرکٹ اسپتال پہنچانے کا کہا۔

ان لوگوں سے فارغ ہوتے ہوتے رات کے نو بج گئے، میں بہت تھک گیا تھا، اس سارے بکھیڑے نے اس خوشبو کے راز کو جاننا بھلا ہی دیا تھا۔ انسپکٹر ولی کو میں نے روکنے کی کوشش کی' کھانا ساتھ کھاتے ہیں۔"

"نہیں ڈاکٹر ان لوگوں کی صلح صفائی کرانی ہے ورنہ بہت مشکل ہوجائے گی۔" وہ معذرت کرکے چلا گیا اور پھر میں بھی کھانا کھاتے ہی چادر تانی لیٹتے ہی سو گیا۔

رات کسی پہر ہلکے سے کھٹکے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی، اسی وقت کھلی کھڑکی سے اسی خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور مجھے معطر کر گیا، میں بے خودی کے عالم میں کھڑکی تک پہنچا لیکن وہاں کوئی نہ تھا، بس وہ ہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

میں جلدی سے دروازے کی طرف سے نکل کر اس خوشبو کی سمت پہنچا اور ادھر ادھر غور سے دیکھا دیا

لیکن میرے علاوہ وہاں کوئی اور ذی روح نہ تھا البتہ وہ خوشبو مجھے ایک خاص سمت کھینچتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں بھی بے پناہ نڑسا ہو کر اس خوشبو کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ خوشبو مجھے کسی راز تک لے کے جانا چاہتی ہے۔ چلتے چلتے پتہ نہیں کتنا عرصہ گزرا کہ مجھے ایک ٹھوکر لگی اور پھر میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ ہوش میں آتے ہی میں نے اپنے آپ کو صحرائی جھاڑیوں کے سامنے پایا۔ ساتھ ہی ایک بڑا سا ٹیلہ تھا جس کے گرد کچھ اینٹیں پڑی ہوئی تھیں ایسا لگتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے وہاں کچھ تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور پھر کسی وجہ سے چھوڑ دی گئی ہو۔

پھر اچانک اسی لمحے وہ خوشبو میرے ناک کے نتھنو میں گھسنے لگی تو میں نے جلدی سے جھاڑیوں کی طرف قدم بڑھا دیے جہاں سے وہ احساس کو منجمد کر دینے والی خوشبو آ رہی تھی لیکن ان جھاڑیوں کے پیچھے بھی کچھ نہ تھا۔ بس وہ خوشبو مجھے پاگل سی کر رہی تھی جس کا منبع مجھے نہیں مل رہا تھا کہ پھر تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ جس سے میں کافی الجھن میں پھنس گیا۔ کیونکہ کبھی مجھے وہ خوشبو دائیں طرف سے آتی محسوس ہوتی تو کبھی بائیں طرف سے تو کبھی آگے کبھی پیچھے سے۔ اس طرح میں چکر لگاتے لگاتے تھک گیا اور ایک چھوٹے سے ٹیلے کے اوپر چڑھ کر لیٹ گیا۔

آج چاند جوبن پر تھا اور اپنی چاندنی زمین پر بکھیر رہا تھا مجھے پیاس لگ رہی تھی، میرے پاس پینے کے لئے پانی نہ تھا اور اس صحرا میں پانی ملنا بھی مشکل تھا۔ کچھ دیر تک میں ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر لیٹا رہا اور پھر میں نے اپنی واپسی کی سمت کا تعین کر کے واپسی کا سفر شروع کیا۔ چلتے چلتے میں خیالوں میں کھو گیا اور پھر راستے سے بھٹک گیا۔ میں نے بے تاب ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو دائیں طرف ایک کھنڈر سا نظر آیا۔

میں کافی پریشان تھا کہ کیونکہ راستہ بھول چکا تھا۔ میرے دماغ نے کہا کہ واپس چلو لیکن دل نے کہا کہ ایک نظر اس کھنڈر کو بھی دیکھ لیا جائے اور پھر میں کھنڈر کی

طرف چل پڑا۔

وہاں تک پہنچا ہی تھا کہ میرا پاؤں کسی چیز میں اٹکا جس سے میں سنبھل نہ سکا اور بہت زور سے گرا لیکن خیریت تھی کہ اس لئے زیادہ چوٹ لگنے سے محفوظ رہا۔ کچھ سیکنڈ ریت پر پڑے رہنے کے بعد آہستہ آہستہ اٹھا اور اس اٹکنے والی چیز پر نظر ڈالی جو کہ زمین میں دھنسی ہوئی تھی۔ جب بغور دیکھا تو وہ ایک کپڑا سا تھا جس کا کچھ حصہ باہر تھا اور وہ پھندے کی شکل میں زمین سے باہر تھا۔ ”اوہ...... تو میرا پاؤں اس پھندے میں اٹک گیا تھا۔“ پھر میرے منہ سے شکر کا کلمہ نکلا کیوں کہ میں کھنڈر کی دہلیز پر گرنے سے بچ گیا تھا ورنہ اس سے میں زخمی بھی ہوسکتا تھا میں اس کپڑے کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ خوشبو جس نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے اب پہلے سے زیادہ آرہی ہے یہ احساس ہوتے ہی، میں نے آگے بڑھ کر وہ کپڑا آہستہ آہستہ ریت سے باہر کھینچ لیا۔

میں نے اسے جھاڑا تو وہ اک رنگین دوپٹہ نکلا جب میں نے بے خیالی میں اس دوپٹے کو اپنی ناک سے لگایا تو میں اچھل پڑا کیوں کہ وہ خوشبو اسی دوپٹے سے آرہی تھی۔

پھر میں کچھ سوچتا ہوا اس کھنڈر میں داخل ہوگیا جو کہ یقیناً کبھی کسی کی عالی شان رہائش گاہ رہی ہوگی۔ میں نے اس کھنڈر کو مکمل طور پر دیکھ لیا، آٹھ کے قریب کمرے تھے، جن میں کچھ کی دیواریں کسی حد تک سلامت تھیں، لیکن چھت کسی کی بھی نہیں تھی۔ اس کھنڈر میں تلاش کرنے کے بعد بھی مجھے کچھ نہ ملا اور میں بددل سا ہو کر واپس نکلنے لگا کہ اچانک ایک کمرے سے مجھے درد میں ڈوبی سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں اور پھر میں دیوانوں کی طرح ادھر ادھر بھاگنے لگا۔

بھاگتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میرے قدموں سے دھمک سی پیدا ہو رہی ہے جس سے مجھے شک ہوا کہ اس کمرے کے نیچے کوئی تہہ خانہ بھی ہے اب وہ سسکیوں کی آواز بہت مدھم ہوگئی تھی میں نے تہہ خانے کا راستہ بہت ڈھونڈا لیکن ناکام رہا اس وقت میری حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے کہ کوئی پیاسا آدمی دور سے کنواں دیکھ کر بھاگتے ہوئے آئے اور پھر خالی کنواں دیکھ کر جو حالت اس کی ہو۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگی تھی وہ سسکیوں کی آواز مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی تھی۔

بے چینی بے کلی سی میرے اندر پیدا ہوگئی تھی۔ اور پھر تھک ہار کر میں نے واپس اپنے اسپتال جانے کا سوچا اور جو میں کھنڈر سے باہر نکلا تو واپسی کا راستہ نہ ملا، سورج کی کرنیں نظر آنے لگ گئی تھیں یہ میرے لئے مزید پریشانی کی بات تھی کیونکہ صحرا کا سراب آدمی کو کہیں کا کہیں دکھاتا۔ اور اس سے بھی بڑی پریشانی کی بات یہ تھی کہ ساتھ ہی انڈیا کی سرحد تھی، جس کی نشان دہی بھی بالکل نہ تھی اسی لئے مجھے ڈر تھا کہ کہیں غلطی سے ادھر نہ چلا جاؤں، اسی سوچ میں بہت دیر تک میں وہیں کھڑا رہا۔ اور پھر ایک خیال آتے ہی میں ہمت کرکے اس کھنڈر کی ایک مضبوط اور اونچی دیوار پر چڑھ کے چاروں طرف دور دور تک دیکھنے لگا اور پھر سامنے ہی تھوڑی دور مجھے کچھ مکانات کی چھتیں نظر آگئیں، میں نیچے اتر کر اس طرف چل پڑا میں چل رہا تھا لیکن وہ راستہ ختم ہونے میں نہ آرہا تھا۔

اب مجھ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا کیوں کہ کل شام سے میں نے کچھ کھایا پیا نہ تھا میرے سامنے ایک بڑا سا ٹیلہ تھا جس پہ میں بہت مشکل سے چڑھ پایا اور پھر اپنے سامنے ہی رینجرز فورس کی عمارت دیکھ کر مجھے خوشی سے چکر آگیا اور میں لڑکھڑا کر ٹیلے سے نیچے کی طرف جا گرا۔ اسی وقت کسی آدمی کے شور کی آواز سنائی دی اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

ہوش آنے پر میں نے اپنے آپ کو ایک صاف ستھرے کمرے میں چارپائی پر پایا اسی وقت کسی نے مجھے اٹھا کر بٹھایا اور کوئی مشروب پلایا جس سے میری جان میں کچھ جان آئی، جب آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اپنے سامنے اپنے دوست انسپکٹر ولی کو دیکھ کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

”ہاں جی ڈاکٹر صاحب کہاں کی سیریں کرکے

خوشی سے بے ہوش ہوئے تھے۔" اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں بس آج بے ہوش ہونے کو جی چاہ رہا تھا۔" میں نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اس کے بعد ہم میں ایسے ہی ہلکی پھلکی مزاج کی باتیں ہوتی رہی اور پھر ہم لوگ اصل بات کی طرف آگئے، میں نے اپنے ساتھ ہونے والی تمام بات اسے بتادی۔

وہ ساری بات سنتے ہی سوچ میں پڑ گیا۔ "یار اتنا سوچنا کیوں ہے کچھ دور ہی تو وہ کھنڈر ہے چل کر دیکھ لیتے ہیں۔" میری بات سن کر اس نے سر کو ہلایا اور پھر ساتھ میں دو سپاہی اور کھدائی کے کچھ اوزار لے کر ہم لوگ اونٹوں پر بیٹھ کر اس کھنڈر میں جا پہنچے، اس نے بھی قدموں کی دھمک سے میری بات کی تصدیق کی۔ "واقعی اس کمرے کے نیچے تہہ خانہ بھی ہے۔"

پہلے ہم سب نے مل کر اس تہہ خانے کا دروازہ تلاش کیا لیکن کافی تلاش کے بعد بھی دروازہ نہ مل سکا۔

پھر ولی نے سپاہیوں کو اس کمرے کا فرش کھودنے کا کہا سپاہیوں نے بڑی مستعدی سے کمرے کا فرش اکھاڑنا شروع کردیا، کچھ دیر بعد ہی فرش کا ایک بڑا سا ٹکڑا ٹوٹ کر نیچے تہہ خانے میں جا گرا اندر کا کچھ راستہ بن گیا پھر کچھ سیکنڈ بعد بدبو کا ایک بھبکا سا اس سوراخ سے نکلا تو بے اختیار ہمارے ہاتھ اپنے اپنے ناک پر جا لگے۔

اب ہم سب کے چہرے پر تجسس تھے اور انسپکٹر ولی نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اس کے بعد وہ دونوں سپاہی ولی کے اشارے سے رسی کے ذریعہ نیچے تہہ خانے میں اتر گئے ان کے پاس بڑی ٹارچ تھی۔

کچھ سیکنڈ بعد ایک چیخ نما آواز سنائی دی۔ "سر اندر دو لاشیں پڑی ہیں۔" یہ سنتے ہی مجھے ایک جھٹکا لگا۔

"منیر تہہ خانے کا راستہ تلاش کرو جلدی۔" ولی نے ایک سپاہی کا نام لیتے ہوئے کہا۔

"دروازہ مل گیا سر۔" کچھ دیر بعد ہی اندر سے منیر کی آواز سنائی دی۔

"جلدی کھولو۔" ولی نے چیختے ہوئے کہا، اس

سنہرے اقوال

زندگی کمپیوٹر کی وہ فائل ہے جو ایک نہ ایک دن ڈلیٹ ہو جائے گی۔

زندگی کا کھلاڑی ایک نہ ایک دن ضرور عزرائیل کے ہاتھوں کلین بولڈ ہوگا۔

زندگی وہ فون لائن ہے جو ایک نہ ایک دن ضرور کٹ جائے گی۔

زندگی وہ کرنٹ ہے جس کا فیوز ایک نہ ایک دن ضرور اڑ جائے گا۔

(خضر حیات۔ ردو، چھل)

کے بعد کچھ دیر تک اندر سے ٹھک ٹھک کی آوازیں آتی رہیں اور پھر راستہ کھول دیا گیا جو کہ ساتھ والے کمرے کی دیوار کے ساتھ ہی تھا۔

نیچے اترتے ہوئے ہم نے اس جگہ سے نکلی ہوئی اینٹوں کا معائنہ کیا تو ایسے لگا جیسے کچھ وقت پہلے ہی اس راستہ کو بند کیا گیا ہو۔

ان لاشوں کو دیکھ کر مجھے جھٹکا سا لگا کیوں کہ لڑکی کے کپڑے اس دوپٹے سے میچ کر رہے تھے۔ سورج کی روشنی اب دونوں طرف سے تہہ خانے میں داخل ہو رہی تھی اس لئے سب کچھ صاف نظر آرہا تھا اور جب ہم ان لاشوں کے قریب گئے تو ان کی حالت دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے کیونکہ دونوں کو بڑی بے دردی سے کسی تیز دھار آلہ سے قتل کیا گیا تھا۔ میں تھوڑا سا آگے بڑھا اور پھر لڑکی کی لاش کا چہرہ دیکھ کر مجھے اک چکر سا آگیا اور میرے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی ایسے لگا جیسے کسی نے سوئی بڑے زور سے میرے دل میں چبھودی ہو اور پھر درد کی وہ لہر پورے جسم میں پھیلتی محسوس ہوئی۔

میرا ذہن مجھے چند رن پیچھے لے گیا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ بہت اچھی طرح میری پٹی کر رہے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا پہلے والے ڈاکٹر صاحب اچھی طرح مرہم پٹی نہیں کرتے تھے۔" میں پٹی کرنے میں ہی مصروف رہا۔

"نہیں...... وہ بھی اچھے ڈاکٹر تھے لیکن وہ لڑکیوں کو عجیب نظر سے دیکھتے تھے۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سے رنگ نظر آرہے تھے اور پھر پٹی مکمل ہونے کے بعد وہ میری طرف تشکر کی نظر سے دیکھتے ہوئے چلی گئی۔

اسی وقت میرے کندھوں پر ایک مضبوط سے ہاتھ کا دباؤ پڑا تو میں ہوش کی دنیا میں آ گیا۔

"کہاں کھو گئے میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔" انسپکٹر ولی مجھ سے مخاطب تھا۔

"کچھ نہیں یہ لڑکی تقریباً ایک ماہ پہلے میرے پاس آئی تھی کچھ کاٹتے ہوئے درانتی لگ گئی تھی اسے۔" میں نے بہت مشکل سے اسے بتایا۔

اب میں نے ان لاشوں کا بغور معائنہ کیا مرد کی لاش بہت کٹی پھٹی تھی۔ اس پر بہت زیادہ وار کیے گئے تھے جبکہ لڑکی کی بائیں طرف گردن پر ایک ہی وار تھا۔ جس سے اس کی گردن آدھے سے زیادہ کٹ گئی تھی اور یقیناً اسی سے اس کی موت واقع ہوئی ہوگی۔ ان دونوں کو کسی نے اتنی بے دردی سے مار کر تہہ خانے میں پھینکا اور پھر اوپر سے تہہ خانے کا راستہ بھی بند کر دیا گیا۔

انسپکٹر ولی نے اسی وقت ایک سپاہی قریبی بستی جس میں میرا اسپتال تھا کی طرف بھیج دیا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لڑکی کا تعلق اس گاؤں سے ہے۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں بس سر ہلا کر رہ گیا۔

ہم نے وہ لاشیں اٹھا کر باہر رکھ دیں اور ان پر ایک بڑا سا کپڑا ڈال دیا۔

جب گاؤں والے آگئے تو ولی نے ان سے پوچھا۔ "آپ سب میں سے کسی کے گھر سے کوئی فرد تو غائب نہیں۔" جس کے جواب میں وہ سب نا کے انداز میں گردن ہلانے لگے اس کے بعد ولی نے دو آدمیوں کو بلا کر لاشیں دکھائیں تو اچانک اس وقت ایک شور سا اٹھا وہ دونوں مقتول اسی گاؤں کے تھے اور ھر دیا دھوتا پڑ گیا۔

اب انسپکٹر ولی کو غصہ آ گیا تھا کیوں کہ جب اس نے کسی کی گمشدگی کے بارے میں پوچھا تھا تو سب نے انکار کیا جبکہ لاشوں کی حالت سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں ایک ماہ کے قریب ہو گیا ہے پھر ولی ان کے ورثا سے تفتیش کرنے لگا لیکن وہ انکار میں سر ہلاتے رہے۔

"انسپکٹر صاحب ہمیں کچھ نہیں پتہ۔" ان کی یہی تکرار تھی۔

میں ایک طرف گم سم اور اداس سا بیٹھا تھا جب ولی نے تھوڑی سی سختی کی اور جیل میں بند کرنے کی دھمکیاں دیں تو آخر لڑکے کا باپ روتے ہوئے بتانے لگا۔

"وہ دونوں آپس میں منسوب تھے لیکن ایک دن پڑوسی بستی کے ایک چوہدری کے بدمعاش لڑکے نے اس لڑکی جس کا نام عذرا تھا کو کہیں دیکھ لیا اور پھر وہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گیا آخر مجبور ہو کر لڑکی کے والدین اور لڑکے کے والدین نے چپ چاپ دونوں کا نکاح کر کے اس رات خاموشی سے انہیں یہاں سے نکال دیا اور لاہور جانے کا کہا دونوں خاندان مطمئن تھے۔

اس کے بعد ولی نے اپنے افسران کو سب کچھ بتا کر اس لڑکے کو اور اس کے دوستوں کو گرفتار کر لیا۔

لیکن میرا دل بہت دنوں تک اس لڑکی اور اس واقعہ پر اداس رہا میں کسی صورت بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ اس خوشبو نے اس راز کے بارے میں مجھے ہی کیوں بتایا تو ایک خیال کوندا بن کر میرے ذہن میں آیا کیوں کہ میں ایک نرم دل انسان ہوں اور پھر اس لڑکی کو میں پسند بھی کرنے لگا تھا۔ پھر ان دونوں کے پنجر کو کفن دے کر نماز جنازہ ادا کی اور دفن کر دیا گیا۔ گاؤں کے سارے افراد کی آنکھیں غم سے نم تھیں۔

اس کے بعد میں اس گاؤں میں ایک سال تک رہا کئی بار کھنڈر کی طرف گیا مگر پھر مجھے اس خوشبو کا کبھی بھی احساس نہ ہوا۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

ہم دیوانوں سے نہ پوچھو انجام الفت
ہم تو بے وفاؤں کو بھی جینے کی دعا دیتے ہیں
(انتخاب: محسن عزیز حلیم......کوٹھہ کلاں)

ہماری پیاس کا انداز بھی الگ ہے
کبھی دریاؤں کو ٹھکراتے ہیں کبھی آنسو تک پی جاتے ہیں
(انتخاب: محمد حلیم......کوٹھہ کلاں)

کبھی کبھی پتھر کے ٹکرانے سے آتی نہیں خراش
کبھی اک ذرا سی بات سے انسان بکھر جاتا ہے
(انتخاب: محمد اسحاق انجم......کنگن پور)

ہم نے کب مانگا ہے تم سے اپنی وفاؤں کا صلہ
بس ملتے رہا کرو کبھی کبھی درد بڑھانے کے لئے
(مس نوریہ کنول......کنگن پور)

ہم ابھی تک گرفتار محبت ہیں یارو
ٹھوکریں کھا کر سنا تھا کہ سنبھل جاتے ہیں
وہ بھی اپنی جفا پہ نہ ہوا شرمندہ
ہم سمجھتے رہے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں
(شرف الدین جیلانی......منڈی الہ آباد)

بدلہ وفا کا دیں گے بڑی سادگی سے ہم
تم ہم سے روٹھ جاؤ گے اور زندگی سے ہم
(انتخاب: عادل یاسین......کھنڈر شاہ پور جاکر سے)

کبھی رخسار کو کبھی لب کو چوم لیتی ہے
میں نے اپنی زلفوں کو بڑا سر پہ چڑھا رکھا ہے
(انتخاب: عمران......کراچی)

اتنے خوددار تھے ہم کہ کبھی گھر سے نہ نکلے تھے
تیرے اک ذوق دیدار نے مجھے آوارہ بنا دیا
(عطاالرحمٰن غوری......لاہور)

وہ بے وفا تو ہے نہیں پر بیوفا سے کم نہیں
اس نے جو کی تھی دل لگی وہ تو جفا سے کم نہیں
(انتخاب: شہریار ملک......کچھرو)

[illegible] میں ایسے بکھرے ہوئے فلک
مگر وہ مجھ میں اب بھی پنہاں ہے درد اول کی طرح
(فلک فیضان......رحیم یار خان)

مقدر نے ہم کو جدا کر دیا
اے مالک میرے تو نے کیا کر دیا
لبوں سے میرے وہ ہنسی چھین کر
کیوں اشکوں سے دامن میرا بھر دیا
(آصف سراج......لاہور)

اک غریب چلی ہے تجھے چاہتے ہوئے
تو آج بھی بے خبر ہے محسن گل کی طرح
(عبدالحلیم محسن......کوٹھہ کلاں)

آنکھوں کے آنسو چھپائے نہیں جاتے
مقدر کے لکھے مٹائے نہیں جاتے
تیری یادوں سے بیچا کیسے چھڑاؤں
دل میں بسنے والے بھلائے نہیں جاتے
(طاہر اسلم بلوچ......سرگودھا)

ستم کرو یا کرم کرو ہم گلا نہیں کرتے
خزاں میں پھول یقیناً کھلا نہیں کرتے
ملا دو خاک میں مگر یار دے
ہم جیسے لوگ دوبارہ ملا نہیں کرتے
(انتخاب: حافظ سبحان......کراچی)

ساقی آج کیسا آگیا ہے زمانہ
جو تھا اپنا وہ بھی ہے بیگانہ
(محمد احمد ساقی......جھنگ عبداللہ شاہ)

اب تو دل میں اک ہی آرزو ہے
جان نکل جائے تیرا چہرہ دیکھتے دیکھتے
(نمرہ کنول......منڈی احمد آباد)

تم کیوں بنے تھے دل کا سہارا جواب دو
اب کہاں ہے وہ پیار تمہارا جواب دو
کس کو تھا ناز اپنی اداؤں پہ ہر گھڑی
کس نے کیا وفا سے کنارہ جواب دو
ہم تو سہہ نہ سکیں گے جدائی کا غم
یہ قول تھا میرا یا تمہارا جواب دو
(انتخاب: طارق ملک......نواب شاہ)

☆☆

غزل

تم سے دل لگانے کا موقع نہیں ملا
اپنے زخم دکھانے کا موقع نہیں ملا
بادل سے سر اٹھانے کا موقع نہیں ملا
روٹھے کو پھر منانے کا موقع نہیں ملا
جتنے بھی میرے تم نے ٹوکا تھا ایک بار
بچپن کھل کے مسکرانے کا موقع نہیں ملا
اپنے ہنر دکھانے کا موقع نہیں ملا
پھولوں سے گھر سجانے کا موقع نہیں ملا
در ایک چانس ہاتھوں سے اپنے مس ہو گیا
قسمت کو پھر جگانے کا موقع نہیں ملا
ہم دردوں کی چارہ گری میں بس رہے ہیں
اپنا انہیں بتانے کا موقع نہیں ملا
تم کو پھر بلانے کا موقع نہیں ملا
اور اپنا دل جلانے کا موقع نہیں ملا
برسیں گھٹائیں ایسی کہ واجد چھت ٹپک پڑی
موسم سے لطف اٹھانے کا موقع نہیں ملا

(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی..... کراچی)

مہکنے غنچے کچھ وصل کے پھول شام سے پہلے
روز مہکتے ہیں تیری امید میں شام سے پہلے
ریزہ ریزہ ہو کے بکھر گئے، راہوں میں پھر
جتنے پھول کھلے تھے گلشن دل میں شام سے پہلے
میرے گھر میں بھی آجائے کبھی تو بہار
جھنگے سے آجاؤ تم یوں ادھر شام سے پہلے
پھر سے وہ نظر نہیں آئے وہ سب لوگ
جو دم بھرتے تھے محبت کا شام سے پہلے
تیرے بغیر فضا ساری اداس ہے ہمسفر
زندگی بہت بارونق تھی شام سے پہلے
زیست وہ نہیں رہی جو نظر آئی ہے مجھے
اے میرے ہم نفس یوں شام سے پہلے
تجھے بھولا ہوا نہ کہیں گے ہم جاوید
لوٹ آؤ جو ذرا اگر شام سے پہلے

(محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد)

مجھ سے جب ان کو کوئی بھی رغبت نہیں رہی
مجھ کو بھی ان کے پیار کی حاجت نہیں رہی
جب سے نکل گیا کوئی میرے وجود سے
دل پر میرے کسی کی حکومت نہیں رہی
دشمن کی سازشوں کی خبر ہو تو کس طرح
مجھ میں جو تاک جھانک کی عادت نہیں رہی
غربت میں در کے قوم کا غم خوار تھا بہت
کرسی ملی تو اس میں وہ فطرت نہیں رہی
احباب میں وہ اس کو لٹاتا بھی کس طرح
اس کے یہاں خلوص کی دولت نہیں رہی
الجھایا اس طرح سے غم روزگار نے
مجھ کو کسی بھی چاہ کی چاہت نہیں رہی
جس دن سے خود کو پیکر الفت بنا دیا
امتیاز کو آئینے کی ضرورت نہیں رہی

(ایس امتیاز احمد..... کراچی)

سورج کی راکھ کرتی شعاعوں میں تو جی لے ذرا
چاند کی مدہوش کرتی مدھم چاندنی میں تو جی لے ذرا
بادلوں کے شور کرتی گڑگڑاہٹ میں تو جی لے ذرا
برسات کی شور مچاتی بوندوں میں تو جی لے ذرا
رات کی سیاہ چادر اوڑھ کر تو جی لے ذرا
کائنات کے ٹھنڈے آبشاروں میں تو جی لے ذرا
دن کے روشن اجالوں میں تو جی لے ذرا
پھولوں کی من کو لبھاتی خوشبو میں تو جی لے ذرا
تتلی کے رنگ میں سما کے یار تو جی لے ذرا
میری آنکھوں کے سپنوں میں اتر کر تو جی لے ذرا
ہونٹوں کی پیار بھری مسکان لے کر تو جی لے ذرا
محبت کے خاردار کانٹوں پر چل کر تو جی لے ذرا
چھن چھن کرتی پائل کی جھنجھی آواز میں تو جی لے ذرا
اللہ کی یاد کو دل میں بسا کر تو جی لے ذرا
پھر چاہے موت کی آغوش میں کیوں نہ سونا پڑ جائے
خدا کو اپنا حی القیوم مان کر تو پھر سے جی لے ذرا

(کنول بنت محمد فیاض..... کراچی)

دلوں کو برف کرتی داستانیں مار ڈالے گی
مجھے تو یہ محبت کی کہانی مار ڈالے گی
اسے بس ایک پل کو تکتا ہے اور بات کرتی ہے
مگر یہ اشک سادہ کی روانی مار ڈالے گی
کہاں تک ہم جئیں گے اس طرح سے وادیٔ غم میں
کسی دن شام وحشت کی گرانی مار ڈالے گی
کہاں تک ہم بھٹکتے ہی رہیں گے تیری چاہت میں
کسی دن بے گھری کی مہربانی مار ڈالے گی
ہر اک سے ہنس کے ملنا اور ہنس کے بات کرنا ہے
ہمیں تو اس کی اتنی خوش بیانی مار ڈالے گی
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

محبت میں نہ ایسا بھی کوئی مجبور ہوجائے
کہ بیٹھے سے لگا کر موت کو منصور ہوجائے
منا کر اس کو لے آؤں مگر اس بات کا ڈر ہے
کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اور مغرور ہوجائے
تمہیں کیا بتاؤں کیا نشیلی اس کی آنکھیں ہیں
کہ جو بھی دیکھے انہیں وہ بن پئے مخمور ہوجائے
ابھی ہلکا سا زخم ہے دل پہ تیری جدائی کا
کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ زخم بھی ناسور ہوجائے
نہ جانے محسن علی اب عشق کا کیا انجام ہوگا
جو پہلے مرحلے میں اس قدر مشہور ہوجائے
(انتخاب: ادم طالب......ضلع بھکر)

وہ مہندی لگا ہاتھ دیکھا کر روئی
میں کسی اور کی ہوں یہ بتا کے روئی
میں بولا کون ہے وہ خوش نصیب
وہ مہندی سے لکھا ہوا نام دیکھا کے روئی
کہیں غم سے پھٹ نہ جائے جگر میرا
وہ ہنستے ہنستے مجھے ہنسا کے روئی
دل نہ توڑنے غم ہجر میں......
میں بھی رویا وہ میری آنکھ سے آنکھ ملا کے روئی
اس نے جانا میرے رونے کا سبب
اپنے آنسو میری ہتھیلی پہ سجا کے روئی
جب دیکھا اسے ہنستے ہوئے دیکھا
وقت حسینہ ہر خوشی کو وہ رلا کے روئی
دل نے چاہا اسے جی بھر کے دیکھ لوں
وہ میری آنکھوں کی پیاس کو بجھا کے روئی
کبھی کہتی تھی میں نہ جی پاؤں گی تم بن
اور آج پھر وہ یہ بات دہرا کے روئی
(ایم ارشد کمبوہ......جھنڈو)

کوئی غم پھر مجھے تسخیر کرنا چاہتا ہے
کہ اک چہرہ مجھے زنجیر کرنا چاہتا ہے
وہ جس کو ساری دنیا سے چھپا کر رکھا ہے میں نے
مرے احوال کی تشہیر کرنا چاہتا ہے
جو کہنا تھا زباں سے میں وہ سب کچھ کہہ چکا ہوں
مگر اب دل کوئی تقریر کرنا چاہتا ہے
وہ مرے جسم و جاں کو ریزہ ریزہ کرنے والا
مجھے اک بار پھر تعمیر کرنا چاہتا ہے
گزرتے وقت کا اب اک اک قیامت خیز لمحہ
مرے چہرے پہ تحریر کرنا چاہتا ہے
(شیخ زین جاوید......چنڈواون خان)

اک دل تے لاکھ سمجھاواں والے
جے سمجھ نہ آوے تے کی کریئے
درد دل دا ہووے تے سہہ لئے
جے دل ہی درد بن جاوے تے کی کریئے
جنوں دل دے روگ سناوے سی
اوہی روگ دے جاون تے کی کریئے
جناں دے نال ہی میری دنیا سی
جے اوہی چھڈ جاون تے کی کریئے
اسی آج دی راہواں تک دے آں
او راہ بھول جاون تے کی کریئے
(طاہر اسلم بلوچ......سرگودھا)

تمہارے ساتھ بتایا وقت خواب لگتا ہے
ملو گے پھر کبھی سراب لگتا ہے
تیری آہٹ سننے کو دل مچلتا ہے
ہر آواز پہ چہرہ تیرا مگر انجان لگتا ہے

ہجر و کے ہم یوں بھی جان کن
تیرا پھر لوٹ کے آنا گمان لگتا ہے
تیرے عشق کی بہار روٹھ گئی ساری
ہر موسم بے اعتبار بے قرار، خزاں لگتا ہے
تم سے خون کا رشتہ نہ بن سکا دل جاناں
جینا مرنا ساتھ تمہارے، صدائے جان لگتا ہے
(مدثر بخاری.....شہر سلطان)

سردیوں کی لمبی راتوں میں تنہا ہو کے
بہت اداس رہو گے تم ہم سے خفا ہو کے
پچھتاؤ گے تم بھی جب یاد ہماری آئے گی
کچھ بھی نہ ملے گا تمہیں ہم سے جدا ہو کے
جہاں اتنا وقت گزرا کچھ پل اور بھی گزار جاتے
اس کے بعد جاؤ گے کہاں تم آخر ہماری وفا ہو کے
میں اک لمحہ بھی تمہیں بھلا نہیں سکتا لیکن جاناں
تم نے کہاں یاد رکھا ہوگا ہم کو اک بیوفا ہو کے
عشق کا تیر بھی تھا کتنا عجیب شاطر
دل پہ جا لگا پھر بھی نشانہ کے خطا ہو کے
(طارق محمود.....کامرہ کھوڑ اٹک)

درد کیا ہے بتائیں گے کسی روز
کمال کی غزل تم کو سنائیں گے کسی روز
تھی ان کی ضد میں جاؤں ان کو منانے
مجھ کو وہم تھا کہ بلائیں گے کسی روز
ہر روز تجھے سے یہی پوچھتا ہوں میں
کیا رخ پہ تبسم بھی سجائیں گے کسی روز
اڑنے دو ان پرندوں کو آزاد ارم طالب
تیرے اپنے ہوں گے تو لوٹ آئیں گے کسی روز
(انتخاب: محسن علی طالب.....بھکر)

تیری دید سے دن کا یوں اہتمام کرتے ہیں
اپنی ہر صبح و شام تیرے نام کرتے ہیں
میری محبت کی حدوں سے تم باہر تو نہیں
اپنی وفا کو ہم تجھ پہ تمام کرتے ہیں
تیری نگاہوں میں ہے زندگی اپنی جاناں
تیری خاطر ہم اپنا بھی احترام کرتے ہیں
حیران ہے دنیا میرے لبوں کی سرخی پر
وجہ یہ ہے کہ ہر لمحہ ہم تجھ سے کلام کرتے ہیں
ہم وہ نہیں جنہیں زمانہ جھکا دے جاناں
مگر دل کے کہیں تیرا ذکر ہم سر عام کرتے ہیں
(عظیم خان سیلاچی.....گابین گلی)

منا رہی تھی مجھے طرز انتہا اس کی
میں کس کی جان بچاتا خود اپنی یا اس کی
اداس کس لئے رہتا تھا روٹھتا کیوں تھا
کبھی نہ کھل سکی مجھ پہ ادا اس کی
نہ میں نے کوئی صدا اس کو دی نہ وہ لوٹا
میری انا کے مقابل رہی انا اس کی
اسے خراج محبت ادا کروں گا ضرور
ذرا میں یاد تو کرلوں کوئی وفا اس کی
وہ چند لوگ جو میری طرف تھے کیا کرتے
ادھر تو ایک خدائی تھی ہم نوا اس کی
نہ جانے کتنی محبت تھی اس کی نفرت میں
کئی دعاؤں سے بہتر تھی بد دعا اس کی
اسے جدا ہوئے برسوں گزر گئے محسن
مگر ہے نقش دل و جاں پہ ہر ادا اس کی
(فلک فیضان.....رحیم یار خان)

جینا کوئی مشکل تو نہیں، بس تھوڑی سی وفا چاہئے
جینے کی طرح سے جینے کے لئے پیار کا صلہ چاہئے
گھر کے آنگن میں آندھی آئے تو پتے بکھر جاتے ہیں
کوئی جھونکا بھی چھو کے گزرے تو بیچارے ڈر جاتے ہیں
رونا نہیں جب ڈر لگے ہونا تھا جو سو ہوا
سانس لینا مشکل تو نہیں بس تھوڑی سی وفا چاہئے
دل کے شیشے میں تیرے لفظوں کے زخم کھلتے رہے
دھیرے دھیرے سے میری راہوں میں درد اگتے رہے
پاؤں میرے چھلتے رہے، ہونا تھا جو سو ہوا
مرنا کوئی مشکل تو نہیں، بس مرنے کی دعا چاہئے
(انتخاب: ماہ نوید شاہ.....خضدر جام)

تشنگی اور بڑھاتا ہے نہیں آتا وہ
اک نیا درد جگاتا ہے نہیں آتا وہ
حالت ہجر میں آسیب زدہ گھر کی طرح
کچھ نہ کچھ یاد رلاتا ہے نہیں آتا وہ
جو میری ذات میں اک چشمہ رواں رہتا ہے
خود کو وہ اس میں بہاتا ہے نہیں آتا وہ
یہ میرا دوش کہ پوجا ہے اسے دل سے مگر
اب فقط خواب میں آتا ہے نہیں آتا وہ
اس لئے میں نے وفاؤں کو پرکھنا چاہا
کیوں مجھے پاس بلاتا ہے نہیں آتا وہ
آ گیا گر تو اسے جانے نہیں دوں گا رضا
صرف وہ دعوے کئے جاتا ہے نہیں آتا وہ
(نعیم رضا بھٹی.....منڈی بہاؤالدین)

اپنے ماضی کے جذبے جواں ڈھونڈتا ہوں
پچھلے موسم میں رنگی خزاں ڈھونڈتا ہوں
تپش سے جل اٹھا ہے صحرا آرزو کا
بادلوں سے ڈھکا آسماں ڈھونڈتا ہوں
قتل گاہ جو بنا ہے میری ذات کا
اب میں جذبہ دل بھی بے زباں ڈھونڈتا ہوں
بے پناہ ان ویرانوں کی وسعتوں میں ہر سو
خاک میں گم ہوا اک مکاں ڈھونڈتا ہوں
دے جو دھوکہ مجھے اپنے ہر اک قدم پہ
شخص ایسا کوئی مہرباں ڈھونڈتا ہوں
در میں اشکوں کے سنگدل سیاہیوں کے ڈر سے
ریت کا اک بحر بیکراں ڈھونڈتا ہوں
ہے ثبت مہر سکوت میرے لب پہ
اس عجب سے کسی کا زباں ڈھونڈتا ہوں
جہاں تاریکیوں کے سوا کچھ نہ ہو
ان ازلی خامشیوں کا زنداں ڈھونڈتا ہوں
خاک ذروں میں اپنے مقدر کی طرح
میں تیرے قدموں کے صحرا نشاں ڈھونڈتا ہوں
(ساحر شعون صحرا.....جیون پورگاں)

تیری چاہ میں کیا سے کیا ہوگئے ہیں
کہ دل درد سے آشنا ہوگئے ہیں
گئے رنگ زادوں میں تیرے لئے ہم
فنا پا کے اب ہم بقا ہوگئے ہیں
ترے عشق میں ہم رہے ہیں خدایا
کہ یوں موت سے ماورا ہوگئے ہیں
نہ ملے ہمیں وصل کے پل سکیں گے
کہ ہم ہجر کی اک صدا ہوگئے ہیں
صدا موسم درد ہے اور خانم!
مریض وفا لا دوا ہوگئے ہیں
(فریدہ خانم.....لاہور)

ہمارے بے چین دل کو تھوڑا صبر تو آئے
جو تم نہ آؤ تمہاری کوئی خبر تو آئے
جو اپنے غم کو بھلا کے اوروں کے غم کو بانٹے
کوئی بھی انسان ہم کو ایسا نظر تو آئے
ہم ایک مدت سے ظلمتوں کے مکیں ہیں یارب!
کہیں سے اب کے کوئی نوید سحر تو آئے
کبھی تو رہبر سے راہزن کا بھی روپ دھارو!
ذرا ہمیں بھی اے جان لطف سفر تو آئے
(راغب عثمان کیانی.........راولپنڈی)

نہ جانے کیا ہوگا اب حال اس کا
کرتا ہے دل ہر پل سوال اس کا
میری نوازی ہوگی تنہائی میں
جینا نہ ہوگا محال اس کا
اسے دیکھے ہوئے کئی صدیاں بیت گئیں
اب آیا ہے دل کو خیال اس کا
وقت کس طرح سے بدل دیتا ہے چہرے
نہ وہ دل رہا نہ وہ جمال اس کا
اسے کچھ دیتا کوئی پچھتاوا نہ تھا
پھر کیوں ہوتا ہے دل کو ملال اس کا
یہ نہ ہو غم سے مرجاؤں میں
اے دل درد نہ مجھ میں بال اس کا
(ثنا ثمر.....راولپنڈی)

☆☆

رئیس کا محنت کش مزدور
کام سے رکھو ہر دم چور
محنت ہی منشور ہے اس کا
کام کاج دستور ہے اس کا
یہ تعمیر کریں ہر گھر کو
رونق بخشیں "کام نگر" کو
بھی بنائیں صحرا گلشن
ان کے دم سے دھرتی روشن
کہساروں پہ جھنڈے گاڑے
بحر میں دیکھے تارے چلائے
عزم سے کیا بھرپور ہے سینہ
بدن سے ان کے بہے پسینہ
(چوہدری قمر جہاں علی پوری ...... ملتان)

ہمارے پاس در آتا نہیں ہے
دلوں سے کبھی جاتا نہیں ہے
بھٹک جاتا ہے جو راہوں سے اپنی
وہ منزل کو کبھی پاتا نہیں ہے
یہ موسم کیسا اب آنگن میں اترا
کوئی بھی گیت اب گاتا نہیں ہے
تمہاری یاد کا جھونکا بھی اب تو
میری آنکھوں کو مہکاتا نہیں ہے
چلے آؤ قمر رانا یہ نوازش
کہ اب تو درد بھی جاتا نہیں ہے
(قمر رانا ...... راولپنڈی)

تم ساتھ جو میرے ہوتے ہو
ہر موسم پیارا لگتا ہے
کیا دھوپ کڑی ...... کیا سرد گھڑی
کیا خشک ہوا ...... تنہا صحرا
ہر چیز میں نور چھلکتا ہے
تم ساتھ جو میرے ہوتے ہو
ہر موسم پیارا لگتا ہے
پت جھڑ کی سرد ہوائیں بھی
صحرا کی خشک گھٹائیں بھی
ساون کی بھیگی راتیں بھی
گرمی کی گرم فضائیں بھی
ہر رت میں عشق مہکتا ہے
تم ساتھ جو میرے ہوتے ہو
ہر موسم پیارا لگتا ہے
(شگفتہ ارم درانی ...... پشاور)

بارشوں کے موسم میں
یادوں کی جولانی ہو
ایک ذرا پرانی ہو
پھر نہ پوچھو بے بسی
کس قدر رلاتی ہے
یادیں جب بھی آتی ہیں
درد بھی بڑھاتی ہیں
بارش کے موسم میں
بارشیں برس کر
آخر رک ہی جاتی ہیں
یادیں پھر بھی آتی ہیں
عمر بھر رلاتی ہیں
بارشوں کے موسم میں
بارشیں ستاتی ہیں
(بیا سحر ...... مدینہ سیداں گجرات)

ہم نے سینے میں آگ سی سی ہے
ہم کو لگتی وہ آگہی سی ہے
آشیاں جس پہ آ بنایا تھا
غم سے وہ شاخ بھی جھکی سی ہے
جب سے حالت ہماری غیر ہوئی
سب کے ہونٹوں پہ اک ہنسی سی ہے
وہ چھپتی دکھائی دیتی نہیں
برف جذبوں پہ جو جمی سی ہے
اس کا اظہار کیوں نہیں کرتے
لب پہ خواہش کوئی دبی سی ہے
کیوں نجانے وہ گھر میں آتی نہیں
روشنی در پہ آ گئی سی ہے

خواہشیں سب ادھوری لگتی ہیں
زندگی میں کوئی کمی سی ہے
آؤ شہزاد اب انہیں ڈھونڈیں
زیست جن کے بنا رکی سی ہے
(آصف شہزاد ...... فیصل آباد)

عید پھر سے آئی ہے جاناں
زخم پھر سے ہوئے ہیں تازہ
وقت بھی یہ کیسے بدلتا ہے
لگ رہے ہیں اب ہم شکستہ
ورق ماضی الٹ گئے ہیں
عیدوں کے موسم جو کھل گئے ہیں
آنکھوں کو دید کا احساس ہے
عید پھر سے آ رہی ہے
اب تو لوٹ آؤ جاناں
(عبادت کاظمی ...... ڈیرہ اسماعیل خان)

یہاں پل پل جلنا پڑتا ہے
ہر رنگ میں ڈھلنا پڑتا ہے
ہر موڑ پہ ٹھوکر لگتی ہے
ہر حال میں چلنا پڑتا ہے
ہر دل کو سمجھانے کی خاطر
بس خود سے لڑنا پڑتا ہے
کبھی خود کو کھونا پڑتا ہے
کبھی چھپ کر رونا پڑتا ہے
کبھی نیند نہ آئے پھولوں پہ
کبھی کانٹوں پہ سونا پڑتا ہے
کبھی مر کر جینا پڑتا ہے
کبھی جی کر مرنا پڑتا ہے
کبھی تو خوشیاں لوٹ کے آئیں گی
اس آس پہ جینا پڑتا ہے
(طاہرہ اکرم بلوچ ...... سرگودھا)

ہاں میں لوٹ
آؤں گا

تم نے کہا تھا
بارش بن کر برسوں گی
ساون رت کا
انتظار کیوں!
تم عہد نہ توڑو
میں عہد نبھاؤں
گا
ہاں میں لوٹ
آؤں گا

(اسحاق انجم ...... کنگن پور)

زندگی سے نظر ملاؤ کبھی
ہار کے بھی مسکراؤ کبھی
ترک الفت کے بعد امید وفا
ریت پہ چل سکی ہے ناؤ کبھی
اب جفا کی صراحتیں بیکار
بات سے بھر سکا ہے گھاؤ کبھی
شاخ سے موج گل تھمی ہے کہیں
ہاتھ سے بھر سکا ہے گھاؤ کبھی

(سنبل ماہین ظفر ...... سرگودھا)

وقت کی عدالت میں
زندگی کی صورت میں
یہ جو میرے ہاتھوں میں
اک سوالنامہ ہے
کس نے یہ بنایا ہے؟
کس لئے بنایا ہے؟
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟
زندگی کے پرچے کے
سب سوال لازم ہیں
سب سوال مشکل ہیں

(عروج ماہین ظفر ...... سرگودھا)

میں پیچھے در ز کے جا رہی تھی
انداز اپنی چال کے دکھا رہی تھی
بے اختیار دل اس کی طرف کھنچا گیا
مست نگاہیں جب مجھ سے ملا رہی تھی
چھانے لگے پیار کے بادل چار سو
سنہری زلفیں جب وہ لہرا رہی تھی
رکھا کر اپنا پری ایسا چہرہ
جگہ میرے دل میں بنا رہی تھی
دل اس کی طرف مائل تھا میرا
جذبات محبت وہ دل میں جگا رہی تھی
میری نگاہوں کا مرکز وہ حسینہ تھی
مجھے اپنا دیوانہ جو بنا رہی تھی
اک میں تھا اور خیال تھا اس کا
یاد آیا مجھے عہد وفا اس کا
آنکھیں میری کھلی ہوں یا بند ہوں
رہتا ہے سامنے چہرا اس کا
دل نے یاد کیا وہ سامنے آ گئی
رہ نہیں سکتا میں بدلہ اس کا
محبت ہے ان سے بے پناہ مجھے
دروازہ میرے دل کا جو کھٹکھٹا رہی تھی
میری جدائی مار نہ ڈالے تجھے ابراہیم
یہ کہتے ہوئے وہ آنسو بہا رہی تھی
اے میرے گلاب بتا تمہارا نام کیا ہے
تمہاری یاد کے سوا مجھے کام کیا ہے
ڈوبا رہتا ہوں تمہاری نیلی آنکھوں میں
تمہاری مست نگاہوں کے سامنے حیثیت جام کیا ہے

(محمد ابراہیم کھوکھر ...... جھمرہ وٹی)

کیوں تیرا انتظار رہتا ہے
دل پہ ہر دم خمار رہتا ہے
غم کا طوفان ہو یا وحشی ہوا
ایک محفوظ پیار رہتا ہے
رت ہو کبھی، ان سے یادوں کا
سلسلہ استوار رہتا ہے
زندگی دیکھ میرے آنگن میں
روز جشن بہار رہتا ہے
کیسے اس کو بھلادوں وہ دانا
ذہن و دل پہ سوار رہتا ہے

(فضہ برانا ...... راولپنڈی)

تم کو نہ بھول پائیں گے
دل کو ذرا سا آرام دیں گے
آج نہیں ہم تیرا نام لیں گے
یاد جو آئے گی تیری
دل کو سمجھا لیں گے
مانا کہ چین کہیں آتا نہیں
تنہا اکیلے دل کہیں لگتا نہیں
تنہا اکیلے درد سہہ لیں گے ہم
تجھ پہ نہ ہونے دیں گے ستم
ہم دعا یہ کرتے ہیں
تو صدا مسکرائے جائے
زندگی میں کبھی غم نہ آئے
سر پہ ہم تیرا الزام لیں گے
آج نہیں ہم تیرا نام لیں گے
یاد جو آئے گی تیری تو
بے چین دل کو ہم تھام لیں گے

(ارم اعجاز ...... کراچی)

آمد آمد ہے دیکھا بہار کا موسم
کھلا کھلا ہے دیکھا انتظار کا موسم
غم نہ کر اس دور کے ستم سے
آ رہا ہے حسن روزگار کا موسم
ڈر رہا ہے برسوں سے دل بے قرار
ملے گا سکون کہ ہے قرار کا موسم
جان میں جان آئے گی
مے خانے میں بہار آئے گی
جھوم رہے خواروں پہ مے خوار کا موسم
طلب ڈالیں گے ساقی کی نگاہی کا رقص
کیونکہ آ رہا ہے رقص و چنار کا موسم

(دلکش امیر پوری ...... کھرڑیانوالہ)

☆☆

کفارہ

شہزادہ چاند زیب عباسی۔ کراچی

اس کی چاہت انمٹ تھی اپنے دل کو لاکھ سمجھاتی رہی مگر دل تھا کہ اس کی گرفت سے بے قابو ہی رہا، کوئی ایسا پل نہ تھا کہ وہ اپنے دل کو تھپکیاں نہ دیتی، مگر محبت کا مارا دل کسی طور بھی......

ایک حقیقی داستان عشق جسے پڑھ کر اہل دل عش عش کر اٹھیں گے اور برسوں یاد رکھیں گے

اس کی آنکھ کھلی تو خود کو اندھیرے گڑھے میں پڑے پایا۔ یہ جگہ کافی تنگ اور تاریک تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی قبر میں پڑا ہے۔ اسے کسی بھی قسم کی تکلیف یا درد کا احساس نہ ہو رہا تھا۔ جبکہ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ وہ اپنے ہوش وحواس کھونے سے پہلے اس کے جسم میں تین گولیاں لگی تھیں۔ ''تو کیا وہ مر چکا ہے اور قبر میں موجود ہے۔'' یہ سوال ذہن میں ابھرتے ہی وہ بے اختیار اٹھ بیٹھا۔

اچانک اس تاریک گڑھے میں نارنجی رنگ کی عجیب سی روشنی پھیل گئی۔ وہ خوف زدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہو۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا اس کے سامنے ایک دیو ہیکل شخص موجود تھا۔ اس کا قد کئی فٹ لمبا تھا۔ وہ اس دیو ہیکل شخص کے سامنے بونا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا سر بہت ہی ہیبت ناک تھا اور خاص طور پر چہرہ اس قدر بھیانک تھا کہ اسے دیکھتے ہی ذیشان کی گھگھی بندھ گئی۔

''کک کون ہو تم؟ اور میں کہاں ہوں؟'' ذیشان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

خوف ناک صورت شخص نے اپنی سرخ دہکتی آنکھوں سے اسے گھورا۔ ''تم مر چکے ہو۔'' اور تمہارے برے اعمال کے سبب مجھے تم پر مسلط کر دیا گیا ہے۔

''نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون خوف سے منجمد ہونے لگا۔

اچانک ہی وہ گڑھا خوف ناک آگ سے بھڑک اٹھا اور اس آگ نے اس کے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ درد اور اذیت سے چیخنے لگا اسے ناقابل برداشت اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

اس کے جسم کی کھال اس خوف ناک آگ سے جیسے پگھل چکی تھی اور گوشت کے جلنے کی بو آ رہی تھی پھر یہ آگ بجھ گئی۔

حیرت انگیز طور پر اس کا جسم پہلے کی طرح نارمل ہو چکا تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات اس کے کپڑے اس خوف ناک آگ میں بھی نہ جلے تھے اور جسم پر جلنے کا کوئی بھی نشان موجود نہ تھا۔

''یہ تمہارے گناہوں کی ہلکی سی سزا تھی اس سے آگے اور بہت سے مرحلے ہیں۔'' خوف ناک صورت شخص بولا۔ اور اسے دوتین بار دوبارہ بھی اذیت سہنا پڑی۔

''مجھے چھوڑ دو مجھے جانے دو۔'' وہ چیختے چیختے رو پڑا۔

''یہاں ایک بار آنے کے بعد واپس کوئی نہیں جا سکتا۔ اب تمہیں ہمیشہ عذاب سہنا ہوگا۔'' خوف ناک صورت شخص بولا۔

اس بار وہ جگہ انتہائی خطرناک زہریلے سانپوں سے بھری ہوئی تھی جو اسے ڈسنے لگے اس کی چیخیں دوبارہ گونجنے لگیں، اسے کئی گھنٹے بدترین اذیت سہنا پڑی۔ پھر جا کر اس کی جان چھوٹی۔ اب وہ دوبارہ اس خوف ناک صورت شخص کے سامنے موجود تھا۔

"یا اللہ مجھے معاف کردے میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی گناہ نہیں کروں گا اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کروں گا، یا اللہ صرف اور صرف مجھے ایک موقع دے۔" وہ رونے لگا گڑگڑانے لگا۔

"نہیں یہ نہیں ہوسکتا یاد کرو، ایسے ہی کبھی کوئی تمہارے سامنے گڑگڑایا تھا مگر تم نے اس کی ایک نہ سنی۔" خوف ناک صورت شخص نے کہا تو اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے عکس گھومنے لگے۔

☆......☆......☆

اس کی زندگی کی کہانی بھی عجیب تھی اس کا نام ذیشان اور تعلق غریب گھرانے سے تھا وہ روشنیوں کے شہر کے ایک پسماندہ علاقے میں رہتے تھے۔ وہ دو بھائی تھے آٹھ سالہ ذیشان اور چار سالہ خاور ان کے والد محمد شریف نام ہی کی طرح کام کے بھی شریف تھے اور ایک ٹیکسٹائل مل میں معمولی ملازم تھے۔ اور ماں عابدہ لوگوں کے گھروں میں برتن دھوتی تھی گھر میں کھانا بمشکل ایک وقت ہی کھانے اور پیوند زدہ پرانے کپڑوں میں گھومتے۔ اس غربت کے باوجود اس کے والدین اپنے بچوں کو پڑھا کر معاشرے کا کارآمد شہری بنانا چاہتے تھے۔ خاور کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا جبکہ ذیشان تعلیم سے دور بھاگتا تھا۔ اسے صرف لڑائی جھگڑے سے دلچسپی تھی۔

"بارہ سال کی عمر میں وہ ایک قریبی پارک میں اپنی عمر سے چند سال بڑے لڑکے سے جا بھڑا اور مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا کچھ فاصلے پر موجود ایک شخص غور سے یہ جھگڑا دیکھ رہا تھا مخالف لڑکے کو پسپا ہوتے دیکھ کر وہ ذیشان کے قریب آیا اور اس کی پیٹھ تھپکی۔" شاباش تم ایک روز ضرور بڑا آدمی بنو گے۔"

ذیشان نے حیرت سے مخاطب کو دیکھا اور یہ پہلا شخص جس نے لڑائی جھگڑے پر اسے سراہا تھا۔ ورنہ گھر پر اس کے والدین اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے اسے ہر وقت ڈانٹتے اور مارتے پیٹتے تھے۔ اور وہ مار پیٹ سے سدھرنے کے بجائے سرکش ہوتا جارہا تھا۔ اس شخص کا نام طاہر تھا۔ وہ اپنے حلیے اور قیمتی لباس سے امیر دکھائی دیتا تھا۔ طاہر سے ملاقات ذیشان کی بربادی کا آغاز تھا۔ پھر ان کے درمیان ملاقاتیں ہونے لگیں وہ ہر ملاقات پر ذیشان کو جیب خرچ کے نام پر اچھی خاصی رقم دیتا۔ اس کی ٹریننگ کا آغاز جیب تراشی اور عورتوں سے پرس چھیننے کے بعد جوان ہونے تک گاڑیاں چھیننے اور ڈکیتی تک جا پہنچا۔

وہ جوان ہوچکا تھا اور پختہ کار مجرم بن چکا تھا۔ ایک بینک ڈکیتی کے دوران سی سی ٹی وی فوٹیج سے پولیس اس کے بارے میں جان گئی وہ ان کے ہاتھ تو نہیں آیا البتہ گھر والوں پر اس کے کرتوتوں کی پول پٹی کھل گئی۔

دوسرے روز جب وہ رات کے اندھیرے میں گھر میں داخل ہوا تو شریف اس کے سامنے گڑگڑایا۔

"بیٹا اب تم جوان ہوچکے ہو اور جوان اولاد پر ہاتھ اٹھانا مناسب نہیں۔ ان تاریک اور خطرناک راستوں پر چلنا چھوڑ دو اس کا انجام برا ہوتا ہے اور اللہ سے سچے دل سے معافی مانگ کر خود کو پولیس کے حوالے کردو۔"

"یہ نہیں ہوسکتا میں سسک سسک کر زندگی نہیں گزار سکتا۔" وہ تیز لہجے میں بولا اور باپ کو ایک طرف دھکیل کر گھر سے نکل گیا باپ کا کمزور دل بیٹے کی بربادی اور سرکشی دیکھ نہ سہہ پایا اور دل دھڑکنا بھول گیا۔

ذیشان گھر سے نکلا اور تاریک راہوں کا مسافر ہوگیا۔ وقت کبھی رکتا نہیں یہ اس تیزی سے گزرتا ہے کہ کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس روز وہ نصف شب کے قریب شہر کے ایک پوش علاقے میں احاطے کی دیوار پھلانگ کر جا گھسا۔ چوکیدار کے منہ میں کپڑا باندھ کر بے دست و پا کرنے کے بعد وہ بیڈروم میں جا گھسا یہ میاں بیوی اور چار سالہ بچی پر مشتمل فیملی تھی۔ "خبردار کوئی چالاکی مت کرنا ورنہ گولی ماردوں گا۔" وہ میں سال شگفتہ پر پسٹل تانتے ہوئے بولا۔

"شگفتہ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ رہا تھا ایسا لگ رہا تھا ابھی ڈر کے مارے بے ہوش ہو جائے گی اس کے شوہر جمیل کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی اس کی ٹانگیں خوف سے لرز رہی تھیں۔ "جو کچھ تجوریوں میں جمع ہے ہمارے حوالے کر دو۔" طاہر جمیل کی کنپٹی سے رائفل کی نال لگاتے ہوئے بولا۔

"گھر میں صرف ڈیڑھ دو لاکھ کا کیش پڑا ہے۔" جمیل گھبراتے ہوئے لہجے میں بولا اور زیشان نے آگے بڑھ کر پسٹل کا دستہ اس کے سر پر رسید کیا وہ چیختا ہوا گرا اس کے سر سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ "چلو اٹھو۔" زیشان نے اسکے جسم پر ٹھوکر رسید کی مگر وہ ساکت پڑا رہا۔ "یہ مر چکا ہے۔" طاہر کا ایک ساتھی لرزتی ہوئی آواز میں بولا اور زیشان دھک سے رہ گیا۔

وہ قتل و غارت گری سے پرہیز کرتے تھے ویسے بھی انکے چہروں پر ڈھاٹے موجود تھے۔ اس لئے پہچان لئے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ زیشان کے ہاتھوں سے یہ قتل اتفاقاً سرزد ہو چکا تھا اسکے چہرے پر ہوائیں اڑنے لگیں شگفتہ انجام سے بے پرواہ زیشان پر جھپٹ پڑی اور اس کا چہرہ نوچنے کی کوشش کی زیشان کا ڈھاٹا کھل گیا اور چہرہ بے نقاب ہو گیا اسی وقت پولیس موبائل کے ہوٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ عقبی سمت سے بھاگے طاہر اور زیشان سمیت وہ چار افراد تھے۔ اپنی گاڑی تک پہنچتے پہنچتے ان کے دو ساتھی پولیس کی چلائی ہوئی گولیوں کا شکار ہو گئے جبکہ وہ دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے۔ انہوں نے پولیس کو ڈاج دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس پولیس پارٹی کی قیادت ڈی ایس پی دانش کر رہا تھا جو ایماندار فرض شناس اور بہادر پولیس آفیسر تھا۔ ان کی گاڑی ایک ویران علاقے میں داخل ہو چکی تھی اور پولیس بدستور ان کے پیچھے تھی ایک جگہ پولیس موبائل سے فائرنگ کی گئی اور زور دار دھماکے سے ان کی گاڑی کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ گاڑی لہراتی ہوئی ایک درخت سے جا ٹکرائی طاہر کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور وہ ہوش و خرد سے محروم ہو گیا۔ جبکہ زیشان کو معمولی چوٹ آئی وہ گاڑی سے نکل کر ایک طرف بھاگا۔

"رک جاؤ ورنہ گولی چلا دوں گا۔" ڈی ایس پی دانش نے وارننگ دی مگر وہ نہیں رکا۔

اس وقت ایک فائر ہوا اسے ایسا لگا کہ جیسے لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخ اس کی دائیں ٹانگ میں اتر گئی ہو زیشان نے مڑ کر پسٹل سیدھی کی اور DSP دانش پر فائر کرنا چاہا دانش نے اس سے زیادہ تیزی دکھائی پے در پے دو فائر ہوئے دونوں گولیاں اس کے دائیں پہلو میں لگیں وہ چیختا ہوا گرا مگر ہمت کر کے اٹھا اور دوبارہ بھاگا اس کے ذہن میں دھند چھائی جا رہی تھی۔ چند مزید فائر ہوئے اور اس کا پاؤں پھسلا اور وہ چیختا ہوا کھائی میں گرتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

زیشان اپنے گناہوں کو یاد کر کے پشیمان ہو چکا تھا اور دعا مانگ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ "یا اللہ مجھے معاف کر دے میں اب کفارہ ادا کروں گا۔"

میں نے کہا ناں کہ "اب معافی کا وقت گزر گیا ہے تو نے دائیں ہاتھ سے جمیل کو زندگی سے محروم کیا تھا تیری ہی وجہ سے اس کی بیوی اور بچی در بدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہیں۔" اس خوف ناک شخص نے کہا اب اس کے ہاتھ میں ایک لوہے کا کڑا نظر آ رہا تھا۔ جو انگارے کی طرح سرخ تھا اس شخص نے وہ کڑا زیشان کے دائیں ہاتھ میں پہنا دیا۔

زیشان درد اور اذیت سے چیخا اور ایسا لگ رہا تھا کہ کلائی پر جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو اور اس کے ساتھ ہی زیشان کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔

جب زیشان کو ہوش آیا تو وہ ایک جھونپڑی میں پڑا تھا اس کے دائیں پہلو اور ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی قریب ہی ایک ساٹھ ستر سالہ باریش شخص موجود تھا۔ "میں کہاں ہوں اور آپ کون ہیں۔؟" زیشان نے حیرت سے پوچھا۔

بیٹا میرا نام محمد خلیل ہے لیکن لوگ مجھے حکیم بڈھا کہتے تھے کیوں کہ میں حکیم تھا پھر نہ جانے کیا جی میں سمائی کہ میں اس ویرانے میں آ گیا۔ شاید اللہ کو تمہاری زندگی

بجائے منصوبہ تھی۔ تم دو روز بعد ہوش میں آئے ہو۔ میں کھائی کے قریب گھوم رہا تھا کہ کراہنے کی آواز سن کر نشیب میں گیا، وہاں تم کھائی میں پڑے تھے بڑی مشکل سے تمہیں یہاں تک لایا۔ میں نے تمہارے جسم سے گولیاں نکال دیں اور جڑی بوٹیوں کا لیپ تمہارے زخموں پر کر دیا۔

"تم بے ہوش تھے اور بچنے کی امید کم تھی لیکن آج کچھ دیر پہلے تمہاری حالت میں بہتری آنے لگی اور تم ہوش میں آگئے" حکیم نے کہا۔ "پر تم کھائی میں کیسے گرے اور تمہیں کس نے گولیاں ماریں؟"

ذیشان نے اپنی کہانی حکیم کو سنائی۔ "بیٹے تم خوش قسمت ہو، قدرت نے تمہیں صرف متنبہ کر کے نئی زندگی دی اب بہتر یہی ہے کہ اپنی ماں سے معافی مانگو جس کی بیوہ شگفتہ سے معافی مانگو اور کفارہ ادا کرو" حکیم نے کہا۔

"تو کیا وہ عذاب کا فرشتہ میں نے خواب میں دیکھا تھا" ذیشان نے سوچا اسی وقت اس کی نظر اپنی کلائی پر پڑی اور وہ ششدر رہ گیا، وہاں گول دائرہ جیسا نشان بنا ہوا تھا۔ جیسے اس نے واقعی جلتا ہوا کڑا پہنا ہو، وہ ابھی بھوتی نظروں سے جلنے کے نشان کو دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ طویل و عریض ہال نما کمرہ تھا جس کے عین وسط میں ایک دراز قد دیو ہیکل شخص کھڑا تھا۔ وہ صرف جینز پہنے ہوئے تھا اور اس کا اوپری دھڑ برہنہ تھا۔ اس کے بازو اور سینہ کے مسلز کی باڈی بلڈر کی طرح ابھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر ان گنت زخموں کے نشان تھے اس کے سر کے بال بہت لمبے اور گھنے تھے اس کے سر کے بالوں نے اس کا چہرہ نصف سے زائد ڈھانپ رکھا تھا اور اپنے حلیہ سے کوئی ریسلر دکھائی دے رہا تھا۔

ہال کی دیواروں کے ساتھ ساتھ درجنوں انسانی ڈھانچے ایستادہ تھے۔ اور اس ہال کی چھت سے جابجا کنڈے لٹک رہے تھے ان کنڈوں سے پولی تھین کے بڑے بڑے شاپرز میں انسانی جسم کے کٹے پھٹے اعضا موجود تھے اس کے قریب ہی دو کرسیوں پر ڈاکٹروں والے گاؤن میں دو صحت مند نوجوان بیٹھے تھے بلاشبہ اس ہال کا ماحول اس قدر خوفناک تھا کہ اگر عام انسان دیکھ لیتا تو خوف سے بے ہوش ہو جاتا۔ اسی وقت ہال کا دروازہ کھلا اور دو تنومند افراد ایک نوجوان کو گھسیٹتے ہوئے اندر لے آئے اس نوجوان نے بھی ڈاکٹروں والا گاؤن پہن رکھا تھا اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے تاثرات تھے۔

"راول صاحب ہم اسے لے آئے ہیں یہ بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا" ان میں سے ایک اس پہلوان نما شخص سے مخاطب ہوا۔

"اب جبکہ تم ہمارے راز جان چکے ہو تو تمہارے پاس دو آپشن ہیں آپشن نمبر ایک ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ اور عیش و عشرت سے زندگی بسر کرو ورنہ دوسری صورت میں تمہارا جسم بھی ان لاشوں کی طرح ٹکڑوں میں بٹ کر کسی ہک سے لٹک رہا ہوگا" راول سفاک لہجے میں بولا۔

"تت...... تم درندے ہو تم دونوں بھائی ڈاکٹر کے روپ میں شیطان ہو، میں ہرگز تم لوگوں کے گھناؤنے کاروبار کا حصہ نہیں بنوں گا۔ بلکہ یہاں سے جاتے ہی پولیس کو سچ سچ بتا دوں گا کہ تم لوگوں کی اصلیت کیا ہے۔" نوجوان اگرچہ گھبرایا ہوا تھا لیکن نڈر بھی تھا۔

"پولیس کو تم تب کچھ بتاؤ گے جب یہاں سے جاؤ گے" راول کے اشارے پر دونوں تنومند افراد نے اس نوجوان کو دوبارہ پکڑ لیا۔

راول اس کی طرف بڑھا اب اس کے ہاتھ میں سرنج موجود تھی۔ نوجوان نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ انجکشن لگتے ہی وہ ان کی بانہوں میں جھول گیا۔ "اسے آپریشن تھیٹر لے چلو" راول نے سرد لہجے میں کہا اور دونوں تنومند افراد اس نوجوان کو ہال سے باہر لے گئے۔

برسوں پہلے جرائم کی دنیا میں قدم رکھتے ہی وہ باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا اور پھر ایک روز DSP رانا کی گولیوں کا شکار ہو کر کھائی میں جا گرا حکیم کے علاج سے صحت یاب ہوتے ہی وہ وہاں سے روانہ ہو گیا تھا اور اب اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ نجانے اتنے برسوں بعد اس کی ماں

اور بھائی اس گھر میں ہوں گے بھی یا نہیں شاید انہوں نے رہائش تبدیل کرلی ہو۔ ادھر عابدہ گھر کے اندر نماز کے بعد اللہ سے دعا مانگ رہی تھی۔ "یا اللہ میں نے برسوں پہلے ایک بیٹا کھویا تھا اب خاور بھی غائب ہے اپنے پیارے حبیب کے صدقے میرے بیٹے کو مجھ سے ملادے۔" اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

عابدہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو دروازے پر ایک کلین شیو چھریرے بدن کا نوجوان کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ برسوں بعد ماں کے سامنے آیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ماں اسے پہچانے گی بھی یا نہیں۔ وہ اپنے بیٹے کو برسوں بعد دیکھنے کے باوجود پہچان چکی تھی اور بانہیں وا کرکے تڑپ کر آگے بڑھی ہی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی اسے ذیشان کا ماضی یاد آگیا تھا۔

"ماں مجھے معاف کردو۔" وہ عابدہ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا اور عابدہ کا دل پسیج گیا اس نے آگے بڑھ کر ذیشان کو اٹھایا اور اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ بڑا ہی جذباتی منظر تھا برسوں بعد ملنے والے ماں بیٹا دونوں رو رہے تھے کچھ دیر بعد دونوں کی حالت سنبھلی تو کمرے میں آگئے۔

"ماں خاور کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔؟" ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ذیشان نے پوچھا۔

عابدہ اداس ہوگئی۔ "خاور اس شہر کے ایک بڑے اسپتال میں ڈاکٹر تھا چند روز پہلے ڈیوٹی پر گیا مگر پھر واپس گھر نہیں لوٹا اس کا موبائل بھی آف تھا اس کی گمشدگی کے دوسرے روز میں اسپتال گئی وہاں مجھے بتایا گیا کہ خاور نوکری سے استعفیٰ دے کر اسی روز جا چکا تھا میں اکیلی بوڑھی اسے کہاں ڈھونڈتی۔ اس کے قریبی دوستوں سے استفسار کیا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔" عابدہ نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

ذیشان نے ماں سے اسپتال کا ایڈریس لیا خاور کے دوستوں کے نام و پتے پوچھے اور صبح نو بجے اسپتال جا پہنچا یہ شہر کا جدید ترین پرائیویٹ اسپتال تھا۔ عمارت خاصی وسیع و عریض اور ضرورت سے زیادہ صاف ستھری تھی۔ استقبالیہ کمرے میں بھی سجاوٹ کا خاطر خواہ انتظام تھا کاؤنٹر پر کمپیوٹرز اور دیگر مشینوں کے ساتھ ساتھ نقلی پھولوں کے خوبصورت اور دیدہ زیب گلدستے موجود تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے موجود لڑکی کو دیکھتے ہی وہ ششدر رہ گیا وہ شگفتہ تھی وہی شگفتہ جس کے بنگلے میں ڈکیتی کے دوران ذیشان کے ہاتھوں اس کا شوہر جمیل مارا گیا تھا شگفتہ کے سنہری بال چمکتی دمکتی آنکھیں نازک سراپا ماحول کو دلچسپ بنا رہا تھا۔

لیکن ذیشان کی حالت اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر نہیں بلکہ اپنا گناہ یاد کرکے خراب ہوچکی تھی۔

"جی سر میں آپ کی کیا ہیلپ کرسکتی ہوں؟" شگفتہ نے استفسار کیا اور ذیشان سنبھل گیا گویا اس نے ذیشان کو نہیں پہچانا تھا۔ حالانکہ اس روز ذیشان کے چہرے سے نقاب ہٹ گیا تھا۔ شاید جمیل کے صدمے کے زیر اثر وہ ذیشان کا چہرہ بھول گئی تھی۔

اس نے سوچا اور پھر بولا۔ "جی میرا نام ذیشان ہے اور میں اپنے بھائی ڈاکٹر خاور کے بارے میں معلومات کے لئے یہاں آیا ہوں۔ وہ تین روز پہلے اسپتال اپنی ڈیوٹی پر آیا تھا اور اس روز سے آج تک غائب ہے ذیشان نے نگاہیں جھکائے ہوئے جواب دیا۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہورہی تھی کہ اس معصوم لڑکی سے نظریں ملائے جو اس کی وجہ سے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہی تھی۔

"مسٹر ذیشان ڈاکٹر خاور تین روز قبل ڈیوٹی پر آئے ضرور تھے۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر وہ بزائن دے کر اسی روز چلے گئے تھے یہی بات میں آپ کی والدہ کو بھی بتا چکی ہوں۔" شگفتہ نے جواب دیا۔

"مگر اس نے استعفیٰ کیوں دیا آپ بتا رہی ہیں؟ اس نے اسی مہینے اسپتال جوائن کیا تھا اور وہ اپنی ملازمت سے مطمئن تھا۔" ذیشان نے نظریں اٹھا کر کہا۔

وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ آپ ڈاکٹر طالش سے مل لیں وہ اس وقت اتفاق سے اپنے روم میں موجود ہیں۔" شگفتہ

نے سرد لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر طالش کہاں بیٹھتے ہیں؟" ذیشان نے پوچھا۔

"سیکنڈ فلور روم نمبر الیون۔" شگفتہ بولی۔

اب ذیشان کا مزید وہاں رکنا بیکار تھا وہ سیکنڈ فلور روم نمبر الیون کے سامنے جا پہنچا۔ دروازے کے قریب کرسی پر ایک موٹی توند والا پستہ قامت شخص موجود تھا۔ "میرا نام ذیشان ہے اور مجھے ڈاکٹر طالش سے ملنا ہے۔" ذیشان نے کہا۔

یہ سن کر وہ شخص کمرے میں داخل ہو گیا اور دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور اس نے ذیشان کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

شیشے کی خوبصورت میز کے پیچھے ایک صحت مند نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بھی ایک نوجوان موجود تھا۔ دونوں کی شکل ملتی جلتی تھی ذیشان نے اندازہ لگایا وہ دونوں بھائی ہوں گے۔ "میں ڈاکٹر خاور کا بھائی ہوں وہ تین روز پہلے ڈیوٹی پر آیا مگر پھر واپس گھر نہیں پہنچا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس روز ڈاکٹر خاور استعفیٰ دے کر چلا گیا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس نے استعفیٰ کیوں دیا جب کہ وہ اپنی ملازمت سے مطمئن بھی تھا اور اسے اس اسپتال میں ڈیوٹی کرتے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے۔" ذیشان ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مسٹر ذیشان ہم کسی ملازم کے پرسنل معاملات میں مداخلت نہیں کرتے وہ اسی روز استعفیٰ دے کر جا چکا تھا کہاں گیا اور اس نے کیوں استعفیٰ دیا؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ اب تم جا سکتے ہو اور آئندہ اس سلسلے میں یہاں آنے کی زحمت مت کرنا۔" ڈاکٹر طالش سرد لہجے میں بولا۔

"میرا بھائی غائب ہوا ہے اور وہ اس اسپتال میں ملازم تھا یہاں آنے کے بعد وہ کہاں گیا اور اس نے استعفیٰ کیوں دیا کوئی بھی بتانے کو تیار نہیں۔ اس کے بارے میں پوچھنا میرا حق ہے بلکہ میں اسپتال کے مالک سے بھی پوچھوں گا۔" ذیشان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"مسٹر ذیشان یہ اسپتال میرے ڈیڈی کا ہے ان کے بیٹے ہونے کے ناطے ہم بھی یہاں کے مالک ہیں۔" ڈاکٹر طالش نے تند لہجے میں کہا اور میز کے کنارے نصب کوئی بٹن دبا دیا۔

فوراً ہی دو تندرست و تنومند افراد اندر داخل ہوئے۔ "ان صاحب کو باہر کا راستہ دکھاؤ اور ہاں یہ آئندہ اندر نہ داخل ہوں۔" وہ سرد لہجے میں بولا اور وہ دونوں ذیشان کی طرف بڑھے۔

"میرے قریب آنے کی ضرورت نہیں میں خود جا رہا ہوں۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا اور پھر دروازے تک گیا پھر رک کر مڑا۔ "ڈاکٹر طالش یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے ڈر گیا ہوں لیکن میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتا جو قانون کے خلاف ہو۔ میں یہاں سے سیدھا پولیس اسٹیشن جاؤں گا اور تمہیں میرے سوال کا جواب دینا پڑے گا۔" وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

مختلف اسپتالوں سے معلومات کے بعد اس کے دوستوں سے پتہ کرتے کرتے سہ پہر ہو گئی اس کے بعد وہ پولیس اسٹیشن جا پہنچا۔ اسے گرفتاری کا ذرا سا بھی خوف نہیں تھا کہ وہ برسوں بعد اپنے علاقے میں آیا تھا اور دوران وارداتیں وہ ہمیشہ نقاب میں ہوتا تھا۔ صرف جمیل کے گھر ڈکیتی کے دوران اس کا نقاب کھل گیا تھا اور شگفتہ نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا وہاں سے فرار ہوتے ہوئے اس نے دوبارہ چہرے پر نقاب باندھ لیا تھا جب وہ گولیاں لگنے سے کھائی میں گرا تھا تب بھی اس کے چہرے پر نقاب موجود تھا۔

ایک سنتری سے ڈیوٹی آفیسر کا کمرہ پوچھ کر وہ کمرے کے دروازے پر پہنچا کمرے کا دروازہ بند تھا اور اندر سے زور زور سے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے دروازہ دھکیلا دروازہ مقفل نہیں تھا اس لئے کھل گیا۔ وہ حیران پریشان سا اندر داخل ہوا یہ چار پولیس آفیسر تھے جو آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے قریب چند سپاہی کھڑے تھے۔ جب کوئی اچھا پتہ پھینکتا تو وہ تالیاں بجاتے ہوئے داد دیتے۔ پولیس اسٹیشن کا وہ کمرہ اس وقت مچھلی بازار بنا ہوا تھا۔ "سر مجھے اپنے بھائی کی گمشدگی کی

رپورٹ درج کروانی ہے۔'' وہ شائستہ لہجے میں بولا۔
لیکن بھلا اس نقار خانے میں اس کی کون سنتا۔ وہ چند لمحوں تک انہیں پکارتا رہا اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتا رہا لیکن آخر کب تک برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے آخر کار وہ پھٹ پڑا۔ ''میرا بھائی تین روز سے لاپتہ ہے اور میں رپورٹ درج کروانے آیا ہوں اور تم لوگ اپنے فرائض بھول کر تاش کھیلنے میں مصروف ہو یہ ڈیوٹی نبھانے کا کونسا طریقہ ہے۔؟''

سب انسپکٹر رینک کا ایک آفیسر اپنے ہاتھ میں موجود تاش کے پتے پھینک کر غصے سے اٹھا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے سینے پر بیج لگا تھا جس پر نیاز علی لکھا تھا۔ ''تو تم ہمیں قانون سکھاؤ گے۔'' وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سر میں بہت پریشان ہوں میرا بھائی گزشتہ تین روز سے لاپتہ ہے۔'' ذیشان نے اپنی بات دہرائی اور نیاز علی اپنی میز کی طرف آیا۔

''کیا نام ہے تمہارے بھائی کا؟''

''ڈاکٹر خاور۔''

''تمہارے بھائی کی کسی سے دشمنی تو نہیں، ہو سکتا ہے کسی لڑکی کا چکر ہو۔؟'' نیاز علی نے پوچھا۔

''نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں۔'' ذیشان بولا۔ اور تفصیل سے بتایا کہ اس کا بھائی فلاں اسپتال میں ڈیوٹی کرتا تھا اور تین روز پہلے ڈیوٹی پر گیا جب واپس نہیں لوٹا تو ذیشان اس کا پتہ کرنے اسپتال گیا جہاں ڈاکٹر طالش نے اسے بے عزت کر کے اسپتال سے نکلوا دیا۔

وہ ایف آئی آر میں ڈاکٹر طالش کا نام لکھوانا چاہتا تھا۔ ''تمہارا دماغ تو درست ہے ڈاکٹر طالش کوئی معمولی آدمی نہیں سیٹھ داور کا بیٹا ہے جو بہت ہی بااثر شخصیت ہے۔'' نیاز علی نے اپنی مونچھیں مروڑتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں کیا سیٹھ داور اور اس کے بیٹے قانون سے بالاتر ہیں۔'' ذیشان استہزائیہ لہجے میں بولا ان کے درمیان تند و تلخ جملوں کا تبادلہ ہونے لگا دیگر پولیس اہلکار بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

اسی وقت دروازے سے ایک ڈی ایس پی اندر داخل ہوا نیاز علی سمیت دیگر اہلکاروں نے اسے سیلوٹ کیا DSP کی نظریں ذیشان پر جمی ہوئی تھیں ذیشان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا یہ DSP دانش تھا۔ جس نے پولیس مقابلے میں ذیشان کو زخمی کیا تھا اور وہ کھائی میں جا گرا تھا اگرچہ DSP اس وقت ذیشان کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا لیکن ہر مجرم کے دل میں ایک ڈر ہوتا ہے کہ وہ پہچان لیا جائے گا وہی ڈر ذیشان کے دل میں بھی پیدا ہو چکا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے۔؟'' دانش نے ذیشان کی طرف دیکھا۔

''سر یہ میرے بھائی کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھ رہے۔'' ذیشان نے کہا اور اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''نیاز علی اس کی رپورٹ لکھو۔؟'' DSP دانش نے حکم دیا۔

''لیکن سر؟ یہ ڈاکٹر طالش پر شک کا اظہار کر رہے ہیں۔'' نیاز نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوا تم رپورٹ لکھو اس کیس کی تفتیش میں خود کروں گا۔ سچائی خود ہی سامنے آ جائے گی۔'' دانش کے واضح حکم پر اس نے خاموشی سے رپورٹ لکھی اور ذیشان DSP کا شکریہ ادا کر کے پولیس اسٹیشن سے باہر نکل گیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ DSP نے اسے نہیں پہچانا۔ پولیس کی تفتیش کی گاڑی اپنے روایتی انداز میں چل رہی تھی وہ خاور کا سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے۔ ڈی ایس پی اسپتال میں جا کر تفتیش کر چکا تھا۔ وہ ڈاکٹر طالش سے بھی ملا تھا۔ اور طالش کے بھائی ڈاکٹر سہیل سے بھی پوچھ گچھ کی تھی مگر اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

ادھر ذیشان بھی بھائی کی تلاش میں ناکام رہا تھا۔ وہ جرائم کی راہ چھوڑ چکا تھا گھر کا خرچہ چلانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اس نے زندگی میں پہلی بار محنت سے کمانے کا سوچا ارادے نیک ہوں تو انسان منزل تک پہنچ ہی جاتا ہے وہ ایک فیکٹری میں ملازم ہو گیا ایک دن

نصف شب کے قریب جب وہ گہری نیند میں تھا اسے وہی خوف ناک صورت دیو ہیکل شخص دکھائی دیا جس نے اسے اذیت اور عذاب سے دوچار کیا تھا۔

"تم نے اب تک جمیل کے خون کا کفارہ ادا نہیں کیا جلدی کرو تمہارے پاس وقت کم ہے اتنا سوچ لو کہ اگر تم نے کفارہ ادا نہیں کیا تو لوٹ کر میرے پاس ہی آؤ گے۔" اس کی خوف ناک آواز سن کر وہ جاگ اٹھا۔ خوف اور ڈر کے باعث سردی کے موسم میں بھی اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ قبریا کھائی میں پیش آنے والے واقعات کو اس کا دماغ سچ سمجھنے کو تیار نہیں تھا لیکن کلائی پر ثبت کڑے کا نشان اسے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ اس روز اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ سچ تھا۔

یہ کیا بھید تھا۔ آج تک وہ سمجھ نہیں پایا تھا وہ خوف کے باعث دوبارہ سو نہیں سکا اور رات بھر جاگ کر رہا۔ اس نے سوچا تھا کہ صبح ہوتے ہی اسپتال جا کر شگفتہ سے ملے گا اور سچ بتانے کے بعد یہ فیصلہ اس پر چھوڑ دے گا کہ چاہے تو وہ اسے معاف کر دے یا قانون کے حوالے کر دے لیکن انسان سوچتا کچھ اور ہے اور اس کے مقدر میں لکھا کچھ اور ہوتا ہے۔

صبح وہ ناشتہ کر کے گھر سے نکلا ارادہ اسپتال جانے کا تھا۔ ویسے بھی اتوار کا روز تھا اور اس کی چھٹی تھی وہ اسٹاپ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا کہ مخالف سمت سے آنے والی مزدا سڑک کی دوسری طرف رکی اس میں سے ایک لڑکی اتری تو وہ چونک گیا یہ شگفتہ تھی جس سے ملنے اور معافی مانگنے کی غرض سے وہ جا رہا تھا شگفتہ نے سڑک پار کرنے کے لئے قدم آگے بڑھائے اسی وقت اچانک ایک طرف سے تیز رفتار فراری نمودار ہوئی فراری کی ڈرائیونگ سیٹ پر اسمارٹ سی لڑکی موجود تھی۔ اس کی نظر بھی شگفتہ پر پڑ چکی تھی۔ بریکوں کی چرچراہٹ سے گونج اٹھی لڑکی نے بروقت بریک لگائے تھے اس کے باوجود بھی فراری شگفتہ سے ٹکرائی اور شگفتہ چیختی ہوئی تارکول کی پختہ سڑک پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

زیشان سڑک پر گری شگفتہ کی طرف دوڑا ارد گرد موجود دوسرے افراد بھی جائے حادثہ پر پہنچ چکے تھے۔ شگفتہ کا سر سڑک سے ٹکرایا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

فراری کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ماڈرن لڑکی جس نے اسکن ٹائٹ جینز پر ہاف آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی گھبرا گئی اور موقع سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ مگر زیشان اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا اس نے چشم زدن میں فراری کا ڈرائیونگ سائیڈ والا دروازہ کھولا اور اس خوبصورت لڑکی کو بازو سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی، مجھے ہاتھ لگانے کی۔" لڑکی چراغ پا ہو گئی۔

"میڈم یہ لڑکی تمہاری گاڑی سے ٹکرائی ہے تمہارا فرض بنتا ہے کہ اسے اسپتال پہنچاؤ نہ کہ موقع سے بھاگنے کی کوشش کرو۔" زیشان طیش میں آ گیا۔

"غلطی اسی کی ہے جو اچانک میری گاڑی کے سامنے آ گئی تھی۔" وہ لڑکی بدستور غصیلے لہجے میں بولی۔ زیشان نے فراری کا دروازہ کھولا اور سڑک پر بے ہوش پڑی شگفتہ کو پچھلی نشست پر لٹا کر اس مغرور لڑکی کو ڈرائیونگ سیٹ پر دھکیل کر خود بھی اس کے برابر جا بیٹھا۔ "چلو اسے جلدی سے اسپتال پہنچاؤ۔"

"اگر میں ایسا نہ کروں تو؟" مغرور لڑکی نے اسے دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

"تو میں مجبوراً تمہیں فراری سے باہر دھکیل کر خود ہی اسے اسپتال پہنچا دوں گا۔"

"اس کا انجام جانتے ہو؟"

"کسی انسانی زندگی کو بچانے کے لئے میں ہر انجام بھگتنے کے لئے تیار ہوں اب وقت ضائع مت کرو اور گاڑی چلاؤ۔"

وہ لڑکی اسے چند لمحے غصے سے دیکھتی رہی پھر گاڑی آگے بڑھا دی کچھ دیر بعد وہ اسپتال کے باہر موجود تھے زیشان نے عقبی نشست سے شگفتہ کو اٹھایا اور ایمرجنسی تک جا پہنچا۔ شگفتہ کو ایمرجنسی وارڈ میں منتقل کر کے وہ ہال میں رکھی ایک کرسی پر جا بیٹھا چوٹیں زیادہ گہری نہیں تھیں صرف سر پر لگنے والی چوٹ کے باعث شگفتہ زخمی

اور بے ہوش ہو گئی تھی۔ باقی جسم پر معمولی چوٹیں تھیں کیونکہ وہ جس وقت فراری سے ٹکرائی اس وقت گاڑی رک چکی تھی چند ہی گھنٹوں میں اس کی حالت بہتر ہو چکی تھی اور اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا شگفتہ نے بے تاثر لہجے میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اسپتال سے باہر آ گئی۔

"میں آپ کو گھر تک پہنچا آتا ہوں" زیشان نے کہا۔"

"نہیں میں خود ہی چلی جاؤں گی۔" شگفتہ بولی۔
مگر ذیشان نے اصرار کر کے رکشہ روکا۔

شگفتہ کا اپارٹمنٹ ایک متوسط علاقے میں تھا۔"
ذیشان صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔" اس نے رکشہ سے اترتے ہوئے کہا۔

"اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے یہ تو میرا فرض تھا۔" ذیشان اس کے قریب آ کر بولا اس نے رکشہ ڈرائیور کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا تھا اس کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ شگفتہ کو سچائی سے آگاہ کر دے۔

"مس شگفتہ شاید آپ مجھے نہیں پہچان سکیں میں وہی ذیشان ہوں جس کے ہاتھوں اتفاق سے جمیل۔"
ابھی وہ اتنا ہی بولا تھا کہ شگفتہ نے ہاتھ کے اشارے سے مزید بولنے سے روکا۔ "میں پہلے ہی دن آپ کو پہچان گئی تھی جب آپ ڈاکٹر خاور کو تلاش کرتے ہوئے اسپتال آئے تھے اگر میں چاہتی تو اسی روز آپ کو پولیس کے حوالے کر دیتی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا جانتے ہوں کیوں؟"

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر قدرے توقف سے بولی۔ "میں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا وہی بہتر انصاف کرنے والا ہے۔" یہ سن کر ذیشان کانپ اٹھا۔

"نہیں خدا کے لئے یا تو مجھے معاف کر دو یا پھر قانون کے حوالے کر دو میں اب بدل چکا ہوں اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"مسٹر ذیشان جانتے ہو تمہارے اس ظلم سے ہم پر کیا گزری جمیل کے مرتے ہی اس کا بھائی خلیل جمیل کے کاروبار اور مال و دولت پر قابض ہو گیا میری بیٹی رخسار صرف تین سال کی ہے ہم دونوں ماں بیٹی بے گھر ہو گئیں اور میں نے اسی اسپتال میں ملازمت کر لی اور یہاں کرائے پر اپارٹمنٹ لے لیا۔" وہ بولی اور پھر اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھنے لگی ذیشان نے دوبارہ اس کی راستہ روکا۔ "پلیز! شگفتہ مجھے معاف کر دو میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔"

"کیا اس سے جمیل لوٹ آئے گا رخسار کو اس کا باپ مل جائے گا۔" شگفتہ تلخ لہجے میں بولی اور اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھی۔

ذیشان مڑا اور تھکے تھکے انداز سے ہارے ہوئے جواری کی طرح ایک طرف چلنے لگا۔ شگفتہ نے اسے معاف کرنے سے انکار کر دیا تھا وہ اپنی جگہ درست بھی تھی ذیشان کی وجہ سے وہ دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور تھی۔

وہ سوچوں میں گم اردگرد سے بے خبر سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ اچانک ٹھٹک کر رک گیا وہ دو گاڑیاں تھیں جنہوں نے اچانک اسے گھیر لیا تھا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا نصف درجن مسلح افراد اسے گھیرے میں لے چکے تھے ان کے ہاتھوں میں جدید طرز کی آٹومیٹک رائفلیں موجود تھیں۔ "کون ہو تم؟ اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" ذیشان نے بے خوفی سے پوچھا۔

"تمہیں سوال و جواب کی اجازت نہیں خاموشی سے گاڑی میں بیٹھو۔" ایک رائفل بردار غرایا اسے رائفلوں کی زد میں دھکیل کر ایک گاڑی میں دھکیل دیا گیا پھر گاڑیاں چل پڑیں پچھلی نشست پر اس کے دائیں بائیں دو رائفل بردار چوکنے بیٹھے تھے ایک رائفل بردار ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جب کہ ان کے پیچھے بھی ان کے مسلح ساتھی آ رہے تھے۔

ذیشان خالی ہاتھ تھا۔ ایسی سچویشن میں مزاحمت بہادری نہیں بے وقوفی کہلاتی ہے لیکن یہ مسلح افراد کون ہیں اور اسے اغوا کر کے کہاں لے جا رہے ہیں اس قسم کے کئی سوالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ پھر اس نے یہ سوچ کر ذہن کو آزاد کر دیا کہ جو ہو گا۔ دیکھا جائے گا۔ گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

چند کلومیٹر کے بعد گاڑی کچے میں اتری اور تھوڑی آگے جا کر ایک وسیع و عریض عمارت کے سامنے جا رکی۔ یہ تقریباً دو ایکڑ کے رقبے پر مشتمل فارم ہاؤس تھا۔ احاطے میں گاڑیاں رک رہی تھیں، دو افراد اسے لئے ہوئے آگے بڑھے جب کہ دوسرے وہیں کھڑے رہ گئے وہ طویل احاطے سے ہوتے ہوئے جیسے ہی برآمدے میں پہنچے زیشان کے پاؤں کو ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر گرنے لگا ایک رائفل بردار نے بے اختیار اسے سہارا دینے کے لئے اپنا بائیاں ہاتھ آگے کیا یہی اس کی غلطی تھی۔

زیشان جان بوجھ کر لڑکھڑایا تھا ویسے بھی اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر وہ اس کی طرف سے غافل ہو چکے تھے اور دونوں کی رائفلوں پر گرفت کمزور ہو چکی تھی زیشان کا ایک ہاتھ سہارا دینے والے رائفل بردار کی رائفل پر پڑا اگلے ہی پل وہ رائفل بردار اس کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک طرف جا گرا۔ دوسرے نے زیشان کی طرف رائفل سیدھی کی ہی تھی کہ وہ بجلی کی سی سرعت سے ایک پاؤں کی ایڑی پر گھوما اور دوسرے پاؤں کی ٹھوکر اسکے ہاتھوں پر رسید کی اس کے ہاتھ سے بھی رائفل نکل گئی اب وہ دونوں زیشان کے نشانے پر تھے اور اس کے رائفل پکڑنے کے انداز سے سمجھ چکے تھے کہ مقابل بھی ان سے کم نہیں۔ "اب بتاؤ تم لوگ کون ہو؟ اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔" زیشان غرایا۔

مگر وہ جواب میں خاموش رہے ان کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ زیشان کی پشت پر کسی کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے مڑنا چاہا اسی وقت ایک سرد نال اس کی گردن کی پشت سے آ لگی۔ اور ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "رائفل پھینک"

زیشان نے رائفل ایک طرف پھینکی اسے یہ آواز شناسا لگ رہی تھی۔ "اب میری طرف مڑو۔" اسی آواز نے کہا۔

"وہ پیچھے مڑا اور ششدر رہ گیا یہ وہی لڑکی تھی جس کی فراری سے ٹکرا کر شامت آ گئی تھی دونوں رائفل بردار اپنی رائفلیں سنبھال چکے تھے لڑکی نے اپنا پسٹل بیلٹ میں اڑسا اور رائفل برداروں سے کہا۔ "اب تم دونوں جاؤ۔" رائفل بردار سر جھکائے احاطے میں چلے گئے

"ویری گڈ تم واقعی بہادر ہو میرے دونوں آدمیوں کو خالی ہاتھ لمحوں میں زیر کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔"

"مجھے اس طرح یہاں تک لانے کا مقصد کیا؟ تم اس دن والے واقعہ کا بدلہ لینا چاہتی ہو؟"

زیشان نے اپنی نگاہیں اس پر جماتے ہوئے پوچھا۔

"اگر تم سے بدلا لینا مقصود ہوتا تو اس وقت تم اپنی ٹانگوں پر صحیح سلامت میرے سامنے نہیں کھڑے ہوتے اور اس وقت بھی اگر میں نہ چاہتی تھی تو میری مرضی کے خلاف مجھے اسپتال جانے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے میں کوئی مڈل کلاس کی عام لڑکی نہیں سیٹھ داور کی بیٹی سونیا ہوں۔"

سیٹھ داور کا نام سنتے ہی زیشان کو جھٹکا لگا گویا سونیا ڈاکٹر طاش کی بہن تھی جس پر زیشان کو شبہ تھا کہ اسی نے خاور کو غائب کیا ہے لیکن سونیا کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ اس سے کیا چاہتی تھی۔ اگر بدلا لینا مقصود نہیں تھا تو اسے اس کے کارندوں نے یہاں تک گن پوائنٹ پر کیوں لائے تھے۔ اس نے اپنا یہی سوال دہرایا۔

"زیشان میں کوئی مڈل کلاس لڑکی نہیں۔ جو اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے شرماؤں اور دوپٹہ منہ میں ڈال کر سر جھکا لوں۔ میں نے لندن کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی ہے میرے ڈیڈی مجھے بہت چاہتے ہیں میں جس چیز کی خواہش کروں مجھے منٹوں میں مل جاتی ہے سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں پہلی نظر میں ہی تمہیں پسند کر لیا تھا۔ تم بہت لکی ہو زیشان، میں تمہیں چاہتی ہوں مجھ سے شادی کے بعد مال و دولت تمہارے قدموں میں ہوگا اور یہ بھی جان لو کہ میں جو چیز پسند کر لوں اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتی ہوں۔" اس کے الفاظ سے زیشان بھونچکا رہ گیا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے میں کوئی بے جان چیز نہیں جسے پسند آنے پر تم بازار سے خرید لو میں جیتا جاگتا انسان ہوں میری بھی خواہشات ہیں سچی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے پسند نہیں۔" وہ ناگوار لہجے میں بولا۔

"کیوں مجھ میں کیا کمی ہے میں خوبصورت نہیں؟ یا تم کسی اور کو چاہتے ہو۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"تمہارے یہ دونوں انداز سے درست نہیں ضروری نہیں کہ پیار اور عشق خوبصورتی اور دولت دیکھ کر کیا جائے اور نہ ہی پیار کوئی کھلونا ہے جسے تم جب چاہے بازار سے خرید لو یا زبردستی حاصل کر لو پیار محبت جبر اور زبردستی سے نہیں حاصل کیا جاتا۔" زیشان نے کہا۔

"دیکھتی ہوں تم کیسے نہیں مانتے ایک روز تم خود اپنے منہ سے کہو گے سونیا I Love You اور یہ بھی یاد رکھو کہ میں مر کر بھی تم سے دور نہیں رہ سکتی مرنے کے بعد بھی میری روح تمہاری متلاشی رہے گی۔"

وہ اسے بار ربائی بارہ کے ایک آراستہ کمرے میں لے آئی زیشان اس کے اشارے پر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ بیڈ کے قریب ہی کرسی رکھی تھی وہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے زیشان کے ساتھ جڑ کر بیٹھی تو اسے سردی میں بھی پسینے آنے لگے۔ "اب دیکھتی ہوں ہم کیسے بچو گے۔" اس نے اپنے تپتے ہونٹ زیشان کے گال سے رگڑے تو زیشان گھبرا کر پرے کھسکا۔ خالی کمرے میں جوان اور خوبصورت لڑکی کا ساتھ جو خود بھی شرارت پر مائل تھی اسے اپنی سلامتی خطرے میں نظر آ رہی تھی اس کا ماضی اگرچہ داغدار تھا لیکن وہ عہد کر چکا تھا کہ آئندہ گناہ کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا اور پھر اسے متنبہ بھی کیا گیا تھا کہ "اگر وہ اپنے عہد سے پھرا یا گناہ دوبارہ کیا تو پھر اسے کہیں جائے امان نہیں ملے گی۔"

"لگتا ہے گنگا الٹی بہنے لگی ہے شرمانا مجھے چاہئے اور شرما تم رہے ہو۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی اور اس سے لپٹ گئی زیشان کے جسم میں اس کے بدن کی حرارت سے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا اس نے سونیا کو ایک طرف دھکیلا اور بیڈ سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

"پلیز! مجھ سے دور رہو۔ یہ گناہ ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ سونیا کے قرب نے اس کے جذبات بھی منتشر کر دیے تھے وہ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا سکا تھا۔

اسی وقت سونیا کے موبائل فون کی بیل بجی اس نے شولڈر بیگ میں سے موبائل فون نکالا اور کال ریسیو کی۔ یہ سیٹھ داور کی کال تھی۔ "سونیا کہاں ہو تم۔؟" دوسری سے طرف سے سیٹھ داور نے پوچھا۔

"ڈیڈی میں فارم ہاؤس میں ہوں۔"

"کب تک آؤ گی۔"

"ڈیڈی بس یہاں سے نکلنے ہی والی ہوں۔" سونیا بولی اور کچھ دیر باتوں کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

"تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔" سونیا کمرے سے باہر نکلی کچھ دیر بعد واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں شیمپین شراب کی یہ قسم اعلیٰ ترین اور بیش قیمت ہوتی ہے دو شیشے کے گلاس اور منرل واٹر کی چھوٹی بوتل بھی اس نے ایک گلاس میں پیگ تیار کیا زیشان کے لئے دوسرے گلاس میں پیگ بنانے لگی تو اس نے منع کر دیا وہ پہلا پیگ ایک ہی سانس میں پی گئی اور پھر دوسرا پیگ بنانے لگی زیشان نے دیکھا شراب پیتے ہی سونیا کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ "تم بھی پیو ناں۔" وہ بہکی بہکی آواز میں بولا۔

"میں شراب نہیں پیتا یہ حرام ہے۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولا پھر قدرے توقف سے پوچھا "تمہارے ڈیڈی تمہیں شراب پینے سے نہیں روکتے۔؟"

"وہ بھی" اور ہنسی چلی گئی۔ "پاگل ہماری سوسائٹی میں شراب پینا فخر سمجھا جاتا ہے اور جوان اولاد کے نجی معاملات میں والدین مداخلت نہیں کرتے اب سیدھی طرح مان جاؤ ورنہ......" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی اور دوبارہ اس سے جڑ کر بیٹھ گئی۔

وہ دوبارہ کھسکا۔ "سنو سونیا تم میرے بارے میں نہیں جانتی میں کون ہوں۔" زیشان نے کہا اور اپنی روداد سنا ڈالی وہ ہنسی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔ "زیشان کیوں بچوں والی کہانی سنا رہے ہو بھلا کبھی کوئی مر کر بھی زندہ ہوا ہے۔ رہی تابش بھائی کی بات تو تابش بھائی اور سہیل بھائی مجھے بہت چاہتے ہیں۔ اور میں ڈیڈی کی بھی چہیتی ہوں بس تم ایک بار ہاں کر دو میں سب

سنبھال لوں گی۔"

"یہ نہیں ہوسکتا سونیا۔ مجھے شبہ ہے کہ تمہارے بھائی کوئی غیر قانونی کام کررہے ہیں جبکہ میں جرائم سے توبہ کرچکا ہوں۔"

ان فضول باتوں کو چھوڑو ذیشان ایمانداری کی زندگی میں کیا رکھا ہے میں اپنے باپ اور بھائیوں کے بارے میں سب جانتی ہوں یہ جو میرے محافظ اس عمارت میں موجود ہیں یہ بھی میرے بھائی کے کارندے ہیں۔

اب میں چلوں گی ڈیڈی نے بلایا ہے کوئی ضروری کام ہے جب تک تم اچھی طرح سوچ لو۔ لیکن اتنا یاد رہے اگر تم نہیں بھی مانے تو تب بھی میں مر کر بھی تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" سونیا نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی اور پھر مڑ کر بولی۔ "تم یہاں قیدی نہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو گارڈ روم میں کھڑے قادر سے کہنا لیکن یہاں سے نکلنے کا سوچنا بھی مت اس عمارت میں چاروں طرف مسلح پہرے دار ہیں۔" یہ بول کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور ذیشان کو ایک نئی فکر لاحق ہوگئی تھی وہ عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا وہ امیر زادی زبردستی اسے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اسے سونیا سرپھری اور نفسیاتی مریضہ معلوم ہورہی تھی۔ "ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں جو ارادہ کرلیں اسے ضرور پورا کرتے ہیں۔ اس نے سوچا۔"

اس عمارت میں نصف درجن سے زائد مسلح افراد موجود تھے اور پھر واپس لوٹنے کے بعد سونیا اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرتی اگر وہ اس کی بات مان لیتا تو یہ عہد شکنی ہوتی اور پھر اسے اپنے بھائی قادر کو تلاش کرنا تھا اور پھر جمیل کے خون کا کفارہ بھی ادا کرنا تھا۔ وہ ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اضطراب بڑھتا جارہا تھا کچھ دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلا۔ کوریڈور میں ایک رائفل بردار کھڑا تھا جس کا نام سونیا نے قادر بتایا تھا۔ "قادر مجھے چائے کی طلب ہورہی ہے اور اگر بسکٹ بھی مل جائے تو بہتر ہے۔" ذیشان نے کہا اور قادر اثبات میں سر ہلا کر ایک طرف چل دیا جبکہ وہ دوبارہ کمرے میں لوٹ آیا۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد قادر ایک چھوٹی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوا، ٹرے میں چائے اور بسکٹ موجود تھے اس کی رائفل شانے سے لٹک رہی تھی غالباً وہ ذیشان کی طرف سے مطمئن تھا کہ ذیشان کبھی بھی اس سے الجھنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ عمارت میں نصف درجن مسلح پہرے دار موجود تھے اور پھر یہ عمارت بائی دے سے بھی بہت دور تھی قادر کا اطمینان اسے لے ڈوبا۔

ذیشان کا ہاتھ کسی کلہاڑی کی طرح اکڑا اور قادر کی کے گلے پر پوری قوت سے پڑا کڑاک کی آواز کے ساتھ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی یہ کنگ فو کا مہلک ترین وار تھا۔ قادر کا بے جان جسم کٹے ہوئے شہتیر کی مانند گرنے لگا ذیشان نے آگے بڑھ کر اسے تھاما اور بیڈ پر لٹادیا ٹرے گرنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی لیکن جب کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے قادر کا جسم بے لباس کیا اس کے کپڑے خود پہنے اور اپنے کپڑے اسے پہنادیے پھر قادر کی اجرک اپنے شانوں پر ڈالی اور رائفل اٹھا کر کمرے سے باہر نکلا وہ کسی چیتے کی طرح چوکنا تھا وہ دیوار کے ساتھ ساتھ کرالنگ کرتا ہوا احاطے میں جا پہنچا کچھ دور ہی گیا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا اس طرف دو مسلح افراد کھڑے باتیں کررہے تھے۔

وہ ایک درخت کی آڑ میں ہوگیا اور کچھ دیر بعد رخ بدل کر دوسری سمت سے آگے بڑھا اس طرف روشنی کم تھی وہ احاطے کی دیوار تک پہنچ چکا تھا دیوار کی بلندی تقریباً سات یا آٹھ فٹ تھی وہ پنجوں کے بل اچھلا اور کسی بندر کی طرح اچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔

اچانک کہیں سے اس پر سرچ لائٹ کی روشنی پڑی اور کسی نے للکارا۔ "اے کون ہے ادھر...؟"

اب سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا وہ دیوار سے کود کر ایک طرف بھاگنے لگا یہ ریتیلا علاقہ تھا کہیں کہیں ریت کے ٹیلے بھی تھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی ریگستان میں بھاگ رہا ہو کچھ دیر بعد اسے اپنے عقب میں

دوڑنے کی آواز سنائی دی گویا سونیا کے محافظ اس کے پیچھے لگ چکے تھے اور غالب امکان یہ تھا کہ وہ قادر کی لاش بھی دیکھ چکے ہوں گے اگر وہ سونیا کے ڈر سے اسے نہیں مارتے تو زخمی ضرور کر دیتے ذیشان ان کے ہاتھ نہیں لگنا چاہتا تھا۔ اب عقب میں گاڑی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ایسے وقت بھاگنا مناسب نہیں تھا وہ کسی بھی وقت ان کی نظروں میں آ سکتا تھا اس نے بہتر یہی سمجھا کہ ایک ٹیلے کی آڑ میں مورچہ زن ہو جائے۔

کچھ دیر بعد گاڑی سامنے آ گئی یہ بڑے ٹائروں والی جیپ تھی۔ جو ٹیلے سے کچھ فاصلے پر رکی اور اس میں سے تین رائفل بردار اترے۔ "وہ یہاں کہیں ہوگا اتنی جلدی دور نہیں جا سکتا میڈم کے آنے سے پہلے اسے تلاش کرو ورنہ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گی۔" ایک آواز سنائی دی۔

دو افراد دائیں طرف نکل گئے جبکہ تیسرا اس ٹیلے کی طرف آنے لگا جس کی آڑ میں ذیشان مورچہ زن تھا۔ ذیشان تذبذب میں مبتلا ہو گیا اگر وہیں چھپا رہتا تو پکڑے جانے کا خطرہ تھا گولی چلانے میں بھی رسک تھا کہ مخالف اس کی پوزیشن سے آگاہ ہو جاتے ادھر وہ رائفل بردار اس کے قریب آتا جا رہا تھا، ذیشان نے گن فائرنگ پوزیشن میں کی اور نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا گن سنگل شاٹ موڈ پر تھی فائر کا ہولناک دھماکہ ہوا اور گولی رائفل بردار کے سینے میں لگی وہ چیختا ہوا گرا اور تڑپنے لگا۔

ذیشان فائر کرتے ہی رول کرتا ہوا دوسرے ٹیلے کی آڑ میں ہو چکا تھا۔ یہ اس نے بہتر ہی کیا تھا کیوں کہ فوراً ہی اس ٹیلے پر مختلف سمتوں سے برسٹ مارے گئے پھر خاموشی چھا گئی اس کے مخالف ادھر ادھر دبک چکے تھے۔

ذیشان کے پاس وقت کم تھا۔ اس نے سونیا کے آنے سے پہلے یہاں سے نکلنا تھا۔ کچھ دیر بعد ذیشان نے قریب پڑا پتھر اٹھایا اور ایک طرف اچھال دیا پتھر کے گرنے سے آواز پیدا ہوئی ان میں سے ایک نے آواز کی سمت فائر کیا ایسا کرتے وقت اس کے جسم کا کچھ حصہ سامنے آ چکا تھا ذیشان کی رائفل سے نکلنے والی گولی اس کے دائیں پہلو میں لگی اس کا ایک حریف مزید کم ہو چکا تھا اور وہ فائر کرتے ہی پوزیشن تبدیل کر چکا تھا اب اس کے مقابل دو افراد بچے تھے جو اس سے خوف زدہ ہو چکے تھے وہ جسے تر نوالہ سمجھے تھے وہ ان کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوا تھا کچھ دیر بعد ذیشان کرالنگ کرتا ہوا لمبا چکر کاٹ کر دوسری طرف سے ان کی پشت پر جا پہنچا آہٹ سن کر وہ مڑے ہی تھے کہ پے در پے کئی فائر ہوئے گولیوں نے ان دونوں کی ٹانگوں کو شدید زخمی کر دیا تھا رائفلیں ان کے ہاتھوں سے گر چکی تھیں اور وہ تڑپ رہے تھے۔ اب خاموشی سے اسی جگہ لیٹے رہنا ذیشان نے انہیں حکم دیا اور ان کی رائفلیں اٹھا کر ایک طرف پھینک دیں۔

"خاموشی سے ایک طرف پڑے رہنا ورنہ تم دونوں کو بھی تمہارے ساتھیوں کے پاس پہنچا دوں۔" وہ سانپ کی طرح پھنکارا اور جیپ کی طرف بڑھا چابیاں جیپ میں ہی موجود تھیں وہ جیپ کے ذریعے ہائی وے پر جا پہنچا۔ پھر تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے جیپ چھوڑ دی اور ایک طرف سے آتے ہوئے ٹرالے کو رکنے کا اشارہ کیا وہ کوئی اچھا انسان تھا ٹرالا اس کے قریب رک گیا۔ "کہاں جانا ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا اور ذیشان نے اسے اپنے علاقے کا نام بتایا۔ "ٹھیک ہے میں تمہیں تمہاری جگہ سے کچھ دور چھوڑ دوں گا۔ وہاں سے کسی ٹیکسی رکشے کے ذریعے گھر پہنچ جانا۔" ڈرائیور نے کہا اور ذیشان ٹرالے میں سوار ہو گیا۔

وہ رات گئے کافی دیر سے گھر پہنچا اس کی ماں عابدہ کافی پریشان تھیں۔ ذیشان نے جھوٹا بہانہ بنا کر اسے مطمئن کیا وہ کافی تھکا ہوا تھا نہا کر سونے چلا گیا۔

صبح ناشتہ کرتے ہوئے عابدہ نے بتایا کہ دن میں ایک خوبصورت لڑکی آئی تھی اور تمہارا پوچھ رہی تھی اس نے اپنا نام شگفتہ بتایا تھا اور کہا تھا کہ تم جیسے ہی گھر آؤ اسے فون کرو۔ وہ اپنا موبائل نمبر دے گئی ہے کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں۔"

عابدہ نے اسے شوخ نگاہوں سے دیکھا اور وہ جھینپ گیا اس کا موبائل فون تو فارم ہاؤس میں چھین

لیا گیا تھا اس نے عابدہ کے موبائل سے شگفتہ کو کال کی دوسری بیل پر ہی کال ریسیو ہو گئی۔ "السلام علیکم میں زیشان بول رہا ہوں۔"

"وعلیکم السلام زیشان صاحب مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے اس وقت تو میں ڈیوٹی پر ہوں آپ شام چھ بجے کیفے ٹیریا میں آجائیں۔" دوسری طرف سے شگفتہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

زیشان وقت سے پندرہ منٹ پہلے کیفے ٹیریا جا پہنچا شگفتہ چھ بج کر دس منٹ پر کیفے ٹیریا میں داخل ہوئی اس نے دروازے سے ہی زیشان کو دیکھ لیا تھا۔

"السلام علیکم۔" زیشان اس کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑا ہوا وہ سلام کا جواب دے کر خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "شگفتہ میں بعد میں آپ کی بات سنوں گا سب سے پہلے آپ کو میری بات سننا پڑے گی میں ایک بھٹکا ہوا انسان تھا غلط صحبت میں پڑ کر لڑکپن ہی سے جرائم کی راہ پر چل نکلا۔ پھر اس نے بتایا کہ "جیل کے غیر ارادی قتل کے بعد اس پر کیا گزری۔" اس نے اپنی کلائی پر گرنے کا جلا ہوا نشان بھی دکھایا پھر بولا۔ "مس شگفتہ میں ہر قسم کا تاوان ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

شگفتہ اس کی روداد سے متاثر نظر آ رہی تھی۔

"زیشان صاحب میں نے مجبوری میں اس اسپتال میں نوکری کی تھی دوران ملازمت مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس اسپتال میں ڈاکٹر کے روپ میں ڈاکو بلکہ یوں کہہ لیں درندے رہتے ہیں یہاں انسان کے جسم سے دل گردے جگر اور آنکھیں نکال کر محفوظ کر لی جاتی ہیں پھر انہیں مارکیٹ میں منہ مانگے داموں فروخت کیا جاتا ہے۔ اور باڈی غائب کر دی جاتی ہے شاید اس اسپتال میں کسی خفیہ جگہ ایسی باڈی کو منتقل کر دیا جاتا ہے یا شاید کسی طریقے سے تلف کر دیا جاتا ہو تاکہ کوئی سراغ نہ ملے۔ وہ شکار کے لئے غریب اور لاوارث لوگوں کو منتخب کرتے ہیں وہ اس قدر چالاک ہیں کہ اپنے جرم کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتے۔ تینوں باپ بیٹے درندے ہیں سیٹھ داور ناجائز اسلحہ کے بیوپاری بھی ہیں اسپتال ایمبولینس میں ناجائز اسلحہ لا کر تہہ خانے میں چھپایا جاتا ہے اور پھر یہاں سے ڈلیوری کی جاتی ہے۔

آپ کے بھائی ڈاکٹر خاور ایک دیانت دار انسان تھے۔ انہوں نے جیسے ہی دیکھا یہاں کیا ہو رہا ہے تو انہوں نے استعفیٰ دیتے وقت ڈاکٹر سہیل اور ڈاکٹر طالش کو دھمکی دی کہ وہ پولیس کو سب کچھ صاف صاف بتا دیں گے۔ پھر میرے سامنے ہی ڈاکٹر طالش کے کارندے ڈاکٹر خاور کو گن پوائنٹ پر اغوا کیا تھا پھر وہ کہاں گئے ان کے ساتھ کیا ہوا میں نہیں جانتی مجھے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر کسی کو کچھ بتایا۔ تو وہ میرے ساتھ ساتھ رخسار کو بھی قتل کر دیں گے میں ڈر کے مارے خاموش تھی لیکن میرا ضمیر مجھے بدستور ملامت کرتا رہا اس روز بھی آپ سے ملنے کے بعد ضمیر کے ملامت کرنے پر میں نے سوچا آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گی میں ان شیطانوں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں آپ کے ساتھ ہوں اگر آپ کہیں تو میں آپ کے ساتھ پولیس اسٹیشن جا کر بیان بھی دے سکتی ہوں۔" وہ بولتی چلی گئی۔

جبکہ زیشان کے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے شگفتہ کے انکشاف نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا "کہیں ان درندوں نے خاور کو بھی۔" یہ سوچتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا وہ لوگ اس قدر سفاک ہوں گے یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا اس مسئلے کا کوئی بھی حل اس کی سمجھ سے باہر تھا وہ جانتا تھا کہ وہ اکیلا ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا وہ بہت خطرناک لوگ تھے اور قانون بغیر ثبوت کے ان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ کافی دیر تک سوچ و بچار کرتا رہا۔

اچانک ایک خیال کے تحت زیشان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میں مریض بن کر اس اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہوں مجھے یقین ہے میں ان کے خلاف کوئی نہ کوئی ثبوت حاصل کر لوں گا۔"

"زیشان پاگل مت بنو وہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور اسپتال میں اگر تم پہچان لئے گئے تو خاور ہی کی طرح

تمہیں بھی غائب کردیا جائے گا۔ شگفتہ نے کہا۔ اس دوران وہ اس سے بے تکلف ہوچکی تھی اپنی بے ساختگی پر وہ جھینپ گئی۔

ذیشان مسکرا اٹھا۔ "انشاء اللہ خدا ہماری مدد کرے گا کیونکہ ہمارے ارادے نیک ہیں اور پھر کسی نہ کسی کو تو ان کے خلاف کچھ کرنا ہوگا اگر وہ شیطان اس طرح آزاد رہے تو نہ جانے ڈاکٹرز کے مقدس پیشے کی آڑ میں کتنے گھر اجاڑیں۔" ذیشان نے کہا وہ کافی دیر تک وہاں بیٹھے رہے اس دوران ذیشان کی نظریں شگفتہ پر جمی رہیں جبکہ وہ بار بار آنکھیں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتی اور پھر پلکیں جھکا لیتی۔

☆......☆......☆

وہ اس اسپتال کا جنرل وارڈ تھا۔ اس وسیع وعریض ہال نما کمرے کے تقریباً ہر بیڈ پر مریض موجود تھے اس وارڈ میں غریب اور مستحق مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا ذیشان بھی اسپتال کے ایک بیڈ پر لیٹا کراہ رہا تھا اس نے اسپتال میں داخل ہوتے وقت پیٹ کے درد کی شکایت کی تھی یہاں آتے ہی اسے نوٹ کیا کہ اس وارڈ میں موجود تمام مریضوں کا تعلق مڈل کلاس طبقے سے تھا ایسے لوگ ڈاکٹر طارق کا آسان شکار ہوتے تھے کچھ دیر پہلے ایک ڈاکٹر مریضوں کا معائنہ کرکے جاچکا تھا۔

شام سات بجے کے قریب مریضوں کے لئے کھانا آگیا تمام مریض ذوق وشوق سے کھانا کھا رہے تھے جبکہ ذیشان نے اپنا کھانا ایک طرف رکھ دیا اس کا ارادہ تھا کہ کچھ دیر بعد نظر بچا کر کھانا ضائع کردے گا۔ گویا ڈاکٹر طارق قربانی کے جانوروں کی طرح ذبح کرنے سے پہلے مریضوں کو خوب کھلا پلا رہا تھا۔ شگفتہ نے ذیشان کو پہلے ہی آگاہ کردیا تھا کہ کسی مریض کو شکار کرنے سے پہلے وارڈ میں موجود تمام مریضوں کو بے ہوش کردیا جاتا تھا کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ وارڈ میں موجود مریض اونگھنے لگے ہیں پھر وہ ایک ایک کرکے ہوش وخرد سے محروم ہونے چلے گئے۔ ذیشان نے اپنا کھانا ضائع کیا اور اس طرح لیٹ گیا جیسے وہ بھی بے ہوش ہوچکا تھا۔

رات دس بجے کے قریب وہ چوکنا ہوگیا اسے اپنے پہچان لئے جانے کا خطرہ نہیں تھا اس کے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی موجود تھی۔

کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے محسوس کیا کہ ایک سے زائد افراد تھے وہ آنکھیں موندے لیٹا رہا اب وہ وارڈ میں داخل ہوچکے تھے۔ "اسے اسٹریچر پر منتقل کرو۔" ایک آواز ابھری۔

ذیشان نے دائیں آنکھ کی جھری سے دیکھا وہ تین افراد تھے ڈاکٹر سہیل اور دو میل نرس انہوں نے بیڈ نمبر سات پر سے بے ہوش صحت مند نوجوان کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا اور وارڈ سے باہر نکل گئے ان کے باہر جاتے ہی ذیشان اٹھا اور تیزی سے باہر نکلا۔

وہ اسٹریچر لئے ہوئے کوریڈور میں تیزی سے چل رہے تھے اور وہ دائیں سمت جانے والی راہداری میں مڑے۔

اسی وقت اس راہداری سے ایک دبلا پتلا ڈاکٹر نمودار ہوا۔

اس سے پہلے کہ اس کی نظر ذیشان پر پڑتی وہ پھرتی سے قریب ہی ایک کمرے میں داخل ہوا۔ یہ کوئی آفس ٹائپ کمرہ تھا خوش قسمتی سے اس وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا یہ بہتر ہی ہوا ورنہ ذیشان مشکل میں پھنس جاتا اس نے دروازے کی جھری سے دیکھا وہ دبلا پتلا ڈاکٹر اسی طرف آرہا تھا گویا یہ آفس اسی ڈاکٹر کا تھا ذیشان دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے چپک گیا ڈاکٹر نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔

ذیشان اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر پہلے ہی نکال چکا تھا ڈاکٹر نے بلب آن کیا ہی تھا کہ ذیشان چیتے کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور ڈاکٹر کی گردن سے بازو لپیٹ کر لاک لگا دیا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کے منہ سے کوئی آواز نکلتی وہ اس کے گلے پر خنجر کی نوک رکھ چکا تھا۔

"خاموشی سے کھڑے رہو ہلنے جلنے یا شور مچانے کی کوشش مت کرنا ورنہ لمحوں میں دھڑ سے تمہارا سر الگ کردوں گا۔" وہ سفاک لہجے میں بولا۔

ڈاکٹر بری طرح خوف زدہ ہوچکا تھا۔ "تمہارا نام؟"

"ڈاکٹر فیصل۔"

"ہاں تو ڈاکٹر فیصل ڈاکٹر سہیل بیڈ نمبر سات کے مریض کو کہاں لے گیا ہے اور اس کا کیا حشر ہوگا۔؟" ذیشان نے پوچھا۔

فیصل نے بتانے میں تامل کیا تو ذیشان نے خنجر کا ہلکا سا دباؤ بڑھا دیا، خنجر کی نوک اس قدر تیز تھی کہ ڈاکٹر فیصل کے گلے سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے۔ "خدا کے لئے مجھے مت مارو میں مجبوراً ان کے گناہوں میں شریک ہوا ہوں انہوں نے مجھے بلیک میل کر رکھا ہے۔"

وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ذیشان کی جیب میں چھوٹا سا جدید ترین ریکارڈ موجود ہے جو ان کی گفتگو ریکارڈ کر رہا ہے اس جدید ترین ریکارڈ کی یہ خاصیت تھی کہ یہ آواز پر خود بخود متحرک ہو کر ریکارڈنگ شروع کر دیتا تھا۔ اس میں چوبیس گھنٹے تک ریکارڈنگ کی سہولت تھی یہ ریکارڈ لائٹر کی شکل میں تھا بوقت ضرورت اس سے وڈیو بھی بنائی جا سکتی تھی، وہ بولتا جا رہا تھا اور ریکارڈنگ ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے بتایا "بیڈ نمبر 7 کے مریض امجد کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا تھا۔ ہاں اس کے دل، گردے، جگر اور آنکھیں نکال کر محفوظ کر لئے جاتے اور بعد ازاں انہیں بھاری قیمت پر فروخت کر دیا جاتا غریب اور لاوارث لوگوں کے اندرونی اعضا نکالنے کے بعد ان کے کٹے پھٹے جسم کو تہہ خانے میں واقع تیزاب کے کنویں میں ڈال دیا جاتا ہے وہ بھی خادر کے انجام سے بے خبر تھا۔ ذیشان نے اس سے تہہ خانے سمیت اسپتال کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں اور اس کی کنپٹی پر گھونسہ مار کر اسے بے ہوش کر کے اس کا لباس اور ڈاکٹروں والا گاؤن خود پہنا اپنا لباس نکال کر محفوظ کرنے کے بعد اس ڈاکٹر کو کمرے میں ایک کونے میں ڈالا اور کمرے کی لائٹ آف کر کے باہر نکل گیا۔

وہ مختلف راہداریوں سے ہوتا ہوا لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور تک جا پہنچا۔ راستے میں اسے چند اسپتال کے عملے کے افراد بھی دکھائی دیے مگر وہ سر جھکائے چلتا رہا۔ انہوں نے بھی توجہ نہ دی رہے بھی اکثر لوگ نائٹ ڈیوٹی میں سست ہو جاتے ہیں وہ ڈاکٹر فیصل کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہوا اسٹور روم میں داخل ہوا یہاں مختلف ادویات کے کارٹن موجود تھے اس نے دیوار کے ایک کونے میں رکھا کارٹن اٹھایا۔ یہاں فرش کا ہم رنگ لکڑی کا ایک تختہ نصب تھا۔ اس نے تختہ ہٹایا یہ چارپائی جتنا خلا تھا نیچے سیڑھیاں جا رہی تھیں وہ بلا خوف و خطر اندر داخل ہو گیا۔

پندرہ بیس سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ ہال نما کمرے میں موجود تھا۔ یہاں اس قدر ٹھنڈک تھی کہ اسے سردی لگنے لگی ہال میں انرجی سیور روشن تھے۔ انرجی سیوروں کی روشنی میں اس نے جو منظر دیکھا اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہال کی چھت پر لگے کنڈوں سے ہکوں کے ذریعے پولی تھین کی بڑی بڑی تھیلیوں میں کٹے پھٹے انسانی جسم موجود تھے اس کا جی متلانے لگا۔

کچھ دیر پہلے وہ ایک جیتے جاگتے شخص کو آپریشن تھیٹر لے جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا وہ تصور میں اس کے دل گردے آنکھیں جگر نکلتے دیکھ رہا تھا۔

ہال کی دیواروں کے ساتھ درجنوں انسانی ڈھانچے ایستادہ تھے ہال کے آخری کنویں میں تیزاب کا کنواں تھا یہ وہی کنواں تھا جس میں بدقسمت انسانوں کے کٹے پھٹے جسم ڈال کر ان کا نام و نشان مٹایا جاتا تھا۔

اس نے جیب سے لائٹر نما ڈیجیٹل کیمرہ نکالا ہال کی فلم بنانے کے بعد لائٹر دوبارہ جیب میں رکھ دیا۔

اچانک ایک کھٹکا ہوا اور ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو تم یہاں تک آ ہی گئے اس نے آواز کی سمت دیکھا اور دل دھک سے رہ گیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر طالش اور ایک خوف ناک شکل کا دیوہیکل شخص موجود تھا جس کے سر کے لمبے لمبے بالوں نے اس کے چہرے کا نصف حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ چہرے پر ان گنت زخموں کے نشان بازوؤں کے ابھرے ہوئے مسلز اور ابھرا ہوا چھاتی سینہ وہ ڈبلیو ڈبلیو ای کے کسی پہلوان سے مشابہہ تھا ان کے دائیں طرف دو افراد عجیب

ساخت کی گنیں لیے کھڑے تھے۔

"تم کیا سمجھتے ہو یہاں آنے کے بعد باآسانی چلے جاسکو گے اسی جگہ ہم تمہارے بھائی ڈاکٹر خاور کو بھی لائے تھے اس نے ہماری بات نہ مانی اور سرکشی دکھائی انجام آخرکار یہ ہوا کہ آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر خاور کے دل گردے، آنکھیں، جگر نکال کر محفوظ کرنے کے بعد اس کے جسم کے کٹے پھٹے بچ جانے والے اعضا تیزاب کے کنویں میں ڈال دیے گئے۔ یہاں ہال میں صرف ڈاکٹر خاور کا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ جو درجنوں ڈھانچے تم ہال میں دیکھ رہے ہو یہ ایسے ہی بدنصیبوں کے ہیں۔" ڈاکٹر طالش خباثت سے ہنسا اور ذیشان کا خون کھول اٹھا۔

وہ انجام سے بے پرواہ ہوکر طالش کی طرف بڑھا۔ راول اس کے سامنے آیا اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکیلا۔

ذیشان پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور دوبارہ آگے بڑھ کر راول کے چہرے پر ایک پنچ رسید کی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا ذیشان دو تین گھونسے اس کے چہرے پر رسید کر چکا تھا۔

راول کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اس جگہ اس سے الجھنے کی حماقت کرے گا اس لیے اپنا دفاع نہیں کر سکا۔ گھونسے لگنے سے راول کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا۔ رائفل برداروں نے آگے بڑھنا چاہا مگر راول نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

"بہت خوب تم ہاتھ پیر چلانا جانتے ہو۔ اگر تم راول کو ہرا دو تو میرا وعدہ ہے میں تمہیں صحیح سلامت یہاں سے جانے دوں گا۔" ڈاکٹر طالش نے کہا۔

اگلے چند منٹ انتہائی تہلکہ خیز ثابت ہوئے ذیشان کو راول سے لڑتے ہوئے دانتوں تلے پسینے آگیا لیکن راول بھی اسے زیر نہیں کر سکا اس سے پہلے کہ لڑائی کسی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوتی ڈاکٹر طالش نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ "بس ابھی اتنا ہی کافی ہے یہ لڑکا بھی واقعی ماہر فائٹر ہے، سنو ذیشان تمہارے بچ نکلنے کا ایک چانس نکل آیا ہے۔"

پانچ چیزیں

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "پانچ چیزیں پانچ چیزوں کے بدلے میں" صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانچ چیزیں پانچ چیزوں کے بدلے میں کا کیا مطلب؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

1۔ جب بھی کسی قوم نے کیا ہوا وعدہ توڑا اللہ تعالیٰ نے ان پر دشمن کو مسلط کر دیا۔

2۔ جب کسی قوم نے اللہ کے بھیجے ہوئے فیصلہ کے علاوہ فیصلہ کیا تو ان میں محتاجی (غربت) عام ہوگئی۔

3۔ جب بھی کسی قوم میں برائیاں (زنا) عام ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر طاعون مسلط کر دیتے ہیں۔

4۔ جب بھی کسی قوم نے ناپ تول میں کمی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی خوشحالی ختم کر دی اور قحط سالی میں مبتلا کر دیا۔

5۔ جب بھی کسی قوم نے زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوتاہی کی اللہ تعالیٰ نے بارش روک دی۔

(حافظ علی۔ شاہ پور چاکر)

"کیا مطلب؟" ذیشان چونکا۔

"مطلب بھی سمجھا دوں گا۔" ڈاکٹر طالش کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"تمہیں حیرت تو ہوگی حلیہ بدل لینے کے باوجود ہم نے تمہیں کیسے پہچان لیا۔" ڈاکٹر طالش ہنسا اور گن مینوں کو آنکھ سے مخصوص اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک نے عجیب ساخت کی گن سے فائر کیا گولی سینے پر لگتے ہی ذیشان کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ ہوش و حواس سے عاری ہوگیا۔

☆......☆......☆

اور جب ذیشان کو ہوش آیا تو وہ ایک کمرے میں بیڈ پر پڑا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کمرے میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہ تھی اور کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے

جسم پر کسی قسم کا کوئی زخم نہ تھا حالانکہ ہال میں ایک گن بردار نے اس عجیب ساخت کی گن سے فائر کیا تھا اور گولی ذیشان کے سینے پر لگی تھی۔

اچانک دروازہ کھلا اور ڈاکٹر طالش ایک رائفل بردار کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ "کیسے ہو ینگ مین۔" ڈاکٹر طالش نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میں کہاں ہوں اور تمہارے کارندے نے تو مجھے گولی ماری تھی پھر میرے جسم پر زخم کا کوئی نشان کیوں نہیں؟"

ڈاکٹر طالش ہنسا اور بولا۔ "وہ ڈارٹ گن تھی ڈارٹ گن کی گولی ربڑ کی ہوتی ہے جو انسان کو ہلاک یا زخمی نہیں کرتی صرف بے ہوش کرتی ہے اور رہا یہ سوال کہ اس وقت تم کہاں ہو تو غور سے سنو! تم میرے ایک دوسرے ٹھکانے پر موجود ہو میں نے کہا تھا ناں کہ تمہارے بچ نکلنے کا چانس نکل آیا ہے۔

تو غور سے سنو! میرے ڈیڈی سیٹھ راور سنسنی خیز کھیلوں کے رسیا ہیں یہاں باقاعدہ ایک اکھاڑہ سا بنا ہوا ہے یہاں دو فائٹرز کے درمیان فائٹ ہوتی ہے جو کسی ایک کی موت تک جاری رہتی ہے اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے بڑے بڑے لوگ آتے ہیں اور کروڑوں اربوں کی شرطیں لگتی ہیں تمہیں اس مقابلے میں حصہ لینا ہوگا جیت کی صورت میں تمہیں آزاد کردیا جائے گا۔

"اگر میں انکار کردوں تو۔۔؟" ذیشان نے پوچھا۔

"تو پھر تمہیں بغیر کسی چانس کے مرنا ہے۔ جبکہ یہاں جیت کی صورت میں تمہارے بچنے کا چانس ہے۔" ڈاکٹر طالش نے کہا تو کچھ دیر سوچ وبچار کے بعد ذیشان نے حامی بھرلی۔ اور ڈاکٹر طالش اپنے کارندے سمیت کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ دوبارہ باہر سے مقفل کردیا گیا۔

ذیشان دو روز اسی کمرے میں قید رہا تیسرے روز رات کے وقت دو رائفل بردار اسے رائفلوں کی زد پر فارم ہاؤس کے احاطے میں لے گئے۔ رات کے وقت احاطے میں چاروں طرف سرچ لائٹس روشن تھیں، احاطے میں درجنوں کی تعداد میں افراد جو کہ کھڑے تھے ایک بڑے سائبان کے نیچے شاندار کرسیاں رکھی تھیں اگلی صف میں ڈاکٹر طالش ڈاکٹر سہیل اور سیٹھ راور بیٹھے تھے ڈاکٹر راور کے ساتھ ہی سونیا بھی موجود تھی جو ذیشان کو دیکھ کر چونک پڑی تھی گویا وہ اس کی یہاں موجودگی سے لاعلم تھی پچھلی نشستوں پر پچاس سے زائد افراد بیٹھے تھے ان میں سے بہت سے غیر ملکی بھی تھے۔ احاطے کے عین وسط میں لکڑی کے سائبان کے نیچے اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ جو چاروں طرف سے آہنی سلاخوں سے گھرا ہوا تھا گویا یہ ایک بہت بڑا پنجرہ تھا جس میں چھ ضرب تین کا آہنی دروازہ تھا۔

اکھاڑے میں ایک شخص مائیک لئے کھڑا تھا وہ مائیک میں بول رہا تھا۔ "جینٹلمین جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں سیٹھ راور ہر سال یہ سنسنی خیز خونی مقابلہ منعقد کرواتے ہیں۔ اس مقابلے میں مختلف جگہوں سے منتخب فائٹر حصہ لیتے ہیں جیتنے والے فائٹر کو ایک کروڑ روپے انعام دیا جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد ایک طرف سے راول نمودار ہوا۔ اس کے اکھاڑے میں داخل ہوتے ہی ایک کسرتی بدن کا ایک شخص آیا۔ مائیک والے نے اکھاڑے کے عین وسط میں دو خنجر گاڑ دیئے اور باہر نکل کر اس پنجرے نما اکھاڑے کو تالا لگا دیا۔ یہ مقابلہ مختصر ثابت ہوا۔ گھنٹی بجتے ہی راول نے مخالف کو اٹھایا اور دھاڑتے ہوئے اسے زمین میں گاڑ دیا۔ اس کے بعد ایک سیاہ فام راول کے مقابلے پر آیا۔ اسے بھی سنسنی خیز مقابلے کے بعد زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔

راول کی مسلسل جیت سے راول پر سرمایہ دار بڑی بڑی شرطیں لگا رہے تھے۔ پانچویں مقابلے کی فتح کے بعد ایک گھنٹے کا بریک دیا گیا۔ گھنٹے بعد راول تازہ دم ہوکر دوبارہ اکھاڑے میں داخل ہوا اور پھر ذیشان کا نام پکارا گیا۔

ذیشان دھڑکتے دل سے اکھاڑے میں داخل ہوا مائیک والے شخص نے چند کاغذات ذیشان کی طرف بڑھائے اور اس پر دستخط کرنے کو کہا۔

"یہ کیا ہے۔؟" ذیشان نے حیرت سے پوچھا۔

"اس معاہدے کی رو سے بعد از موت آپ اپنے جسم کو اسپتال کو عطیہ کردیں گے" مائیک والے نے کہا اور ذیشان نے خاموشی سے معاہدے پر دستخط کیے۔ مائیک والا رنگ سے باہر نکل گیا۔ اور آہنی دروازے کو باہر سے تالا لگادیا گیا۔

گھنٹی بجتے ہی دونوں فائٹر ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ راول کی آنکھیں ذیشان کو دیکھتے ہی چمکنے لگیں۔ دونوں نے میدان میں گڑے خنجروں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اسٹانس بنا کر کھڑے ہوگئے۔ راول کی مسلسل جیت کی وجہ سے اس پر کروڑوں کی شرط لگ چکی تھی۔ ذیشان نے پہل کی اور دہاڑتے ہوئے راول کے چہرے پر گھونسہ رسید کیا۔ راول نے بلاک کرتے ہوئے اس کی کلائی پکڑلی ذیشان نے دیکھا راول کا بایاں ہاتھ کلہاڑی کی طرح اکڑ گیا اور پھر یہ کلہاڑی برق رفتاری سے اس کی گردن کی طرف آئی تو ذیشان نے جھکائی دی لیکن نو کا ظالم وار اس کے کندھے کے نیچے مضبوط عضلات سے ٹکرایا۔ درد کی شدت نے ذیشان کے اعصاب کو لرزا دیا۔

راول کا ہاتھ دوبارہ فضا میں بلند ہوا ذیشان سمجھ چکا تھا کہ اگر یہ مہلک ضرب دوبارہ اس کی گردن پر پڑا تو اس کی گردن کسی خشک ٹہنی کی طرح ٹوٹ جائے گی پھر راول کا کلہاڑی نما ہاتھ نیچے آیا ذیشان نے دوسرے ہاتھ سے بلاک کیا اور اس کی ٹانگوں کے بیچ اسٹریٹ کک رسید کی۔

راول کے چہرے پر تکلیف کے شدید ترین آثار نمودار ہوئے اور وہ کراہتے ہوئے رکوع کے بل جھکا۔ یہ داؤ مارشل آرٹ کے مقابلوں میں فاؤل سمجھا جاتا ہے مگر اس غیر قانونی فائٹ میں سب جائز تھا ذیشان نے اچھل کر کہنی کا بھرپور وار کیا۔ راول منہ کے بل گرا۔

احاطے میں سکوت چھا گیا۔ راول کی جیت پر جن لوگوں نے کروڑوں کی شرط لگائی تھی وہ خاموش ہوگئے جبکہ ذیشان کی جیت پر رقم لگانے والے پرجوش ہوگئے۔

ذیشان اچھلا اور کہنی کے بل راول پر گرنے لگا وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی راول مچھلی کی طرح تڑپ کر وہاں سے ہٹ چکا تھا۔ ذیشان اپنے ہی زور پر نیچے گرا اور اس کے بدن میں درد کی کسیلی لہر دوڑ گئی، راول قلابازی کھا کر کھڑا ہو چکا تھا اس نے اٹھتے ہوئے ذیشان کے جسم پر لات رسید کی وہ دوبارہ گر گیا۔ پھر وہ نیچے پڑے ذیشان پر ٹھوکریں برسانے لگا ایک موقع پر ذیشان نے راول کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی اور اس کے گرتے ہی اس کے سینے پر سوار ہوکر اس کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کردی۔

راول کا چہرہ خون آلود ہو چکا تھا راول نے دونوں ٹانگیں فضا میں لہرائیں اور ذیشان کے گلے میں قینچی ڈال کر زوردار جھٹکا دیا وہ راول کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک طرف جا گرا جبکہ راول اٹھ کر اکھاڑے کے عین وسط میں پہنچا اور وہاں گڑے خنجروں میں سے ایک خنجر اٹھالیا۔ اس کے خنجر پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے خنجر زنی میں مہارت حاصل ہے پھر اس نے دھاڑتے ہوئے ذیشان پر حملہ کیا۔

پیچھے ہٹنے کے باوجود ذیشان کا شانہ زخمی ہوگیا پھر وہ بڑھ چڑھ کر ذیشان پر حملے کرنے لگا۔ ذیشان اپنے آپ کو بمشکل ان مہلک ضرب حملوں سے بچا رہا تھا ایک موقع پر راول نے فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور ذیشان کے سینے پر خنجر کا بھرپور وار کیا تو ذیشان تڑپ کر بجلی کی سی مستعدی سے پیچھے ہٹا اس کے باوجود بھی خنجر کے اچٹتے ہوئے وار نے اس کا سینہ زخمی کردیا۔

راول کے حامی ایک بار پھر پرجوش ہوگئے۔ ڈاکٹر طاش اور سیٹھ والد تو باقاعدہ تالیاں بجا رہے تھے۔

ادھر راول ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہو چکا تھا ذیشان نے ایک طرف ہوکر خود کو بچایا اور ایک پاؤں کی ایڑی پر گھومتے ہوئے اس کے خنجر والے ہاتھ پر ٹھوکر رسید کی خنجر اڑتا ہوا سا اکھاڑے پر بنے لکڑی کے سائبان میں پیوست ہوگیا۔ یہ سائبان تقریباً گیارہ بارہ فٹ اونچا تھا ذیشان نے چھلانگ لگائی اور اس جگہ گرا جہاں دوسرا خنجر گڑا ہوا تھا اس نے خنجر اٹھایا اور راول پر حملہ کیا راول نے با آسانی ایک طرف ہوکر اس کا وار خطا کیا اور اس کے خنجر والے ہاتھ پر کک رسید کی خنجر اڑتا ہوا سا

اکھاڑے سے باہر جا گرا۔

اب وہ دونوں نہتے ہوچکے تھے ایک خنجر اکھاڑے سے باہر اور دوسرا سائبان کی چھت میں گڑا ہوا تھا۔

دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر حملے کررہے تھے اور زخمی ہونے کے باوجود بے جگری سے لڑ رہے تھے ایک موقع پر ذیشان نے راول کے چہرے پر گھونسہ مارنا چاہا تو راول نے اس کی کلائی پکڑلی ذیشان نے اس کے سینے پر ٹکر ماری۔یہی اس کی غلطی تھی راول کا بازو کسی سانپ کی طرح اس کی گردن سے لپٹ گیا اور اس نے لاک لگادیا اب ذیشان بالکل بے بس ہوچکا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ اگر گردن چھڑانے کی کوشش کی تو گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔

سیٹھ داور اور اس کے بیٹے ذیشان پر ہوٹنگ کررہے تھے۔اس کے بے بس ہوتے ہی راول کا سینہ فخر سے مزید چوڑا ہوگیا۔اس نے دوسرا ہاتھ ذیشان کی جانگھ میں ڈالا اور کسی ریسلر کی طرح کھڑے ہوکر اسے فضا میں بلند کردیا۔

ذیشان کی زندگی خطرے میں تھی اگر راول اسے پٹخ دیتا تو اس کی ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی کہ راول با آسانی اس کا خاتمہ کردیتا۔

اچانک اس کی نظر سائبان پر جم گئی خنجر سائبان کی چھت میں پیوست تھا۔ساڑھے چھ فٹ لمبے راول کے بازوؤں پر بلند ہونے ہی فاصلہ محض دو فٹ رہ گیا تھا یہ لمحوں کا کھیل تھا اسے جو کچھ کرنا تھا۔فوراً ہی کرنا تھا ذیشان نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور خنجر کے دستے پر گرفت مضبوط کرکے اسے سائبان کی چھت سے نکال دیا اسی لمحے راول دھاڑا۔اس سے پہلے کہ وہ ذیشان کو زمین پر پٹختا ذیشان کا خنجر والا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور خنجر راول کی دائیں آنکھ میں جا گھسا۔

راول کی دلدوز چیخ بلند ہوئی اور بازوؤں کی گرفت کمزور ہوگئی ذیشان نیچے کودگیا اور تڑپتے چیختے راول کے دل میں خنجر اتار دیا۔

راول کی موت کے ساتھ خاموشی چھا گئی تھی راول اور داور کے بیٹوں کے چہروں پر غصہ اور اعتراف شکست صاف دکھائی دے رہا تھا جبکہ سونیا خوش نظر آرہی تھی لیکن ڈاکٹر طالش اینڈ پارٹی پھر بھی نقصان میں نہیں رہی تھی۔اس مقابلے میں ہونے والے جوئے کے کھیل سے کروڑوں روپے ان کے پاس آچکے تھے لیکن وہ اپنے ایک طاقتور ساتھی سے محروم ہوچکے تھے۔

ذیشان سوچ رہا تھا کہ کہیں انتقاماً اسے قتل نہ کردیا جائے مگر اس کے خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ڈاکٹر طالش کے اشارے پر دو اسلحہ بردار اکھاڑے میں داخل ہوئے اور اسے اس کمرے میں پہنچادیا گیا جہاں وہ دو روز سے قید تھا کچھ دیر بعد ایک دوسرا اسلحہ بردار اندر داخل ہوا۔اس کے پیچھے ایک شخص نے ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں کھانا تھا اس کے سامنے کھانا رکھ کر وہ کمرے سے نکل گیا انتہائی بے رحم اور سفاک لوگوں سے اس کا پالا پڑا تھا۔ذیشان کے زخموں کی اب تک مرہم پٹی نہ کی گئی تھی۔وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی لڑائی کے دوران اسے کوئی جان لیوا زخم نہیں آیا تھا۔رات آدھی سے زائد گزر چکی تھی۔ٹرے میں روٹی اور قورمہ تھا۔

اس نے پہلا ہی نوالہ توڑا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور سونیا اندر داخل ہوئی۔"کھانا مت کھانا۔" ذیشان کا ہاتھ رک گیا۔

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ کھانے میں بے ہوشی کی دوا شامل ہے۔تم کیا سمجھتے ہو تمہیں وعدے کے مطابق چھوڑ دیا جائے گا۔اسپیشل تمہیں کسی بھی وقت اسپتال منتقل کردیا جائے گا۔جہاں تمہارے اندرونی اعضاء نکال کر محفوظ کرلئے جائیں گے۔میری بات غور سے سنو ابھی کچھ دیر بعد سجاد نامی ایک شخص آئے گا تم اس کے ساتھ نکل جانا وہ تمہیں یہاں سے دور کسی محفوظ مقام پر لے جائے گا۔"

"تم یہ سب کیوں کررہی ہو؟ حالانکہ میں نے تمہاری قید سے فرار ہوتے وقت تمہارے محافظوں کا بھی خاتمہ کرڈالا تھا۔" ذیشان نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

اس واقعہ کے بارے میں میں نے ڈیڈی اور بھائیوں کو بھی نہیں بتایا تمہارے وہاں سے جانے کے بعد تمہاری باتیں میری سمجھ میں آگئیں کہ واقعی کوئی کسی کو زبردستی نہیں حاصل کرسکتا۔ زور زبردستی سے جسمانی قرب تو حاصل ہوجاتا ہے لیکن اس طرح محبوب کا دل نہیں جیتا جاسکتا۔ ذیشان تم چاہے مجھے پیار کرو یا نہ کرو مگر میں تمہیں چاہتی رہوں گی بلکہ مرنے کے بعد بھی میری روح تمہارے لئے تڑپتی رہے گی۔ سونیا نے کہا اور مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ذیشان اس کی نظریں چرانے کے باوجود اس کی نم آنکھیں دیکھ چکا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد ایک پستہ قامت گٹھے ہوئے جسم کا مالک اندر داخل ہوا۔ اس کے شانے پر آٹومیٹک رائفل موجود تھی۔ اس نے ذیشان کو کمرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور اسے لئے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں ایک طرف بڑی سی الماری موجود تھی سجاد نے الماری کا ایک پٹ کھولا اور ایک دراز میں ہاتھ ڈال کر کوئی بٹن دبا دیا۔ الماری ایک طرف سرک گئی سامنے خلا نظر آرہا تھا یہ کوئی سرنگ تھی۔

"یہ خفیہ سرنگ اس عمارت سے باہر جارہی ہے۔" سجاد نے سرگوشی کی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سرنگ میں اتر گیا کچھ دیر بعد وہ اس عمارت کے عقبی حصے میں موجود تھے کچھ دیر چلنے کے بعد ایک جیپ دکھائی دی دونوں جیپ میں سوار ہوگئے سجاد نے رائفل شانے سے اتار کر قدموں میں رکھ دی سجاد نے گاڑی شہری حدود کا آغاز ہوتے ہی روک دی اور بولا۔ "سر اب آپ آزاد ہیں جہاں چاہے جاسکتے ہیں مجھے فوراً واپس پہنچنا ہوگا۔ ورنہ آپ کے غائب ہونے کا الزام مجھ پر آجائے گا۔"

ذیشان نے اس کا شکریہ ادا کرکے جیپ سے اتر گیا وہ کافی دیر تک سڑک کے کنارے لفٹ کے انتظار میں کھڑا رہا مگر کسی نے گاڑی نہیں روکی۔ رات کا آخری پہر تھا۔ کسی مسافر بس یا ٹیکسی رکشہ کے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا ایک طرف سے ایک پیجارو کو آتا دیکھ کر اس نے رکنے کا اشارہ کیا اور سڑک پر قدم بڑھادیئے گاڑی کی ہیڈ لائٹس سیدھی اس کے چہرے پر پڑرہی تھیں پیجارو اس سے کچھ فاصلے پر رکی ذیشان آگے بڑھا اور ڈرائیور سے بولا۔ "مجھے گولڈن ٹاؤن جانا ہے پلیز! آپ لوگ مجھے راستے میں کہیں اتار دیجئے گا۔"

"ارے بھئو کاکا باروں سے لفٹ نہیں مانگتے یہ تیری ہی گڈی ہے۔" پنجابی لب و لہجہ میں ایک مانوس سی آواز پچھلی نشست سے سنائی دی اس نے آواز کی سمت دیکھا اور ششدر رہ گیا وہ طاہر تھا۔ جس کی کنپٹی کے بال اب سفید ہوچکے تھے وہی طاہر جو اسے جرائم کی راہ پر لایا تھا۔ "تت تم۔" ذیشان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں میں۔" وہ مسکرایا۔ ذیشان اس کے برابر بیٹھ گیا اور پیجارو چل پڑی۔

"او کاکا تم پر پہلی نظر پڑتے ہی مجھے بھی جھٹکا لگا تھا۔ اس روز مجھے ہوش آیا تو میں لاک اپ میں قید تھا جہاں پولیس نے بتایا کہ تم پولیس مقابلے میں مارے گئے ہو پھر میں کورٹ میں پیشی کے دوران اپنے ساتھیوں کی مدد سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا اور دوبارہ اپنے گروہ کو فعال کرلیا۔"

ذیشان نے بھی اپنی آپ بیتی سنا ڈالی، باتوں ہی باتوں میں کافی وقت گزر گیا۔ اب مجھے راستے میں اتار دو، امی جان پریشان ہوں گی۔"

"ذیشان جو حالات تم نے بتائے ہیں ان حالات میں تمہارا گھر جانا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے، بہتر یہی ہے کہ میرے ساتھ چلو۔" طاہر اس کے شانے پر اپنا بازو رکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں جرائم سے توبہ کرچکا ہوں۔" ذیشان پریشان ہوگیا۔

"تو میں کب کہہ رہا ہوں تم جرائم کی راہ اختیار کرو لیکن اس قسم کے لوگوں سے ٹکرانا تمہارے بس کی بات نہیں۔

"میرے ساتھ میرے ٹھکانے پر چلو چند دن رہنے کے بعد حالات معمول پر آتے ہی لوٹ

جاتا۔" طاہر نے کہا گاڑی ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے رکی ڈرائیور کے ہارن بجانے پر دروازہ کھلا اور گاڑی اندر داخل ہوگئی یہ طاہر کا ٹھکانہ تھا جہاں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہتا تھا۔

زیشان چند دن وہاں روپوش رہا پھر جانے کی خواہش ظاہر کی طاہر بولا "زیشان جب بھی تمہیں میری ضرورت پڑے یہاں چلے آنا۔"

زیشان نے لائٹر جیب سے نکالا اور اسے طاہر کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ میری امانت اپنے پاس محفوظ رکھو۔ یہ جدید قسم کا ویڈیو ہے اس میں ڈاکٹر طالش کے خلاف ثبوت ہیں میں ایک دو دن میں آکر تم سے یہ لائٹر لے جاؤں گا۔"

طاہر نے اس کے منع کرنے کے باوجود بیس ہزار کی خطیر رقم اس کی جیب میں ڈالی، اس کے ساتھی زیشان کو شہر تک چھوڑ کر واپس لوٹ گئے۔

وہ گھر پہنچا تو دروازے پر لگا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا وہ پریشان ہوکر سوچنے لگا کہ عابدہ کہاں گئی۔ وہاں سے شگفتہ کے اپارٹمنٹ پہنچا وہاں بھی تالا لگا ہوا تھا وہ حیران و پریشانی میں روڈ پر آیا، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شگفتہ اور اس کے گھر پر تالا کیوں لگا ہے۔

ابھی وہ ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک رکشہ اس کے قریب رکا رکشہ میں شگفتہ کو دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے اشارے پر رکشہ میں بیٹھ گیا۔ "تم کہاں غائب تھی، امی جان کہاں ہیں؟" زیشان نے پوچھا اور شگفتہ نے اسے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا شاید وہ رکشہ ڈرائیور کی وجہ سے محتاط تھی رکشہ ایک متوسط علاقے میں رکا۔

شگفتہ نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ عابدہ نے کھولا ماں کو دیکھ کر زیشان نے اطمینان کا سانس لیا۔ تین سالہ رخسار بھی گھر پر ہی تھی۔ جونہی سب ہی لگ رہی تھی زیشان کے استفسار پر شگفتہ نے بتایا کہ اس کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر طالش کے کارندے زیشان کے گھر پر حملہ آور ہوگئے تھے۔ پڑوسیوں کی بروقت مداخلت سے عابدہ کی جان بچ گئی اور وہ اکثر طالش جان بچا تھا کر شگفتہ زیشان کا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ بمشکل جان بچا کر وہاں سے بھاگی اور اس علاقے میں کرائے کا مکان لے کر عابدہ کو بھی یہاں لے آئی۔ شگفتہ کی بیٹی اس سے کافی گھل مل چکی تھی۔ اس کی معصوم باتیں اور شرارتیں زیشان کو محظوظ کررہی تھیں۔

دوسرے روز وہ شگفتہ کے ساتھ سودا سلف لینے گھر سے نکلا وہ مارکیٹ سے سودا سلف لے کر باہر نکلے اور فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ اسی وقت مخالف سمت سے ایک کرولا آئی۔ اتفاقاً زیشان کی نظر کرولا کی طرف اٹھ گئی کار کی پچھلی کھڑکی سے اس نے رائفل کی ایک نال نکلی دیکھی اور ساتھ چلتی ہوئی شگفتہ کو بانہوں میں دبوچ کر ایک طرف لڑھک گیا۔

اچانک سڑک گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی افراتفری پھیل گئی تھی۔ لوگ جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے ادھر شگفتہ زیشان کی بانہوں میں سمٹی پڑی تھی۔ ان پر فائرنگ کرنے والی کار وجا چکی تھی جو اس ٹھکانے آتے ہی وہ شگفتہ سے الگ ہوا اور شرمسار ہوکر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

شگفتہ بھی اٹھ چکی تھی۔ "آئی ایم سوری۔" وہ شرمندگی سے بولا اسی لمحے پولیس موبائل کے ہوٹر کی آواز سنائی دی وہ شگفتہ کا ہاتھ تھام کر وہاں سے دور جانے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کے وہاں پہنچتے ہی وہ کسی نئی مصیبت میں گرفتار ہوجائیں گے وہ گرتے پڑتے گھر پہنچ گئے شام کے وقت جب کہ عابدہ اپنے کمرے میں آرام کررہی تھی وہ شگفتہ کے کمرے میں گیا۔

شگفتہ ہم کب تک اسی طرح چھپتے رہیں گے میں کچھ دنوں کے لئے یہاں سے جا رہا ہوں تم امی جان کا اور اپنا خیال رکھنا۔

"پر تم کہاں جاؤ گے۔؟" شگفتہ پریشان ہوگئی۔

"تم گھبراؤ مت میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔" وہ اسے کچھ بتائے بغیر گھر سے باہر نکلا۔ اب اس کا رخ طاہر کے ٹھکانے کی طرف تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اور جانوروں کو مارنے کے لئے بعض اوقات

خود بھی جانور بنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر طاش پر جتنا خالی ہاتھ قابو پانا ناممکن تھا اس کے لئے اسلحہ اور وسائل کی ضرورت تھی جو اسے طاہر مہیا کرسکتا تھا۔

☆......☆......☆

شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع وہ بلڈنگ تھی۔ اسی بلڈنگ کے ایک اپارٹمنٹ میں ڈاکٹر سہیل صوفے پر بیٹھا شراب نوشی میں مشغول تھا اس کی گود میں ایک نیم عریاں لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ شراب کے گھونٹ بھرتا ہوا لڑکی کے جسمانی نشیب و فراز پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ سلونی نامی وہ لڑکی ایکسٹرا گرل تھی جو فلموں میں چھوٹے موٹے کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے کمرشل میں بھی ماڈلنگ کرتی تھی۔ وہ ڈاکٹر سہیل کی داشتہ تھی یہ اپارٹمنٹ بھی ڈاکٹر سہیل نے اسے لے کر دیا تھا وہ ہفتہ میں ایک بار عیاشی کی غرض سے یہاں ضرور آتا تھا۔ سلونی کے آتشیں جسم کی حرارت سے ڈاکٹر سہیل کے جذبات مشتعل ہوچکے تھے اس سے پہلے کہ وہ جذبات کے سمندر میں غوطے لگاتا دروازے پر دستک ہوئی نشاط انگیز لمحات میں مداخلت ہوتے ہی ڈاکٹر سہیل کا موڈ آف ہوگیا۔ "دیکھو کون باسٹرڈ ہے۔؟" وہ ناگوار لہجے میں بولا اس کی آنکھیں نشے سے سرخ ہورہی تھیں۔

"کون۔!" سلونی نے دروازے کے قریب پہنچ کر پوچھا وہ اس حالت میں نہیں تھی کہ کسی کے سامنے آتی۔

"میڈم ہمیں کمپلین ملی ہے کہ اس اپارٹمنٹ سے گیس لیک ہورہی ہے۔" باہر سے مودبانہ لہجے میں کہا گیا۔

"ہم نے اس قسم کی کوئی کمپلین نہیں کی۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔

"تو پھر پلیز! آپ اس کاغذ پر سائن کردیں تاکہ ہم انتظامیہ کو مطمئن کرسکیں۔" باہر سے کہا گیا۔

"سلونی نے ہلکا سا دروازہ کھول کر کاغذ لینے کے لئے ہاتھ نکالا ہی تھا کہ دروازے کو باہر سے دھکیلا گیا اور تین افراد ہاتھوں میں پسٹل لئے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی سلونی نے چیخنا چاہا ایک نوجوان نے اسے دبوچ کر منہ پر ہاتھ رکھ دیا اسے ایک ناگوار بو کا احساس ہوا اور وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ وہ نوجوان ذیشان تھا ان میں سے دوسرا طاہر اور تیسرا اس کا ساتھی قاسم تھا۔ ذیشان نے نیم عریاں سلونی کو ایک طرف ڈال دیا۔

"کون ہے ڈارلنگ۔؟" بیڈروم سے ڈاکٹر سہیل کی نشے سے لڑکھڑاتی آواز سنائی دی۔

اور وہ تینوں دندناتے ہوئے بیڈروم میں جا پہنچے۔ تین مسلح افراد کو دیکھ کر اس کا چہرہ خوف سے زرد ہوگیا وہ ذیشان کو پہچان چکا تھا۔ "خبردار ہلنے جلنے کی کوشش مت کرنا۔" ذیشان سرد لہجے میں بولا اسے بھی کلوروفام سے بے ہوش کردیا گیا طاہر نے ایک بڑا پلاسٹک کا بیگ کھولا اور ڈاکٹر سہیل کو بیگ میں ڈال کر زپ بند کی اور وہ تینوں اس بیگ سمیت اپارٹمنٹ سے باہر نکل گئے۔

☆......☆......☆

ذیشان ٹیلی فون بوتھ میں موجود داور سیٹھ کا نمبر ڈائل کررہا تھا۔ "ہیلو داور اسپیکنگ۔" کال ریسیو ہوتے ہی سیٹھ داور کی آواز ابھری۔

"میں ذیشان بول رہا ہوں تمہارا بیٹا ڈاکٹر سہیل میرے قبضے میں ہے۔ اس کی زندگی چاہتے ہو تو تم اور ڈاکٹر طاش خود کو پولیس کے حوالے کرکے اپنے جرائم کا اعتراف کرلو۔"

"ذیشان تمہارا دماغ تو درست ہے۔ میں تم سمیت تمہارے پورے خاندان کو اڑا دوں گا۔ دوسری طرف سے سیٹھ داور نے غصے سے کہا۔

"سیٹھ فی الحال تو اپنے بیٹے کی خیر مناؤ اگر اس کی زندگی چاہتے ہو تو جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ سہیل تمہارے قبضے میں ہے۔" سیٹھ داور نے کہا۔

"تم سلونی کے اپارٹمنٹ سے پتہ کرسکتے ہو۔ جہاں سے ہم نے ڈاکٹر سہیل کو ڈریج کیا تھا۔ اور اگر چاہو تو کچھ دیر بعد ڈاکٹر سہیل سے تمہاری بات بھی کرواسکتا ہوں ذیشان بولا۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر داور نے پوچھا۔
اچھا تو تم کیا چاہتے ہو۔؟"
"ابھی تمہیں بتایا تو تھا تم خود کو اور ڈاکٹر سہیل کو قانون کے حوالے کردو، ہاں تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟
زیشان نے کہا وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ زیشان کی کال رسیو ہوتے ہی سیٹھ داور نے اپنے ایک کارندے کو اس کا نمبر ٹریس کرنے کا اشارہ کردیا تھا۔
آج کل کے جدید دور میں یہ کوئی مشکل کام نہیں اتفاقاً وہ جس فون بوتھ سے کال کررہا تھا وہ سیٹھ داور کی رہائش گاہ کے نزدیک ہی تھا۔ فوراً ہی زیشان کو گھیر لیا گیا۔" ٹھیک ہے میں تیار ہوں اب سے کچھ دیر بعد میں طالش سمیت خود کو پولیس کے حوالے کردوں گا۔" سیٹھ داور بولا اور رابطہ منقطع کردیا۔
زیشان جیسے ہی باہر نکلا تین افراد نے اسے گھیر لیا ان کے ہاتھوں میں پسٹل موجود تھے اسے گن پوائنٹ پر سیٹھ داور کی کمین گاہ پہنچادیا گیا اسے ایک ایسے کمرے میں لے جایا گیا جہاں کسی قسم کا کوئی ساز وسامان نہیں تھا۔ دیواروں سے ایذا رسانی کے آلات لٹک رہے تھے اور فرش میں ایک لوہے کی کرسی رکھی تھی۔ جس کے پائے فرش میں فکس تھے۔ اسے کمرے کے عین وسط میں کھڑا کردیا گیا۔ دو افراد وہیں پسٹل تھامے کھڑے رہے جب کہ تیسرا کمرے سے باہر نکل گیا۔
کچھ دیر بعد سیٹھ داور کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی زبردست گھونسہ زیشان کے چہرے پر مارا اس کا نچلا ہونٹ دانتوں کے درمیان آکر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا اس کا دوسرا گھونسہ زیشان کی ناک پر پڑا کچھ دیر تک لاتیں گھونسے برسانے کے بعد وہ ہانپتا ہوا پیچھے ہٹا۔" بتا سہیل کو تم نے کہاں قید کررکھا ہے۔؟"
زیشان کے انکار پر وہ بپھر گیا اب اس کے ساتھ ایک دوسرا بھی اس پر گھونسے برسانے لگا۔ پھر اسے الٹا لٹکا کر اس پر ہنٹر برسائے گئے زیشان چیختا چلاتا رہا اور مار کھاتا رہا مگر پھر بھی وہ ڈاکٹر سہیل کا پتہ بتانے سے انکاری تھا۔
کچھ دیر بعد اسے کمرے میں موجود کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھ مضبوطی سے باندھ دیئے گئے اور اس کے سر پر نوک دار شکنجہ رکھ کر شکنجے میں جکڑ دیا گیا اور شکنجے کو تنگ کیا جانے لگا۔ زیشان چیخنے چلانے لگا اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس شکنجے سے اس کی کھوپڑی چٹخ جائے گی۔" بب.....بس.....کرو.....میں بتاتا ہوں کہ ڈاکٹر سہیل.....کہاں قید ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا اور اس کا سر شکنجے سے آزاد کرنے کے بعد اسے گھسیٹ کر کرسی سے اتار دیا گیا۔ البتہ اس کے ہاتھ بدستور آگے سے رسی سے بندھے ہوئے تھے۔
"ڈاکٹر سہیل کو میں نے شہر سے دور ایک سنسان مقام پر قید کررکھا ہے۔" زیشان نے جواب دیا۔
ہم تمہیں ساتھ لے جائیں گے اور یاد رکھو یہ جھوٹ ہوا تو تمہیں وہیں گولی مار کر پھینک دوں گا۔" سیٹھ داور نے کہا۔
زیشان کو ایک گاڑی میں دھکیل دیا گیا۔ اس کے ایک طرف سیٹھ داور دوسری طرف ایک رائفل بردار بیٹھا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر بھی ایک مسلح شخص موجود تھا۔ ان کے پیچھے بھی چار افراد ایک گاڑی میں آرہے تھے۔ گاڑی زیشان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتی ہوئی مضافاتی علاقے میں داخل ہوچکی تھی۔" سیٹھ صاحب اگر آپ طالش صاحب کو بھی خبر کردیتے تو بہتر تھا۔" ایک رائفل بردار بولا۔
" میں ایسے چھوٹے کاموں کے لئے طالش کو زحمت نہیں دیتا۔ اس چوہے کے لئے تو میں خود ہی کافی ہوں۔" سیٹھ داور نے کہا۔
گاڑی شہر سے کافی دور ایک ویرانے میں آچکی تھی یہ میدانی علاقہ تھا جہاں چند بڑے بڑے مٹی کے ٹیلے بھی تھے۔ زیشان کے کہنے پر گاڑیاں وہاں رک دی گئیں یہاں ایک طرف ایک مہران کار پہلے ہی سے موجود تھی جس کی فرنٹ سیٹ پر ڈاکٹر سہیل اس مضبوطی سے بندھا ہوا تھا کہ اس کے لئے ہلنا جلنا بھی ناممکن تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا رکھ کر ٹیپ لپیٹ دیا گیا تھا۔ سیٹھ

داور بیٹے کو کچھ چکا تھا ہیں ایسے بتا رہے بچا کار کی کیا اس نے بتایا کہ اسپتال میں کس جگہ غیر قانونی

میں موجود چاروں افراد ڈاکٹر سنبل کو آزاد کروانے مہران کار کی طرف لپکے وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ذیشان اپنے ہاتھوں کی رسی کھول چکا تھا۔

ذیشان نے غیر محسوس انداز میں اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریموٹ نکال کر اس کا رخ مہران کی طرف کر دیا اور سرخ رنگ کا ایک بٹن دبا دیا سیٹھ داور کے چاروں کارندے مہران کار کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ایک سماعت شکن دھماکہ ہوا اور ڈاکٹر سنبل سمیت مہران کار کے پرخچے اڑ گئے سیٹھ داور کے چاروں کارندے کار کے قریب ہونے کی وجہ سے دھماکے کی زد میں آچکے تھے۔ چاروں طرف گرد و غبار کا بادل چھا چکا تھا۔ گاڑی اور لاشوں کے ٹکڑے دھماکے کی شاک ریو سے چاروں طرف بکھر گئے تھے اس سے پہلے کہ سیٹھ داور اور اس کے بچانے والے کارندے سنبھلتے مختلف ٹیلوں کی آڑ سے طاہر اور اس کے پانچ رائفل بردار ساتھی نمودار ہوئے اور سیٹھ داور کے دونوں کارندوں کو گولی مار دی اور سیٹھ داور کو گھیرے میں لے لیا گیا۔

"ہاں تو داور سیٹھ تم اپنے آپ کو بہت شاطر سمجھتے ہو، میں نے جان بوجھ کر تمہاری رہائش گاہ کے قریب ٹیلی فون بوتھ سے فون کیا اور باتوں کو طول دیتا رہا تاکہ تم مجھے ٹریس کر سکو۔ اور پھر تمہارا دانشور سمجھا تاکہ تم میری چال کو نہ سمجھ سکو اس طرح تم میرے گھیرے میں آگئے۔ لیکن افسوس تم نے اپنی طاقت کے زعم میں طالش کو باخبر کیا وہ بچ گیا تم اور تمہارا بیٹا انسانیت کے دشمن ہو نہ جانے کتنے بے گناہوں کو ڈاکٹر کے مقدس پیشے کی آڑ میں اس طرح مار کر ان بے چاروں کی لاشیں بھی کسی کو نہ ملیں ٹھیک اسی طرح تمہاری آنکھوں کے سامنے میں نے تمہارے بیٹے کے جسم کو سینکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اب تمہارے بعد طالش کی باری ہے تم دونوں اب بھی بچ سکتے ہو طالش کو بلاؤ اور تم دونوں خود کو پولیس کے حوالے کر کے اعتراف جرم کر لو۔"

ذیشان کے حکم پر سیٹھ داور کا اعتراف ریکارڈ

اسلحہ چھپایا گیا ہے اور اسپتال کی آڑ میں ہونے والے گھناؤنے کاروبار کے بارے میں تفصیل سے بتایا داور کے قتل کا ماجرا بھی بیان کیا اور جان کے خوف سے بولتا جا رہا تھا پھر اس نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے اپنی جیب سے موبائل فون نکالا اور ڈاکٹر طالش کا نمبر ڈائل کر کے موبائل فون ذیشان کو دے دیا۔

"ڈاکٹر طالش تمہارا باپ میرے قبضے میں ہے اس کی جان بچانا چاہتے ہو تو خود کو قانون کے حوالے کر کے اعتراف جرم کر لو ورنہ ڈاکٹر سنبل کے ساتھ ساتھ باپ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔" کال ریسیو ہوتے ہی ذیشان بولنا شروع ہو گیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔؟" ڈاکٹر طالش چلایا۔

"شاید تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے لو اپنے باپ سے بات کرو۔" ذیشان نے موبائل فون سیٹھ داور کے سامنے کیا۔

"طالش اس کمینے نے سنبل کو میری نظروں کے سامنے مار ڈالا ہے اور اب میری زندگی خطرے میں ہے۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔

اور ذیشان نے اس سے موبائل فون لے لیا۔ "اب تمہارا کیا خیال ہے؟" ذیشان نے پوچھا۔

"مجھے سوچنے کے لئے چند گھنٹوں کی مہلت چاہئے۔" طالش نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں تین گھنٹے بعد کال کروں گا لیکن کسی قسم کی چالاکی مت کرنا ورنہ باپ سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔" ذیشان نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ سیٹھ داور کو لے کر طاہر کے ٹھکانے پر پہنچ گئے اور مقررہ وقت پر ذیشان نے ایک نئے نمبر سے ڈاکٹر طالش کو فون کیا۔ "ہاں تو ڈاکٹر طالش تم نے کیا سوچا خود کو قانون کے حوالے کر رہے ہو یا نہیں؟"

"مسٹر ذیشان تم ابھی میرے سامنے انڈے سے نکلے ہوئے بچے ہو۔ تمہاری ماں اور معشوقہ شگفتہ میرے قبضے میں ہے اگر ان کی سلامتی چاہتے ہو تو میرے والد

کو چھوڑ دو۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ زیشان کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”اچھا تو لو ماں سے بات کرادو۔“ ڈاکٹر طالش بولا اور پھر عابدہ کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”زیشان بیٹا انہوں نے اور پھر شاید اس سے موبائل چھین لیا گیا تھا۔“

”ہاں تو زیشان کیا خیال ہے؟“ ڈاکٹر طالش بولا۔

”ٹھیک ہے تم امی جان اور شگفتہ کو لے کر رات نو بجے بند مراد پر آجاؤ۔“ زیشان نے ایک مضافاتی علاقے کا ایڈریس بتاتے ہوئے کہا۔

زیشان طاہر اور اس کے پانچ ساتھیوں سمیت وقت سے پہلے بند مراد پہنچ گیا یہ سنسان پسماندہ علاقہ تھا کچی سڑک کے اطراف کھجور اور ناریل کے درختوں کی بہتات تھی اور جگہ جگہ بکثرت جھاڑیاں موجود تھیں رات کے اس پہر کچی سڑک ویران تھی گویا یہ جرائم پیشہ افراد کے لئے آئیڈیل جگہ تھی۔

ساڑھے آٹھ بجے طاہر اور اس کے پانچوں ساتھی مختلف جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ میں مورچہ زن ہوگئے۔ جبکہ زیشان سنجھ داور کو لے کر گاڑی کے قریب کھڑا ہوگیا۔ نو بجے دو جیپیں۔ اس سے کچھ فاصلے پر رکیں۔ اور ڈاکٹر طالش سمیت چھ ساتھ مسلح افراد گاڑی سے نیچے اترے شگفتہ اور عابدہ کو گاڑی سے اتار لیا گیا ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر ٹیپ لپیٹ دیا گیا تھا ادھر زیشان سنجھ داور کو گن پوائنٹ پر لئے کھڑا تھا۔

”ڈاکٹر طالش ادھر سے میں سنجھ داور کو بھیجتا ہوں اور ادھر سے تم میری ماں اور شگفتہ کو بھیج دو۔ لیکن یاد رکھنا کوئی دھوکہ مت کرنا تم چاروں طرف سے میرے ساتھیوں کے نشانے پر ہو۔“ زیشان نے چلا کر کہا۔

ڈاکٹر طالش کے کارندے بھی گاڑیوں کی آڑ میں پوزیشن لے چکے تھے پھر ادھر سے زیشان نے سنجھ داور کو رخصت کیا دوسری طرف سے ڈاکٹر طالش نے شگفتہ اور عابدہ کو چھوڑ دیا دونوں فریق چلتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے گزرے۔

ڈاکٹر طالش اور زیشان دونوں ایک دوسرے سے محتاط تھے اور محاذ آرائی سے گریز کررہے تھے دونوں ہی جانتے تھے کہ اس جگہ پر محاذ آرائی کا مقصد دونوں فریقین کو جانی نقصان پہنچ سکتا ہے سنجھ داور شگفتہ اور عابدہ سے پہلے ڈاکٹر طالش کے قریب پہنچا۔ اور وہ گاڑیوں میں بیٹھ کر بند مراد سے روانہ ہوگئے۔

ادھر زیشان نے عابدہ اور شگفتہ کے ہاتھ کھولے اور ان کے منہ سے ٹیپ ہٹا کر منہ سے کپڑے نکالے تو شگفتہ روتی ہوئی زیشان سے لپٹ گئی۔ عابدہ کی کیفیت بھی شگفتہ سے مختلف نہ تھی وہ بھی رو رہی تھی زیشان کے ذہن میں ان گنت اندیشے سر ابھارنے لگے اس نے شگفتہ کی پشت سہلاتے ہوئے خود سے الگ کیا۔ رخسار اب تک اس کے قبضے میں ہے۔ شگفتہ نے روتے ہوئے بتایا تو زیشان کا دل دھک سے رہ گیا۔ ڈاکٹر طالش واقعی بہت شاطر نکلا تھا اس نے شگفتہ رخسار اور عابدہ کو ایک ساتھ ہی اغوا کیا تھا۔ اب ان دونوں کو رہا کر کے رخسار کو اپنے قبضے میں رکھا تھا گویا زیشان کی کمزوری رخسار کی صورت میں طالش کے پاس تھی۔

”ان شیطانوں نے تمہیں کہاں قید رکھا تھا؟“ زیشان نے پوچھا۔

”شہر سے دور ایک ویران علاقے میں ہم قید تھیں۔“ شگفتہ نے روتے ہوئے کہا اور اس عمارت کا محل وقوع بتایا جہاں وہ قید رہ چکے تھے۔

”زیادہ ممکن ہو سکتا ہے رخسار اب تک اسی عمارت میں قید ہو۔ اب وقت آگیا ہے کہ ڈاکٹر طالش کے خلاف کوئی فیصلہ کن کارروائی کی جائے۔ یہاں سے ہم ساتھ نکلیں گے۔ میں طاہر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ اس عمارت میں رخسار کو بچانے کے لئے کارروائی کرتا ہوں۔ تم ماں جی کو لے کر ڈی ایس پی دانش سے ملو وہ ایماندار اور فرض شناس پولیس آفیسر ہیں۔ انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دینا۔ ثبوت کے طور پر یہ لاکٹر ڈی ایس پی

روشن کر دے جو یہاں پر نصب ہے جبکہ ساتھ جدید ترین ویڈیو کیمرہ ویڈیو ریکارڈنگ بھی کرتا ہے۔" اس نے شگفتہ کو اسے آپریٹ کرنے کا طریقہ سمجھایا۔

بندمراد سے نکل کر وہ بابا موزی سڑک پر پہنچے شگفتہ اور عابدہ دوسری گاڑی میں ڈی ایس پی دانش سے ملنے پولیس اسٹیشن روانہ ہو گئیں جبکہ وہ رات کے گیارہ بجے اس وسیع و عریض عمارت کے سامنے پہنچے وہ عقبی سمت سے احاطے کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے یہ کافی بڑی سنگل اسٹوری کی آر سی سی چھت والی عمارت تھی۔ دو ہاتھوں میں رائفلیں تھامے چوکنے انداز میں کوریڈور میں داخل ہوئے راہداریوں میں مختلف مقامات پر انرجی سیور روشن تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس عمارت میں اب تک انہیں کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا تھا۔

"یہ کیا......" ڈاکٹر طاہر اور اس کے کارندے اپنا یہ ٹھکانہ چھوڑ کر جا چکے ہیں طاہر اور ذیشان کے ذہن میں بیک وقت یہ سوال ابھرا۔ عمارت کے تقریباً تمام کمرے خالی تھے انہوں نے کچن کی تلاشی بھی لی وہاں بھی کچھ نہیں تھا البتہ LPG ایل پی جی کے دو سلنڈر رکھے تھے غالباً اس دور دراز کے علاقے میں سوئی گیس کی سہولت نہیں تھی اس لئے ایل پی جی کے سلنڈر استعمال کئے جا رہے تھے۔

وہ مایوس ہو کر دوبارہ کوریڈور میں پہنچے اور عمارت کے داخلی دروازے کی طرف بڑھے اچانک ڈاکٹر طالش کی آواز ابھری "ویلکم Well Come مسٹر ذیشان" انہوں نے ادھر ادھر دیکھا یہ بلند آواز عمارت میں نصب کسی اسپیکر سے ابھر رہی تھی۔ "یہ جال میں نے تمہیں پھنسانے کے لئے بچھایا تھا۔ جیسے ہی تم نے مجھے بتایا کہ ڈیڈی تمہارے قبضے میں ہیں میرے کارندے میرے حکم پر تمہاری ماں شگفتہ اور رخسانہ کو اغوا کر کے اس عمارت میں لے آئے ہیں جان بوجھ کر شگفتہ اور تمہاری ماں کو اس عمارت سے ایسے راستوں سے لے گیا کہ وہ با آسانی یہاں کا راستہ ذہن نشین کر سکیں ان دونوں کے یہاں سے جاتے ہی رخسانہ کو میں نے اسپتال میں منتقل کروا دیا۔ اب وہ میرے اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں موجود ہے جہاں اس کا دل آپ نکالیں اور گردے نکال کر محفوظ کر لئے جائیں گے اور تم کسی چوہے کی طرح اس چوہے دان میں پھنس چکے ہو اس عمارت میں تم لوگوں کے علاوہ کوئی اور نہیں اور یہ عمارت چاروں طرف سے میرے کارندوں کے گھیرے میں ہے اب اسی عمارت میں تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی قبر بنے گی۔"

ذیشان سناٹے میں آ گیا گویا رخسانہ کی زندگی خطرے میں تھی اور ذیشان اور طاہر اور اس کے پانچوں ساتھی اس عمارت میں محصور ہو چکے تھے ڈاکٹر طالش واقعی شیطانی دماغ کا مالک تھا بڑی چالاکی سے انہیں ٹریپ کر چکا تھا ذیشان اور اس کے ساتھی تعداد میں بھی کم تھے اور ان کا ایمونیشن بھی محدود تھا۔

اچانک احاطے کے مین گیٹ سے ان پر گولیاں برسنے لگیں۔ انہوں نے نیچے ہو کر بمشکل اپنی جانیں بچائیں ان پر فائرنگ جدید ترین آٹو میٹک رائفلوں سے کی جا رہی تھی گولیاں زوں زوں کر کے ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں وہ لیٹے لیٹے پیچھے سرکنے لگے کوریڈور میں موجود تمام انرجی سیور ذیشان اور طاہر نے سرگوشی کی اور انہوں نے فائر کر کے کوریڈور کے تمام انرجی سیور توڑ دیئے اب کوریڈور تاریک ہو چکا تھا وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہوئے فائرنگ رینج سے نکل آئے۔

"ہم میں سے کوئی بھی فالتو گولی نہیں چلائے گا کیوں کہ ہمارے پاس ایمونیشن محدود ہے۔" ذیشان بولا تو طاہر اور اس کے ساتھیوں نے اثبات میں سر ہلا دیئے وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک دوسری راہداری میں جا پہنچے یہاں گرل نما دروازہ تھا۔ جسے لاک کر کے ان کا ایک ساتھی وہیں مورچہ زن ہو گیا جبکہ دوسرے پیچھے ہٹ گئے ان پر مسلسل فائرنگ جاری تھی پھر انہوں نے محسوس کیا دشمن کوریڈور میں داخل ہو چکا ہے۔ فائرنگ سے دروازے کا لاک ٹوٹتے ہی وہاں مورچہ زن طاہر کے ساتھی نے برسٹ مارا دروازے کے سامنے ڈاکٹر طالش کے تین کارندے جہنم رسید ہو گئے جوابی فائرنگ سے طاہر کے ایک ساتھی کا جسم بھی گولیوں سے چھلنی ہو گیا یہ راہداری دائیں

سمت مزدوری بھی ذیشان یا طاہر اور اس کے ساتھی ابن ہوو
بڑے دو چند ذن ہوگئے ان کے مخالف گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ہر طرف گولیوں کے خول بکھرے پڑے تھے اور بارود کی ناگوار بو پھیل چکی تھی۔

اچانک ایک سماعت شکن دھماکہ ہوا انہوں نے بروقت چھلانگیں لگا کر خود کو بچایا۔ یہ وہی بم تھا جو سامنے سے پھینکا گیا تھا گرد و غبار کا بادل چھٹتے ہی ذیشان کے اشارے پر طاہر اور اس کے ساتھیوں نے فائر کر کے دشمن کی پیش قدمی روک دی۔ ''اس سے پہلے کہ یہ دوسرا ہینڈ بم پھینک کر ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچائے ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا تم لوگ فائر کر کے انہیں الجھائے رکھو میں آتا ہوں۔'' ذیشان نے کہا اور مڑ کر گلی کی طرف بھاگا۔

''وہ جب واپس لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں پانچ پانچ کلو کے دو ایل پی جی کے سلنڈر تھے۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' طاہر نے سامنے گولی چلاتے ہوئے پوچھا۔

''وہی بم کا جواب دے رہا ہوں۔'' ذیشان ہنسا طاہر نے محسوس کیا کہ اس کی ہنسی میں دیوانگی تھی۔ جنون تھا اس نے ایک سلنڈر کا وال کھولا اور طاہر کے منع کرنے کے باوجود پوری قوت سے سامنے اچھال دیا۔ اور ساتھ ہی سامنے بے دردی سے کئی فائر کئے گولی سلنڈر میں لگتے ہی سماعت شکن دھماکہ ہوا اور راہداری لرز اٹھی ایسا لگ رہا تھا کہ زلزلہ آ گیا ہو۔ ذیشان اور اس کے ساتھی بھی راہداری میں گر پڑے تھے اور راہداری ڈاکٹر طالش کے کارندوں کی لرزہ خیز چیخوں سے گونج اٹھی اس دھماکے میں طالش کے چار ساتھی کام آ گئے ابھی پہلے دھماکے کی بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ذیشان نے دوسرا سلنڈر بھی طالش کے کارندوں پر پھینک کر سلنڈر پر گولی چلا دی اس بار دھماکہ پہلے سے بھی زیادہ شدید تھا اس دھماکے میں بھی طالش کے دو ساتھی مزید کام آ گئے اور راہداری میں جہاں جہاں سلنڈر پھٹے تھے فرش میں گہرے گڑھے پڑ چکے تھے دیواریں کریک ہو چکی تھیں اس جگہ کی چھت کریک ہو گئی تھی۔

اب ذیشان اور اس کے ساتھی بچتے بچتے ایک دوسری راہداری میں داخل ہو چکے تھے دشمن کی طرف سے فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ پھر اچانک ایک سماعت شکن دھماکہ ہوا انہوں نے چھلانگ لگا کر خود کو بچایا پھر بھی ان کا ایک ساتھی دھماکے کی زد میں آ گیا۔ کسی نے اس راہداری کی چھت پر دستی بم پھینکا تھا اب وہاں شگاف نمودار ہو چکا تھا۔

پھر اس شگاف میں سے کوئی کودا طاہر نے اس کے قدم زمین پر لگنے سے پہلے گولی چلا دی اور وہ چیختا ہوا کوڑے دان میں آ گرا۔ اچانک ایک دوسری جگہ سے کسی نے دستی بم مار کر چھت میں شگاف ڈال دیا۔ گویا ڈاکٹر طالش کے کچھ کارندے چھت پر موجود تھے اس بار بھی انہوں نے چھلانگ لگا کر بمشکل خود کو بچایا تھا پھر اچانک سامنے سے بھی ان پر فائرنگ شروع ہو گئی اس اچانک فائرنگ سے ذیشان کو اپنے ایک مزید ساتھی سے محروم ہونا پڑا۔

''ذیشان اس عمارت سے ہمارا بچ نکلنا ناممکن ہے۔'' طاہر سامنے سے ہونے والی فائرنگ کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

ذیشان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اس کی نظریں کچھ فاصلے پر موجود چھت کے شگاف پر جمی ہوئی تھیں وہاں کسی کا سایہ نظر آتے ہی وہ چوکنا ہو گیا۔ پھر اس خلا میں سے کسی نے دستی بم پھینکا اور ذیشان نے دستی بم کی طرف چھلانگ لگا دی۔

یہ منظر دیکھتے ہی طاہر اور اس کے بچ جانے والے ساتھیوں کی سانسیں گویا رک گئیں ذیشان کی موت یقینی تھی پھر ان کی آنکھوں نے ناقابل یقین منظر دیکھا ایسے مناظر صرف ایکشن فلموں میں ہی متوقع ہوتے ہیں۔

ذیشان نے فضا میں ہی گولیوں کی بوچھاڑ میں اس دستی بم کو کیچ کیا اور زمین پر پاؤں لگنے سے پہلے سامنے اچھال دیا ایک سماعت شکن دھماکہ ہوا اور وہاں موجود طالش کے تینوں ساتھیوں کے پرخچے اڑ گئے۔ ذیشان واقعی لکی ثابت ہوا تھا اسے ذرا برابر بھی گزند نہ پہنچی تھی۔ وہ اپنی جگہ واپس لوٹ آیا تھا اور اب راہداری میں خاموشی چھا چکی تھی ڈاکٹر طالش کے کارندوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔'' یہ کہا

حماقت تھی۔" طاہر اس پر گرم ہو گیا۔

"دراصل جب پہلی بار دستی بم پھینکا گیا تھا تو میں نے نوٹ کیا تھا کہ یہ پھٹتے ہوئے کچھ وقت لیتا ہے اس لئے میں نے یہ رسک لیا ویسے بھی جب مرنا ہی ہے تو ایک جگہ بیٹھ کر موت کا انتظار کرنے کے بجائے لڑ کر مرنا بہتر ہے۔" زیشان نے جواب دیا۔

"اور اگر سامنے سے ہونے والی فائرنگ سے کوئی گولی تمہیں لگ جاتی تو؟" طاہر نے پوچھا۔

"نہیں لگی ناں یوں سمجھو کہ میری قسمت تھی جس نے مجھے بچایا۔"

اسی وقت اوپر شگاف میں سے کسی نے سر نکال کر جھانکا۔ اور زیشان نے فائر کیا اس کی لاش خلا سے نیچے آ گری۔

"طاہر ادھر شگاف کے نیچے چلو۔" زیشان بولا۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ تمہارے خطرناک ارادوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔" طاہر بولا اور زیشان اس کا ہاتھ تھام کر شگاف کے نیچے آ گیا اور اسے بیٹھنے کا کہہ کر اس کے کندھے پر کھڑا ہو گیا اب اٹھو زیشان نے کہا اور طاہر اٹھا۔ اچانک سامنے سے ایک رائفل بردار نمودار ہوا اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا طاہر کا ساتھی جو قریب ہی کھڑا تھا اس نے ٹریگر دبا دیا اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔

زیشان شگاف کے نیچے طاہر کے کندھے پر کھڑا تھا اس کے ہاتھوں میں فائرنگ پوزیشن میں گن موجود تھی۔ چھت کا فاصلہ محض تین فٹ رہ گیا تھا۔ پھر وہ اس طرح اچھلا جیسے اس کے پاؤں تلے اسپرنگ لگے ہوں وہ شگاف سے ہوتا ہوا چھت پر جا پہنچا۔ اس کے دونوں پاؤں شگاف کے کناروں پر جم چکے تھے منڈیر پر موجود دونوں رائفل بردار اچانک سامنے دیکھ کر بوکھلا گئے۔

اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتے زیشان نے برسٹ مارا، دونوں کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔

زیشان نے پہلے طاہر کو اوپر کھینچا اب نیچے طاہر کا ایک ہی ساتھی زندہ بچا تھا اس سے پہلے کہ وہ اسے اوپر کھینچتے نیچے دائیں طرف سے کسی نے گولی چلا دی وہ بے قدموں چھت کی منڈیر پر پہنچے احاطے میں ایک رائفل بردار موجود تھا ان کی فائرنگ سے وہ بھی جہنم رسید ہو گیا۔

وہ دونوں پائپ کے ذریعے چھت سے اتر کر احاطے میں پہنچ گئے اب فائرنگ کی آوازیں رک چکی تھیں تو گویا مخالف گروپ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اچانک ایک طرف سے گولی چلی اور طاہر کی پیشانی میں پیوست ہو گئی تو وہ بنا آواز نکالے نیچے گر پڑا۔

یہ ڈاکٹر طالش تھا جو اچانک ہی نجانے کہاں سے نمودار ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود گن کا رخ زیشان کی طرف تھا زیشان نے فائر کرنا چاہا مگر ٹرچ کی مخصوص آواز ابھری گویا اس کی رائفل خالی ہو چکی تھی اس نے رائفل ایک طرف پھینک دی۔

"زیشان تمہارے سب ساتھی اوپر تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے، بلکہ اب تک تمہیں سالار خسار بھی اوپر پہنچ چکی ہوگی اب تم بھی جاؤ۔ گڈ بائے۔" اس نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا اس کی مہیب گن کا رخ زیشان کی طرف تھا اور پھر فضا گولی کی آواز اور انسانی چیخوں سے گونج اٹھی۔

☆......☆......☆

شگفتہ اور عابدہ ڈی ایس پی دانش کے سامنے بیٹھی تھیں وہ اسے تمام صورتحال سے آگاہ کر چکی تھیں ڈی ایس پی دانش ریکارڈ کی ہوئی ویڈیو دیکھ چکا تھا اور ریکارڈنگ بھی سن چکا تھا۔ اس ریکارڈنگ میں سیٹھ داور کا اعتراف اور ڈاکٹر طالش کی وہ گفتگو بھی شامل تھی۔ جو اس کی بے خبری میں ریکارڈ کی گئی تھی اس گفتگو میں وہ بتا رہا تھا کہ کیسے اس نے ڈاکٹر خاور کا قتل کیا اور اس کے اسپتال میں کس طرح انسانوں کے جسمانی اعضاء نکال کر منہ مانگے داموں فروخت کیے جاتے ہیں اور اس وطلے چلے ڈاکٹر کا بیان بھی تھا جس کے گلے پر زیشان نے خنجر رکھ کر سب کچھ اگلوا لیا تھا۔

ڈی آئی جی سے اجازت لے کر ڈی ایس پی دانش نے فوری طور پر اسپتال کو گھیرے میں لے لیا۔ پولیس کے چھاپے سے بھگدڑ مچ گئی

ڈاکٹر طالش کے کارندوں نے مزاحمت کی کوشش کی کوئی بھگوڑ رہا تھا
پولیس کی بھاری نفری کے آگے ان کی ایک نہ چلی بجھ مارے گئے کچھ گرفتار ہو گئے۔

رخسار کو آپریشن تھیٹر سے بحفاظت نکال دیا گیا ڈاکٹر ثنا فضائی اس کے آپریشن کی تیاری کر چکے تھے مگر پولیس کے بروقت پہنچنے سے اس کی جان بچ گئی تہہ خانے سے اجڑی ہوئی لاشیں انسانی ڈھانچے تیزاب کا کنواں اور سیٹھ داور کا کروڑوں کا ناجائز مہلک ترین اسلحہ برآمد کر لیا گیا ڈاکٹر طالش کے کارندوں اور ساتھی ڈاکٹروں کے بیانات اور اغوا شدہ بچی کی بازیابی اور ریکارڈنگ کی موجودگی یہ تمام ثبوت ان شیطانوں کے تابوت میں کیل ٹھونک چکے تھے۔ اسپتال کو سیل کر دیا گیا اور ڈاکٹر طالش کے بچ جانے والے کارندوں اور ساتھی ڈاکٹروں کو گرفتار کرنے کے بعد سیٹھ داور کی رہائش گاہ پر چھاپہ مار کر سیٹھ داور کو بھی گرفتار کر لیا گیا پھر پولیس کی بھاری نفری وہاں جا پہنچی جہاں ذیشان وغیرہ محصور تھے یہ وہی وقت تھا جب ڈاکٹر طالش ذیشان پر رائفل تانے کھڑا تھا۔

ڈی ایس پی دانش سمیت کئی پولیس اہلکار احاطے کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے اس سے پہلے کہ پولیس کارروائی کرتی ڈاکٹر طالش ٹریگر دبا چکا تھا۔

ادھر ایک طرف سے ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور ذیشان سے لپٹ گئی، گولی اس کے جسم میں لگی اور وہ دلدوز انداز میں چیخی۔

پولیس اہلکاروں نے ڈاکٹر طالش کو للکارتے ہوئے فائر کیا، درجنوں گولیاں شیطان ڈاکٹر کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ گر کر ساکت ہو گیا۔

"سونیا یہ تم نے کیا کیا۔" ذیشان اسے اپنی آغوش میں لے کر بیٹھ گیا۔

"تت...... تم نے ہی تو...... کہا تھا ناں کہ پاگلپنے کا نام...... محبت نہیں...... تمہاری...... نہیں ہو سکتی تو...... تمہارے...... لئے...... جان تو دے سکتی ہوں۔"

وہ اکھڑے اکھڑے سانسوں میں بولی۔ گولی اس کے دل سے ذرا نیچے لگی تھی اور خون تیزی سے بہتا ہوا ذیشان

"بار...... کم از کم...... مرنے سے پہلے...... آخری بار...... تو پیار کر لو۔" وہ اٹکتے ہوئے...... پھر قدرے توقف سے بولی۔

"کم آن کس می۔" تو ذیشان نے اس کے لب چوم لئے، لب ذیشان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو سونیا کا چہرہ بھگو رہے تھے، سونیا کی آنکھوں کے گوشوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

ڈی ایس پی دانش سمیت ساکت کھڑے پولیس اہلکار بھی اس جذباتی منظر سے متاثر ہو رہے تھے۔

"سونیا تم نے کہا تھا ناں کہ ایک بار تم ضرور کہو گے "Love You" تو سنو، آج سب کے سامنے میں تم سے اقرار کرتا ہوں۔ "آئی لو یو سونیا، آئی لو یو!" ذیشان نے سچے دل سے کہا اور سونیا کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

سونیا جس ایک لفظ کو سننے کے لئے بے قرار تھی وہ لفظ سننے کو ملا بھی تو اس وقت جب اس کا آخری وقت تھا۔

ذیشان سونیا کے بے جان جسم سے لپٹا رو رہا تھا۔

سیٹھ داور کو عدالت نے عمر قید بامشقت کی سزا سنائی دی تھی۔ ذیشان نے جمیل کے قتل کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔

ذیشان اور شگفتہ کی شادی ہو گئی۔ شگفتہ کی زندگی کی خوشیاں لوٹ آئی تھیں، رخسار کو باپ کا پیار دوبارہ مل چکا تھا۔ شگفتہ سونیا کی قربانی اور عشق سے واقف ہے دونوں میاں بیوی ہر ہفتے سونیا کی لحد پر جاتے ہیں اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر کے لوٹ آتے ہیں۔

سونیا کی روح بھی ہر ہفتہ باقاعدہ ذیشان کے پاس اس وقت آتی ہے جب ذیشان اپنے کمرے میں اکیلا ہوتا ہے، وہ یک ٹک ذیشان کو دیکھتی ہے، پھر مسکراتے ہوئے غائب ہو جاتی ہے اور ذیشان بھی سونیا کی روح کو یک ٹک دیکھ کر ایک لمبا سانس کھینچتا ہے اور سونیا کی روح کے غائب ہوتے ہی اپنی آنکھیں موند لیتا ہے۔